کالی دُنیا
سراج انور
کھلونا بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

کالی دنیا

ایک ناول

سراج انور

کھلونا بُک ڈپو

آصف علی روڈ نئی دہلی

اس ناول کے تمام کردار، مقامات، واقعات اور ادارے فرضی ہیں اور ان کا کسی شخص، جگہ، واقعی یا ادارے سے مطابقت قطعی اتّفاقیہ ہے۔

انٹرنیٹ ایڈیشن

۲۰۲۵

میں۔۔۔ فیروز آپ سب سے مخاطب ہوں!۔۔۔۔ آپ میں سے بہت سے بھائی بہن، ہو سکتا ہے کہ مُجھے نہ جانتے ہوں۔ ان کے لئے میں اپنا مختصر سا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ اس بات کو کافی سال گزر چکے ہیں۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ میں ایک نو عمر لڑکا تھا۔ اپنی اس عمر میں میں نے ایک بہت لمبا اور کٹھن بحری سفر کیا تھا۔ اس سفر میں میرے ساتھ امریکہ سے آئے ہوئے مسٹر جان، افریقہ کے مسٹر جیک، مصر کے عبدل اور ہندوستان کا ایک کبڑا جادُوگر چیتن تھا۔ آج کل کی طرح میں ایک بہت بڑی جہازی کمپنی کا مالک نہ تھا، بلکہ ایک معمولی سا لڑکا تھا جسے مسٹر جان نے ہمدردی کے طور پر اپنے ساتھ اس خطرناک سفر میں لے جانا ضروری سمجھا تھا۔

میں نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، کن یقین نہ آنے والے واقعات سے دوچار ہوا اور مُجھ پر کیا بیتا ئیں پڑیں۔ اس کی کہانی بہت لمبی ہے، اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ میں نے اپنے اس خوفناک سفر کی کہانی ایک کتاب کی صورت میں لکھ دی تھی جس کا نام "خوف ناک جزیرہ" تھا اور جو مُجھے یقین ہے کہ آپ میں سے بہت سوں نے پڑھی ہوگی۔ اپنی یہ حیرت انگیز داستان میں نے اس وقت لکھی تھی جب کہ میں ہر مُصیبت اور ہر امتحان سے گزر چکا تھا۔ میرے سب دُشمن ختم ہو گئے تھے اور میں بڑے امن و سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

مگر اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اب میں نے اپنا یہ قلم پھر کیوں اٹھایا ہے! جن خوف ناک واقعات سے مُجھے دوچار ہونا تھا ہو چکا۔ جو کُچھ مُجھے ملنا تھا وہ خُدا نے مُجھے عطا کر دیا۔۔۔ پھر آخر وہ کون سی بات ہے جس سے متاثر ہو کر مُجھے پھر سے ایک دوسری داستان لکھنے کی ضرورت پیش آ گئی؟

اس کے جواب میں میں عرض کروں گا کہ خُدا نے ہر شخص کی قسمت ایک سی نہیں بنائی اور نہ ہی کسی انسان کو اس نے ایسا بنایا ہے کہ زندگی بھر وہ چین کا سانس لیتا رہے۔ زندگی میں جب تک ہلچل نہ ہو، تکلیفیں نہ ہوں مُصیبتیں نہ آئیں، اسے ہم زندگی کیسے کہہ سکتے ہیں! آج آدمی ہنس رہا ہے مگر کسے معلوم کہ کل وہ روئے گا! ہم اپنے مستقبل کے بارے میں کُچھ نہیں جان سکتے۔ آج اگر ہم خوش ہیں تو کل کے بارے میں ہمیں یہ یقین نہیں کہ کیا ہوگا؟

کچھ ایسی ہی بات میرے ساتھ پیش آئی۔ میری زندگی جس طرح گزر رہی تھی، شاید ہی کسی دوسرے کی گزری ہوگی! بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بادشاہ کو بھی وہ چین اور سکون میسّر نہ ہوگا جو مُجھے حاصل تھا۔ میں اب ایک بہت بڑی جہازی کمپنی کا مالک تھا۔ خُدا نے مُجھے وہ سب کُچھ دیا تھا جس کی تمنّا دنیا میں ہر انسان کرتا ہے۔ میرے جہاز دُنیا کے دور دور کے ملکوں میں

جاتے تھے، ان میں سے کُچھ جہاز تجارتی تھے اور کُچھ مسافروں کو لانے لے جانے کے لئے میری تجارت خوب چمکی ہوئی تھی۔ وہ ملّاح جو "خوف ناک جزیرہ" والے سفر میں میرے ساتھ تھا، وہی اس وقت میرا سب سے بڑا مددگار تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گا میری ایک بچّی تھی، جس کے نام مسٹر جان نے اپنی تمام دولت کر دی تھی۔ اس بچّی کا نام ہم نے نجمہ رکھا تھا۔۔۔ نجمہ کے بعد اللہ نے مُجھے ایک چاند سا لڑکا دیا جس کا نام سب کے مشورے سے اختر رکھا گیا۔

یہی دو بچّے اب میری زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ دونوں کی عمریں اس وقت بالترتیب ۱۵ سال اور ۱۴ سال تھیں۔ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک کے بغیر دوسرے کو کبھی چین نہ ملتا تھا۔ ساتھ کھیلتے اور ساتھ اسکول جاتے۔ اپنے ان بچّوں کو میں دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ جس طرح میں اپنے لڑکپن میں خطروں میں کودنے کا عادی تھا،

بالکل اسی طرح نجمہ اور اختر بھی تھے ۔ ابھی سے وہ دونوں بہت نڈر اور بہادر تھے ۔ اوّل تو ان پر کوئی مُصیبت ابھی تک آئی نہیں تھی۔ مگر میں نے دیکھا کہ ہلکی سی تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی وہ دونوں مسکراتے رہتے۔ اور ان کی پیشانی پر ذرا سی بھی لکیر نہیں پڑتی تھی۔ میری ہی طرح وہ دونوں بھی اپنی اس چھوٹی سی عمر میں تقریباً پوری دنیا کا سفر کر چکے تھے ۔ میرے جہاز پوری دُنیا کا چکّر لگا کر آتے تھے اور اسی لئے ہر سفر میں کبھی نجمہ چلی جاتی تھی اور کبھی اختر۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں بچّے سمندری سفر کے عادی ہو گئے تھے اور طوفان یا خراب موسم میں بھی مسکراتے رہتے تھے ۔ روز روز کے سفر نے انہیں حالات کا مقابلہ کرنا سکھا دیا تھا اور اب وہ بالکل نڈر اور بہادر بن گئے تھے ۔

نجمہ کی پیدائش کے تین سال بعد جب کہ میری تجارت خوب بڑھ گئی تھی میں نے ایک شریف آدمی کو اپنے ہاں ملازم رکھا تھا۔ میرے جتنے بھی

ملّاح تھے، میں نے اسے ان سب کا نگراں بنا دیا تھا۔ اس کا نام بلونت تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا ہوشیار تھا کہ مُجھے کبھی اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ شاید ہی اس سے زیادہ شریف، ایماندار اور محنتی آدمی مُجھے کبھی ملا ہو۔ اس کی شرافت سے میری بیوی بڑی متاثر تھی۔ اس کا میرے گھر میں آنا جانا تھا اور میرے دونوں بچّے ایک طرح سے اسے اپنا چچا سمجھتے تھے۔ بلونت میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اس نے مزدوروں یا ملّاحوں پر کبھی سختی نہیں کی، اس لئے ملّاح اس کے گُن گاتے تھے اور اس کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ جہازوں کے کپتان میرے سامنے اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بلونت کا درجہ میری نظروں میں اپنے بڑے بھائی جیسا ہو گیا اور میں اس پر سب سے زیادہ اعتبار کرنے لگا۔ کیوں کہ درحقیقت وہ اس لائق تھا کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ بلونت ہی تھا جو میرے دونوں بچّوں کو باری باری یا کبھی ایک ساتھ ہی دنیا کے

سفر پر لے جاتا۔ بعض دفعہ وہ بالکل اکیلا جاتا اور کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں گیا ہے۔۔۔ حالانکہ بتاتا مُجھے بھی نہیں تھا مگر مُجھے یقین تھا کہ کسی مُلک میں اس کے بیوی بچّے بھی موجود ہیں اور یقیناً وہ انہیں کے پاس جاتا ہے۔ اس لئے میں نے کبھی اِس سِلسلے میں اس سے پوچھ گچھ نہیں کی۔

ملّاح، جو میرے پہلے سفر میں میرے ساتھ تھا اور جس کا نام کرشنا سوامی تھا، بلونت کے نیچے یعنی اس کے ماتحت کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ہم سب اسے صرف سوامی کہتے تھے۔ اگر دیکھا جائے تو میرے موجودہ کام میں بلونت اور سوامی میرے دونوں بازو تھے، ان کے بغیر میں کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ سوامی کی عادتیں بڑی عجیب تھیں۔ جب میں نے بلونت کو ملازم رکھا تھا، تبھی سے سوامی اس سے جلنے لگا تھا۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے صرف اتنا ہی جواب دیا کہ بس نہ جانے یہ آدمی مُجھے کیوں اچھّا نہیں لگتا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی تہہ میں کیا راز ہے؟ پہلے سوامی

سب ملّاحوں کا سردار بنا ہوا تھا اور اب بلونت کو میں نے اس کا سردار بنا دیا تھا۔ یہی بات اسے ناپسند تھی۔ ویسے یہ کہنے کی مُجھے ضرورت نہیں کہ میرے دونوں بچّوں کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا اور بچّے جب اسے کلو سوامی کہہ کر چڑاتے تو وہ ناراض ہونے کی بجائے خوب ہنستا۔۔۔۔۔ اسی بات سے اس کی اچھّی طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی وہ ہیبت ناک داستان شروع کروں جس کو لکھنے کے لئے میں نے آج پھر قلم اٹھایا ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جان اور جیک کے بارے میں چند باتیں آپ کو اور بتا دوں، کیونکہ ان دونوں کو آگے چل کر میری اس داستان میں بہت کام کرنا ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جان ہی دراصل ہمارے پہلے سفر میں پارٹی کا لیڈر تھا اور جیک اس کا ساتھی۔ یہ توفی الحال بتایا نہیں جا سکتا کہ ان دونوں نے تب کیا کارنامے انجام دیے، مختصراً مُجھے ان دونوں کے بارے میں

صرف اتنا کہنا ہے کہ جان جیک کو اپنے ساتھ لے کر واپس اپنے ملک امریکہ چلا گیا تھا۔ وہاں وہ اندھے بچّوں کا ایک اسکول چلاتا تھا۔ ہمارے پچھلے سفر میں اس نے ڈوبنے اور ابھرنے والے ایک جزیرے میں سے ایک خوفناک مکّھی کی حیرت انگیز آنکھیں نکالی تھیں اور انہیں آنکھوں کے اثر سے اس نے بہت سے اندھے بچّوں کو بینائی دی تھی۔ جان مُجھے اپنے لڑکے کی طرح سمجھتا تھا۔ اگر مُجھے ذراسی بھی تکلیف پہنچتی تو فوراً اس کا تار یا ٹیلی فون آتا۔ جب تک میں اسے یہ یقین نہ دلا دیتا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، تب تک اسے چین نہ آتا۔۔۔ جان اور جیک دونوں مُجھے اسی طرح چاہتے تھے۔

یہ ہے میرا اور میرے ساتھیوں کا تھوڑا سا تعارف، کیوں کہ یہ باتیں بتائے بغیر آپ سب میری اس عجیب اور حیرت انگیز کہانی کا لُطف نہیں اٹھا سکتے جو میں اب آپ کو سنانے والا ہوں۔ دراصل جو کُچھ اب تک

میں نے لکھا ہے وہ ایک طرح کی تمہید ہے۔ مطلب کی بات تو اب شروع ہوتی ہے مگر یقین مانیے گا، یہاں تک لکھنے کے بعد میرا قلم لرزنے لگا ہے اور میرے دِل کی دھڑکن بڑھ گئی ہے۔ مُجھے وہ پوری باتیں اور وہ سب خوفناک واقعات یاد آنے لگے ہیں، جن کا تصور کرتے ہی میں کانپ کانپ جاتا ہوں۔۔۔

میرے خُدا!۔۔۔ کتنی عجیب باتیں۔۔۔! کیسے ہیبت ناک واقعات مُجھے پیش آئے تھے۔ بس میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ سب جو میری اس عجیب و غریب کہانی کو پڑھنے والے ہیں، مُجھے یقین ہے کہ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد بہت دیر تک خوف کی وجہ سے لرزتے رہیں گے۔

اور اب میں دِل کو قابو میں کر کے وہ کہانی شروع کرتا ہوں جو عجیب و غریب اور دِل دہلا دینے والی ہے۔۔۔

اب سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ میں بمبئی میں اپنے عالی شان بنگلے

میں بیٹھا تھا۔ نجمہ اور اختر پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ بلونت میرے ایک جہاز کے ساتھ آسٹریلیا گیا ہوا تھا۔ ہاں البتّہ سوامی میرے جہازی دفتر میں موجود تھا۔ صُبح ہی صُبح میری طبیعت بہت خوش تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں، میری زندگی اب ہنسی خُوشی بسر ہو رہی تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اچانک مُجھے ایسا لگا جیسے مُجھ پر کوئی آفت آنے والی ہے، کوئی نامعلوم طاقت اور کوئی اَن دیکھی قوّت جیسے مُجھے بتا رہی تھی کہ آج میرے ساتھ کوئی عجیب سا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ بیٹھے بٹھائے میرا دِل گھبرانے لگا۔ دِل کی دھڑکن بڑھ گئی اور طبیعت پریشان سی ہو گئی۔ میری بیوی نے بھی میری اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ اس نے مُجھ سے پوچھا بھی کہ مُجھے اچانک کیا ہو گیا ہے۔۔۔ مگر میں اسے کیا بتاتا۔ مُجھے تو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یکایک میری ایسی حالت کیوں ہو گئی۔ یہ سوچ کر کہ شاید دفتر پہنچ کر میرے دِل پر سے یہ بوجھ اتر جائے میں فوراً دفتر جانے

کے لئے تیّار ہو گیا۔ ڈرائیور سے میں نے کار لانے کو کہا اور پھر کپڑے تبدیل کر کے بنگلے سے باہر آگیا۔ کُچھ ہی دیر بعد میں اپنے دفتر پہنچ گیا۔۔۔ سوامی مُجھے باہر ہی مل گیا۔۔۔

مجھے سوامی کی اس عادت کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ وہ چہرہ دیکھ کر دِل کا حال جاننے والوں میں سے تھا۔۔۔ اس کے سامنے ہی میں لڑکے سے جوان ہوا تھا۔ وہ مُجھ سے ایسی محبّت کرتا تھا جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے۔۔۔ اور شاید جان کے بعد وہی ایسا شخص تھا جس کی کڑوی کسیلی باتیں، جس کی ڈانٹ پھٹکار اور جس کا غُصّہ میں برداشت کرتا تھا۔۔۔ کسی کی طاقت نہیں تھی کہ مُجھے غُصّے کی نظر سے دیکھ سکے۔ ہاں البتّہ سوامی مُجھے ڈانٹتا تھا، اور میں سب سہتا تھا، اس کی کسی بات کا بُرا نہیں مانتا تھا۔۔۔ تو یہی سوامی مُجھے دفتر کے باہر مل گیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ میرے ساتھ ہی اندر دفتر میں آگیا اور کہنے لگا۔

"کیا بات ہے مالک۔۔۔ آپ اداس ہیں۔۔۔ بے بی اور بابا تو ٹھیک ہیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں سوامی۔۔۔ نہ جانے کیا بات ہے، مُجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آج مُجھے کوئی بہت بڑی تکلیف پہنچنے والی ہے۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"واہ۔۔۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔۔۔ آپ بڑے وہمی ہو گئے ہیں۔۔۔" سوامی نے ہنس کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ میری عمر کے ساتھ ساتھ وہم بڑھتا جا رہا ہو۔۔۔"

"واہ۔۔۔ خوب کون سے آپ بُوڑھے ہو گئے ہیں۔۔۔ اپنے ذہن سے یہ خیال ہٹا دیجئے اور کام کاج میں دلچسپی لیجئے۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں ہنس کر چُپ ہو رہا۔ مگر اندر ہی اندر میرا دِل ڈوب سا رہا تھا۔ ایک عجیب سی حالت تھی جس نے مُجھے بے چین کر رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اتنا بڑا آدمی بننے کے باوجود بھی میں ایک مذہبی آدمی تھا۔ خُدا نے میرے ہر آڑے وقت میں مدد کی تھی۔۔۔ جب مُجھے اپنی زندگی کی ذراسی بھی اُمّید نہیں تھی، اس وقت خُدا نے میرے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔۔۔ لہٰذا اس وقت بھی میں نے خُدا ہی کے اوپر اپنا معاملہ چھوڑ دیا۔۔۔ یہ جو میرا دِل کانپ رہا تھا، مُجھے یقین تھا کہ یہ کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔۔۔ مگر میں اپنی تقدیر سے کس طرح لڑ سکتا تھا!۔۔۔ اس لئے خاموشی سے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ دیکھو کیا ہوتا ہے اور کیا نئی بات ہوتی ہے!

اور وہ نئی بات ہو گئی۔ جس بات کا مُجھے اندیشہ تھا وہی ہوئی۔ سوامی مُجھے تسلّی دے رہا تھا کہ اچانک دفتر کا دروازہ کھلا اور میری سیکرٹری ماریا اندر

داخل ہوئی اور بولی۔

"سر۔۔۔ ایک مچھیرا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔۔۔"

"مچھیرا۔۔۔!" سوامی نے حیرت سے کہا۔

"تم خود ہی اس سے بات کیوں نہیں کر لیتیں۔۔۔!"

"سر، میں نے بہتری کوشش کر لی، مگر وہ نہیں مانتا۔۔۔ وہ کہتا ہے بہت ضروری کام ہے۔۔۔ مالک ہی سے بات کروں گا۔"

میرے دِل میں اتھل پتھل ہونے لگی۔۔۔ کون ہو سکتا ہے وہ مچھیرا۔۔۔ آخر اسے مُجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے! کیا میں اس سے ملاقات کر لوں یا پھر انکار کر دوں۔۔۔ بڑی دیر کے سوچ بچار کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اُسے بُلا کر اس کی بات سُن ہی لینی چاہیئے۔ میں نے ماریا سے کہہ دیا کہ اسے اندر لے آئے۔ ماریا چلی گئی۔۔۔ مگر ہائے اب مُجھے وہ وقت یاد آتا ہے

تو دِل کانپ جاتا ہے۔ کاش وہ مچھیرا مُجھ سے ملنے نہ آتا۔ کاش میں اس سے ملنے سے انکار کر دیتا!۔۔۔ مگر تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی، قدرت نے میرے حق میں یہی فیصلہ کر دیا تھا کہ میں اس مچھیرے سے مِلوں اور آفتوں کو گلے لگا لوں۔

"حضور۔۔۔ سلام حضور۔۔۔" مچھیرا اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"کیا بات ہے۔۔۔ تم مُجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔" میں نے پوچھا۔

مچھیرے نے اپنے تھیلے میں سے ایک شیشے کی بوتل نکالی اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرا باپ بہت غریب اور اَن پڑھ ہے سرکار۔۔۔ اپنے خاندان میں صرف میں ہی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہوں حضور۔۔۔ میرے باپ نے مُجھے یہ بوتل دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ کل سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہا

تھا کہ یہ بوتل اسے سمندر کے اندر بہتی ہوئی نظر آئی۔ لہریں اسے ساحل کی طرف لے جا رہی تھیں۔ اس نے جھک کر اُسے اُٹھا لیا۔۔۔ اور آج میں اِسے لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟" میں نے تعجّب سے دریافت کیا۔

"اس لئے حضور کہ یہ بوتل آپ کے نام ہے۔۔۔"

میں نے یکایک چونک کر پوچھا۔

"میرے نام۔۔۔ کیا مطلب؟"

"کیا بوتل پر کوئی پتہ لکھا ہے جو تم اسے لے کر مالک فیروز کے پاس آئے ہو؟" سوامی نے مچھیرے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اگر ایسا ہی تھا تو پھر پانی میں وہ پتہ مِٹا کیوں نہیں؟"

"بوتل پر تو نہیں لکھا سرکار، مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ میں

تھوڑا پڑھا لکھا ہوں۔“

”تو پھر۔۔۔؟“ سوامی نے پوچھا۔

”سرکار بوتل کی ڈانٹ کھولنے کے بعد مُجھے اس میں سے دو خط ملے۔۔۔ ایک خط اُس شخص کے نام ہے جسے یہ بوتل ملی ہے اور دوسرا خط مالک کے نام ہے۔ پہلا خط بوتل کے گلے تک ہی تھا، اس لئے آسانی سے نکل آیا اور دوسرا خط جس کے باہر مالک کا نام فیروز لکھا ہے، بوتل کے پیندے کے قریب تھا۔ وہ تو صرف بوتل کو توڑنے کے بعد ہی نکل سکتا ہے۔“

”تو پھر تُم نے بوتل کیوں نہیں توڑی؟“ سوامی نے پوچھا۔

”اسے نہ توڑنے کی ہدایت اس خط میں درج ہے جو میرے باپ کے نام ہے۔۔۔ یہ لیجئے وہ خط، اسے پڑھ لیجئے۔“

مچھیرے نے میری طرف خط بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے وہ خط لے لیا۔ کسی جیبی ڈائری سے پھٹا ہوا ایک ورق تھا وہ اور اس پر ٹوٹی پھوٹی اُردُو میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی :

بوتل پانے والے کے نام

اے شخص! تم چاہے کوئی ہو، کسی بھی مذہب اور کسی بھی قوم سے ہو، ایک اجنبی آدمی تم کو اس ذات کا واسطے دے کر جسے تم پوجتے ہو، کہتا ہے کہ اس کا یہ کام کردو اور اس کے عوض میں پانچ ہزار روپے حاصل کر لو۔ میں نے بوتل میں ایک دوسرا خط اور رکھا ہے۔ براہ کرم اُسے مت پڑھنا۔ مُجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ بوتل تمہیں ملے گی بھی یا نہیں۔ میں نے تو اس میں خط رکھ کر اور پھر ڈاٹ لگا کر سمندر میں پھینک دیا ہے۔ مُجھے صرف خُدا پر بھروسہ ہے، اگر اسے مُجھے زندہ رکھنا ہے تو پھر یہ بوتل ایک نہ ایک دِن کسی بھی ساحل سے ضرور لگے گی۔۔۔ مُجھے یقین ہے کہ کوئی

اسے ضرور اٹھائے گا۔ اس لئے اگر یہ بوتل تمہیں مل رہی ہے تو تمہارا کام یہ ہے کہ اس پرچے پر نیچے لکھے ہوئے پتے پر یہ بوتل پہنچا دو اور فوراً ہی اس شخص سے پانچ ہزار روپے لے لو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بوتل والا دوسرا خط پڑھتے ہی وہ تمہیں پانچ ہزار روپے فوراً دے دے گا اور اگر اتّفاق سے تم کسی دور دراز ملک کے رہنے والے ہو تو تمہیں آنے جانے کا خرچ بھی دے گا۔ مگر خُدا کے لئے بوتل ملتے ہی اسے پہنچا دینا۔ کیوں کہ اسی پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔۔۔ خُدا کی قدرت دیکھو کہ ایک مجبور و بے کس انسان اپنی زندگی کی گھڑیاں گِن رہا ہو گا جب کہ تم پانچ ہزار روپے حاصل کر رہے ہو گے۔ اس شخص کا پتہ یہ ہے :

نوّاب زادہ فیروز، فیروز سی ٹریولرز، بائی کلا۔۔۔ بمبئی (انڈیا)

فقط : ایک مصیبت زدہ

مچھیرے کے نام یہ خط پڑھ کر میری عجیب حالت ہو گئی، کون ہو سکتا ہے

یہ آدمی۔۔۔کہاں ہے اوراس پر کون سی مصیبت نازل ہوئی ہے؟ یہی سوالات تھے جو بار بار میرے ذہن میں آنے لگے۔ سوامی اور مچھیرا دونوں مُجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں بوتل کو غور سے دیکھ رہاتھا۔ اس بوتل میں پڑے ہوئے خط میں میرے لئے کسی نے کوئی گہراراز چھوڑا ہے۔ کیا راز ہو سکتا ہے وہ؟۔۔۔ اور پھر یہ کون آدمی ہے جسے اتنا یقین ہے کہ خط پڑھتے ہی میں مچھیرے کو پانچ ہزار روپے دے دوں گا! میرے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ دِل چاہتا تھا فوراً ہی بوتل توڑ کر وہ خط نکال لوں۔۔۔ مگر عقل روکتی تھی کہ نہیں۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو اس خط میں تیرے لئے کوئی مُصیبت چھپی بیٹھی ہو! ہزاروں مُصیبتیں اُٹھانے کے بعد اب میں ہر قدم پھُونک پھُونک کر رکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔

"کیوں مالک! کیا کوئی خاص بات ہے؟" سوامی نے مُجھے پریشان دیکھ کر

پوچھا۔

"نہیں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔۔۔ یہ بوتل میرے ہی نام ہے اور اس میں سے جو خط دکھائی دے رہا ہے۔۔۔ وہ بھی میرے ہی لئے ہے۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں بوتل کو پھر غور سے دیکھنے لگا۔ وہ بوتل ایسی تھی جیسی کہ لوگ عموماً سفر میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی بالکل چپٹی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ شاید پٹرول یا اسپرٹ کے لئے کام میں لائی جاتی ہوگی۔ کیوں کہ وہ ایک چھوٹی سی جیبی بوتل تھی اور اب اس بوتل میں سے ایک خط مُجھے جھانک رہا تھا۔ زیادہ دیر پریشان ہونے سے بچنے کی خاطر میں نے سوامی سے کہا کہ وہ بوتل توڑ دے۔

سوامی نے مُجھے پھر حیرت سے دیکھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ میں ضدّی ہوں۔ اور پھر چونکہ خط حاصل کرنے کا طریقہ بوتل توڑنے کے علاوہ اور کوئی نہیں

تھا اس لئے سوامی نے وہ بوتل توڑ دی اور پھر اس میں سے جیبی ڈائری کے تین ورق نکال کر مُجھے دے دیے۔ یہ تینوں ورق جنگلی ببول کا نٹے سے نتھی تھے۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے وہ ورق کھولے اور پھر انہیں پڑھنے لگا۔ میرے نام یہ عجیب و غریب خط اُردُو زبان میں لکھا ہوا تھا اور جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ یہ خط پڑھتے ہوئے میری حالت غیر ہونے لگی۔ جوں جوں میں خط پڑھتا جاتا تھا میرا دِل لرزتا جاتا تھا۔ شاید آپ لوگ جو میری اس کہانی کو پڑھ رہے ہیں، خود بھی اس خط کا مضمون جاننے کے لئے بے تاب ہوں گے۔۔۔ میں آپ کو زیادہ دیر تک انتظار میں نہ رکھتے ہوئے وہ خط ہو بہُو نقل کرتا ہوں۔

۲ فروری

میرے بیٹے، میرے فیروز!

میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمہیں تفصیل سے سب کُچھ بتاؤں۔ یہ

تو تمہیں اس وقت معلوم ہو گا جب کہ ہم ملیں گے (خُدا کرے کہ ایسا ہی ہو!) میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں اور جیک اس غیر آباد جزیرے پر ایڑیاں رگڑ کر مر رہے ہیں۔ میری طاقت ختم سی ہو چکی ہے۔ پینے کا پانی اس جزیرے میں بہت کم ہے۔ ہم دونوں زخمی بھی ہیں۔ تکلیف اب برداشت سے باہر ہے۔ ہم دونوں کا کیا حشر ہو گا، یہ تو خُدا ہی بہتر جان سکتا ہے، گِدھوں کی ٹولی یہاں کے اُجاڑ سے درختوں پر بیٹھی، ہماری جان نکلنے کا انتظار کر رہی ہے۔ خُدا کے لئے جلدی ہمیں ڈھونڈو اور اس مُصیبت سے نجات دلاؤ۔۔۔ میں کہاں ہوں، کس جگہ ہوں میں یہ کُچھ نہیں بتا سکتا، میرے پاس قطب نما بھی نہیں ہے جو تمہیں صحیح سمت بتلاؤں۔۔۔ بس میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر میری قسمت میں تم سے ملنا لکھا ہے تو تم مُجھے ڈھونڈ ہی لو گے۔۔۔ اور اگر میں تم سے ملنے سے پہلے ہی مر گیا۔۔۔ تو پھر میری اور جیک کی طرف سے ہمیشہ کے لئے خُدا حافظ!

تمہارا

جان اسمتھ ولیم

اب آپ سب اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ خط پڑھنے کے بعد میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔۔۔! میرا بزرگ، میرے باپ کے برابر شخص، وہ شخص (جان کے پورے حالات معلوم کرنے کے لئے ناول "خوف ناک جزیرہ" ملاحظہ فرمائیے۔) جسے میں دُنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا اور جس کا بہت زیادہ ادب کرتا تھا، وہی شخص اس وقت میری مدد کا محتاج تھا۔۔۔ مگر بد قسمتی دیکھئے مُجھے یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، بوتل اس نے پانی میں ۲ فروری کو ڈالی تھی اور اس دِن جب کہ وہ مچھیرا میرے پاس آیا تھا، ۱۵ فروری تھی۔۔۔ تیرہ دِن تک یہ بوتل سمندر کی بے رحم موجوں کے سہارے ڈولتی رہی۔۔۔ کیا تیرہ دِن تک وہ زندہ رہے ہوں

گئے؟

یہ بھیانک خیال آتے ہی میرا دِل لرزنے لگا۔ جان کا خیال مُجھے بری طرح تڑپانے لگا۔ یہ احساس کہ میں اس وقت عیش کر رہا ہوں اور سمندر کے بیچ میں کسی ویران ٹاپو پر جان موت اور زندگی کی کشمکش میں بتلا ہے، میرے لیئے بڑا جان لیوا تھا۔ میری مُٹھّیاں بھینچ گئیں۔ چہرہ سُرخ ہو گیا اور میں یکایک کھڑا ہو گیا۔ سوامی مُجھے تعجّب سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"سوامی۔۔۔ اس مچھیرے کو اکاؤنٹنٹ کے پاس لے جاؤ اور پانچ ہزار روپے ابھی دے دو۔ اس کے ساتھ ہی میرا خاص اسٹیمر تیّار کراؤ، میں آج ہی ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا چاہتا ہوں۔۔۔"

یہ سنتے ہی سوامی کا مُونہہ حیرت کی وجہ سے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ اس نے کُچھ بولنے کی کوشش کی ہی تھی کہ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

”میرا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ میرا وقت ضائع مت کرو، جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔۔۔“

سوامی میرے تیور پہچان گیا اور چُپ چاپ مچھیرے کو لے کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری عجیب حالت ہو گئی۔ جان کا تصوّر رہ رہ کر ستانے لگا۔ جیک کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ کبھی میں سوچنے لگتا کہ آخر ان دونوں پر کیا مُصیبت پڑی جو وہ ایک نا معلوم جزیرے میں پہنچ گئے، کبھی خیال آتا کہ آخر وہ امریکہ سے کس چیز کی تلاش میں نکلے تھے۔۔۔ کہاں جا رہے تھے؟ کس لئے جا رہے تھے؟ مگر ان سوالوں کا جواب تو مُجھے اسی وقت مل سکتا تھا جب کہ میں جان اور جیک کو ڈھونڈ نکالتا!

پریشانی کی وجہ سے میں کمرے میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگا۔ اچانک آواز آئی۔

"کیا بات ہے آپ پریشان کیوں ہیں؟"

میں نے مُڑ کر دیکھا تو بلونت دروازے میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دِل کو ڈھارس بندھی۔ بلونت، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے باہر گیا ہوا تھا اور شاید آج ہی واپس آ گیا تھا، میں نے اس سے کہا۔

"آؤ بلونت۔۔۔ مُجھے اس وقت تمہاری سخت ضرورت ہے۔۔۔ مگر تم واپس کب آئے؟"

"ابھی ابھی۔۔۔" بلونت نے جواب دیا۔

"راستے میں سوامی نے مُجھے سب کُچھ بتا دیا ہے۔"

بلونت کو اپنے پاس بٹھا کر میں نے اسے تمام واقعات بتائے۔ اتنی ہی دیر میں سوامی بھی واپس آ گیا۔ اس نے مچھیرے کو پانچ ہزار روپے دلوا دیے تھے۔ میں نے ان دونوں کو سب باتیں بتا کر انہیں حُکم دیا کہ اسٹیمر میں نا

معلوم عرصے تک کام آنے والا راشن رکھ لیں، اسے سب ہتھیاروں سے لیس کرلیں اور ابھی ملّاحوں کو تیّار رہنے کا حُکم دے دیں، اتنی دیر میں میں اپنے بیوی بچّوں سے مل آؤں۔ یہ حُکم سن کر بلونت نے اپنی ذمّہ داری محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ بے فکر رہیئے، ہم جان اور جیک کو ضرور ڈھونڈ لیں گے۔۔۔ آپ بچّوں سے مل آئیں، ہم سب تیّار ہوتے ہیں۔۔۔ جیسا کہ آپ نے کہا ہے ہم اتنے میں اسٹیمر کو جنگی سامان سے لیس کر دیتے ہیں۔"

مجھے اب یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ بیوی سے میں کس طرح رُخصت ہوا، یہ تو ظاہر ہے کہ وہ بے چاری میرے سفر کا سُنتے ہی پریشان ہو گئی۔ مگر میں نے اُس کی ڈھارس بندھائی، بچّے اسکول سے آ چکے تھے، انہیں پیار کیا اور نصیحتیں کیں۔ اس کے بعد بیوی کو آنسو بہاتا چھوڑ کر میں ساحل کی طرف روانہ ہوا۔ بندرگاہ پر میرا اسٹیمر کھڑا ہوا تھا۔ سب سامان تیّار تھا،

میرے بیٹھتے ہی بلونت نے اسٹیمر چلوا دیا اور میں لرزتے ہوئے دِل اور حسرت بھری نگاہوں سے اسٹیمر کو بندرگاہ سے دور ہوتے دیکھتا رہا۔ اس وقت میرے دِل میں عجیب عجیب خیال آ رہے تھے، خُدا جانے میں واپس آؤں گا یا نہیں۔۔۔ میری منزل کون سی ہے۔۔۔ مُجھے جانا کس طرف ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا یہ سفر آخری سفر ہو اور اب میں کبھی بمبئی کی شکل نہ دیکھ سکوں!

۔۔۔ بڑی مشکل سے یہ واہیات خیال اپنے ذہن سے دور کیا اور اکیلا بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کھڑکی میں سے نظر آنے والا سمندر اب آہستہ آہستہ ڈراؤنا ہوتا جا رہا تھا۔ لہریں ایک دوسرے سے گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔ اسٹیمر رفتار پکڑ رہا تھا۔۔۔ جوں جوں وہ سمندر کے اندر بڑھتا جاتا میرا دِل ڈوبتا جاتا، کوئی نا معلوم طاقت کہہ رہی تھی کہ بس اب واپس آنا محال ہے۔ جس سفر کے لئے میں نکلا ہوں، وہ سفر ایسا ہو گا کہ بڑے بڑے

سورماؤں کا پتہ پانی ہوجائے۔ میرے دِل کی عجیب حالت تھی۔ جان مُجھے جتنا عزیز تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ میں اس کی خاطر اپنے بیوی بچّوں کو بھی چھوڑ بیٹھا تھا۔ ان سب سے خُدا حافظ کہتے ہوئے دِل میں میں نے یہی سوچ لیا تھا کہ بس یہ خُدا حافظ ہمیشہ کے لئے ہے!

مئی کا مہینہ تھا، سمندری علاقے میں لُوئیں تو چلتی نہیں، موسم تقریباً ایک جیسا ہی رہتا ہے۔ اس لئے سفر میں مُجھے کُچھ پریشانی نہیں ہوئی۔ ہم لوگ بڑے مزے میں سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بمبئی کا ساحل اب ایک پتلی سی لکیر نظر آتا تھا، پام کے لمبے لمبے درخت دور سے بالکل گھاس معلوم ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ زمین کی پتلی سی لکیر بھی اب نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور تب مُجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرے پچھلے سفر میں تو میرے ساتھ ایک پوری پارٹی تھی مگر اس سفر میں سوائے بلونت اور سوامی کے میرا

کوئی ہم درد نہیں تھا۔ سب سے بڑی فکر جو مُجھے پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ میں جان کو کہاں تلاش کروں؟ وہ کون سا غیر آباد جزیرہ ہے جس پر وہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔

سمندر کے نقشے پر نظر ڈالنے کے بعد بھی مُجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جنوبی امریکہ، افریقہ اور ہندوستان کے سمندروں میں کوئی ایسا جزیرہ بھی ہے جس پر آبادی کا نام و نشان ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مُجھے یہ سوچ کر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ آخر وہ کون سی وجہ تھی، جس سے مجبور ہو کر جان نے سمندری سفر ہی کیا۔ حالاں کہ اگر وہ چاہتا تو بذریعہ ہوائی جہاز بھی ہر جگہ جا سکتا ہے کیوں کہ اب وہ اتنا دولت مند تھا کہ اگر چاہتا تو کئی ہوائی جہاز خرید سکتا تھا!

اپنے اسٹیمر کے عالی شان اور خوب صورت کیبن میں بیٹھا ہوا میں لگاتار سوچے جا رہا تھا کیوں کہ اس کے علاوہ اب مُجھے اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔

سہ پہر کے وقت میں بمبئی سے چلا تھا اور اب شام ہو رہی تھی۔ سمندری کونج اور دوسرے لمبی لمبی چونچوں والے پرندے آہستہ آہستہ ہوا میں اُونچے اڑنے لگے تھے۔ پرندوں کو دیکھ دیکھ کر مُجھے رشک آرہا تھا۔ ایک یہ پرندے ہیں کہ بمبئی کی طرف اپنے آشیانوں میں جا رہے ہیں اور ایک میں ہوں کہ اپنے گھر سے ہمیشہ کے لئے دور ہوتا جا رہا ہوں!

ہوا تھم گئی تھی۔ سمندر کی لہریں اب چُپ چاپ ہونے لگی تھیں۔ سورج سمندر میں ڈوب رہا تھا اور پانی پر ایسا لگتا تھا جیسے یہاں سے وہاں تک کسی نے ایک نارنجی رنگ کا راستہ بنا دیا ہو۔ منظر بڑا حسین تھا مگر سورج کی ہی طرح میرا دِل بھی ڈوب رہا تھا۔ میں آرام کرسی کی کمر سے ٹیک لگائے بڑی خاموشی سے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور سوامی اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مالک!۔۔۔ میں یہ پوچھنے حاضر ہوا ہوں کہ اب کیا کیا جائے؟" اس نے دریافت کیا۔ "یہ تو مُجھے معلوم ہے کہ آپ کی کوئی منزل نہیں ہے، مگر میں ملّاحوں سے کیا کہوں کہ ہمیں کون سی سِمت مقرّر کرنی ہے، کدھر جانا ہے؟"

بات معقول تھی، درحقیقت سمندر میں آجانے کے بعد مُجھے اب ملّاحوں کو بتانا ہی تھا کہ انہیں کس طرف جانا ہے، مگر کاش! مُجھے خود معلوم ہوتا کہ مُجھے کہاں جانا ہے؟ سوامی سے میں نے یہی کہا کہ مُجھے نہیں معلوم۔

"پھر۔۔۔ پھر کیا آپ چاہتے ہیں کہ اسٹیمر میں بھرا ہوا پٹرول بے کار اِدھر اُدھر گھوم کر ضائع کر دیا جائے۔ کیوں کہ اس صورت میں تو یہی ہوگا۔۔۔" سوامی نے پوچھا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔" میں نے آرام کرسی سے اٹھ کر کیبن میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

"میں نے بہت سوچا ہے سوامی، مگر مُجھے خود معلوم نہیں کہ وہ جزیرہ کون سا ہے جہاں جان اور جیک موجود ہیں۔ میں تو اب یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ زندہ ہیں۔ کون جانے کہ جب ہم وہاں پہنچیں تو ہمیں ان دونوں کے پنجر ہی ملیں۔ مگر جیسا کہ میرا عقیدہ ہے اور جیسا کہ میرے ساتھ پچھلے سفر میں ہوا ہے۔ خُدا ہی ہر مُصیبت میں میرا مدد گار رہا۔ ہو سکتا ہے کہ کل صُبح ہونے پر خُدا ہی ہمیں کوئی راستہ دکھائے! فی الحال تم یہ کرو کہ نقشہ دیکھ کر آس پاس جو بھی غیر آباد جزیرے ہوں انہیں کھوجنا شروع کر دو۔ باری باری ہر جزیرہ تلاش کرنے پر ہو سکتا ہے کہ جان کا کوئی سراغ مل جائے!"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" سوامی نے خوش ہو کر کہا۔

"کچھ تو معلوم ہوا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے، میں ابھی ملّاحوں کو حُکم دے دیتا ہوں۔۔۔"

وہ جانے کے لئے مُڑا ہی تھا کہ کیبن کا دروازہ پھر کھلا اور بلونت اندر داخل

ہوا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے جو وہ یوں گھبرایا ہوا اندر آیا ہے۔ پہلے اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے بعد جلدی سے لکھنے کی میز پر جا بیٹھا۔ اور جلدی جلدی اس نے ایک کاغذ پر کُچھ لکھنا شروع کیا۔ مگر لکھتے ہوئے وہ برابر بولتا بھی رہا۔

"رات ہو گئی ہے۔ آپ کہیں تو آپ کے لئے کھانا منگوایا جائے۔"

"نہیں بلونت۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ میری بھوک اُڑ گئی ہے۔۔۔" میں نے اس کی بات سمجھ کر جواب دیا۔

مجھے بڑی حیرت تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے۔ کسی کو سُنانے کی خاطر بلونت خواہ مخواہ بول رہا ہے مگر جو بات اسے کہنی ہے وہ اُسے کاغذ پر لکھ رہا ہے۔ میرا یہ خیال درست ثابت ہوا، بلونت نے جلدی سے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا اور کہنے لگا۔

"رات اب ٹھنڈی ہو جائے گی۔ موسم کافی خوش گوار ہو گیا ہے۔۔۔"

اتنا کہہ کر اس نے مُجھے دیکھا، پرچہ میں پڑھ چکا تھا اور اب مُجھے بڑی حیرت تھی کہ آخر یہ کیا ہوا۔۔۔؟ پرچے پر بلونت نے صرف اتنا لکھا تھا۔

"خبردار۔۔۔ اسٹیمر کے نچلے حصّے میں کوئی موجود ہے۔ اس کے قدموں کی آوازمیں نے سُنی ہے۔۔۔"

بلونت کا دیا ہوا پرچہ پڑھتے ہی میں چوکنّا ہو گیا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ یہ بات سوامی کو بھی بتا دے اور جب بلونت نے سوامی کے کان میں آہستہ سے نئے خطرے کی بابت بتایا تو اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ حملہ کرنے سے پہلے شیر کی جو حالت ہوا کرتی ہے، وہی اس کی ہوئی۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں تن گئیں۔ سیاہ چہرے پر خُون جھلکنے کی وجہ سے چہرہ ہلکا نیلا سا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے کان میں کہا۔

"بلونت نے ٹھیک کیا اور بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ آپ پستول نکال لیجئے، اتنے میں ڈیک پر جا کر خلاصیوں کو اس خطرے کی بابت بتاتا ہوں۔"

"پاگل ہوئے ہو!" میں نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا۔۔۔

"خلاصیوں کو کُچھ مت بتاؤ۔ صرف ہم تینوں ہی اسٹیمر کے نچلے حصّے میں چلیں گے اور معلوم کریں گے کہ ہمارا کون سا نیا دُشمن پیدا ہو گیا ہے۔"

سوامی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور پھر اس نے کسی کو سنانے کی خاطر اونچی آواز سے کہا۔

"میں نے خانساماں سے کہہ دیا ہے، وہ کھانا لے کر ابھی آتا ہے۔۔۔"

"اچھّا۔۔۔ ٹھیک ہے۔" میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

اس کے بعد ہم تینوں پنجوں کے بل چلنے لگے، میں نے اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا۔ بلونت نے ایک لمبا اور خوف ناک چاقو اور سوامی نے نیزہ تھام

لیا۔ اس کے بعد ہم تینوں دبے دبے پاؤں رکھتے ہوئے کیبن سے باہر آئے۔ کیبن کے بالکل برابر ہی وہ زینہ تھا جو اسٹیمر کے نچلے حصّے تک جاتا تھا۔ اس حصّے میں مختلف قسم کا سامان رکھا جاتا تھا۔ خلاصی بھی اسی میں رہتے تھے، یا اگر یوں کہا جائے کہ وہ حصّہ ایک طرح کا گودام تھا تو غَلط نہ ہو گا۔۔۔ سب سے آگے میں تھا، میرے پیچھے سوامی اور پھر بلونت۔ بغیر کوئی کھٹکا پیدا کیئے یا بغیر کسی آواز کے ہم لوگ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے رُک کر کوئی آواز سننے کی کوشش کی۔ بلونت نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ واقعی کسی کے کھڑ پڑ کرنے کی آواز آ رہی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ آواز دراصل اس شخص کے قدموں کی تھی۔ اندر پڑی ہوئی چیزوں کو پاؤں سے روندتا ہوا وہ شخص چھپنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اب ہم لوگ اسٹیمر کے نچلے حصّے کے بالکل بیچ میں کھڑے ہوئے تھے۔ اچانک کسی کے کھُسر پھُسر کرنے کی آواز

آئی۔ ۔ ۔ ہم پھر چوکنّے ہو گئے۔ پہلی بار ہم نے کسی کو بولتے ہوئے سُنا تھا اسی سے ہم نے اندازہ لگا لیا کہ وہاں دو آدمی ہیں۔ کیوں کہ اکیلا آدمی اپنے سے ہی تو نہیں بول سکتا۔ ۔ ۔ بات کرنے کے لئے کسی دوسرے آدمی کی ضرورت لازمی ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اشارے سے سوامی اور بلونت سے کہا کہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر بجلی جلا دیں۔ وہ دونوں میرے اس اشارے کو سمجھ کر آگے بڑھے اور پھر فوراً ہی انہوں نے بجلی جلا دی۔ کھُسر پھُسر کی آوازیں ایک دم بند ہو گئیں اور ساتھ ہی میں نے چلّا کر کہا۔

"خبردار۔ ۔ ۔ جو کوئی بھی ہے فوراً باہر آ جائے ورنہ بُرا حشر ہو گا۔"

نہ تو کوئی آواز آئی اور نہ کوئی باہر آیا۔ ۔ ۔ یہ دیکھ کر میں نے ایک چال چلنے کی سوچ لی اور کہا۔

"میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ ۔ ۔ فوراً باہر آ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

یکایک ایک کونے میں رکھے ہوئے بارود کے ڈبّوں کے پیچھے سے کوئی نکل کر باہر آیا اور ساتھ ہی اس نے چلّا کر کہا "نہیں نہیں ابّا جی۔۔۔ گولی مت ماریئے، ہم دونوں ہیں اختر اور نجمہ۔"

"ارے تم۔۔۔!" میں نے حیرت سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہمیں معاف کر دیجئے ابّا جی، ہم چوری چھُپے یہاں آ گئے تھے۔" اختر نے جواب دیا۔

"مگر بیٹا تم آئے کیوں؟ تمہیں معلوم نہیں کہ ہم ایک لمبے اور خطرناک سفر پر جا رہے ہیں۔" سوامی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

دونوں بچّے اس سے آ کر لپٹ گئے۔ سوامی نے ہی انہیں پالا تھا، اس لئے وہ ہمیشہ ان دونوں کا پارٹ لیتا تھا۔

"مجھے معلوم تھا سوامی چاچا۔ میں نے ابّا جی کا پچھلا سفر نامہ (خوفناک جزیرہ)

پڑھا تھا۔"

اختر نے رُک رُک کر اور مُجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اس سفر میں انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں اور انہیں بڑے عجیب عجیب لوگ ملے تھے۔ لمبے لمبے دیو اور پتھرّ کے محافظ۔ خوف ناک مکھّی اور چِکنی زمین۔۔۔ مجھے۔ مُجھے بھی ایسی مہموں میں حصّہ لینے کا بہت شوق ہے چاچا، اسی لئے میں اسٹیمر میں آ کر چھپ گیا تھا۔"

"مگر تم نجمہ کو اپنے ساتھ کیوں لے کر آئے؟" بلونت نے غُصّے سے پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں تو خود آئی ہوں، اختر اکیلا آتا، یہ مُجھے اچھّا نہیں لگتا۔ میں اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔" نجمہ نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

"مگر تُم نے یہ نہیں سوچا کہ تمہاری ماں بھی تمہارے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔۔۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "جب اسے معلوم ہو گا کہ تم دونوں گھر پر نہیں ہو تو جانتے ہو اس کا کیا حال ہو گا۔۔۔ تم نے تو اسے یہ بھی نہیں بتایا ہو گا کہ تم میرے ساتھ سفر پر جا رہے ہو!۔۔۔ بتایا تھا؟"

"جی نہیں۔" نجمہ نے ندامت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"خیر مالک اب ان دونوں کو کیا کہنا۔۔۔" سوامی نے پھر ان کا پارٹ لیتے ہوئے کہا۔ "اب تو یہ آ ہی گئے ہیں، اب کیا ہو سکتا ہے۔ مسٹر جان کو ڈھونڈنے کے بعد ہم ان دونوں کو اسٹیمر میں واپس بھیج دیں گے۔ اسٹیمر انہیں پہنچا کر واپس آ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" میں نے کُچھ نرم ہو کر کہا۔

"مگر میں انہیں اس کی سزا ضرور دوں گا۔ جب بھی مُجھے اس کا موقع ملا۔ یہ

بتائے دیتا ہوں۔۔۔"

"چلو تم دونوں اوپر چلو۔۔۔" سوامی نے اختر اور نجمہ کو پیار سے ڈانٹ کر کہا۔

وہ دونوں جب مُسکراتے ہوئے اوپر جانے لگے تو بلونت نے مُجھ سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نجمہ کو اختر کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ نجمہ لڑکی ہے اور کسی نہ کسی وقت ہمیں مُصیبت میں مبتلا کر سکتی ہے!"

"خیر تم فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔

"جان اور جیک کو تلاش کرنے کے بعد ہم انہیں واپس بھیج دیں گے۔"

مگر جیسا کہ آپ آگے دیکھیں گے، تقدیر کھڑی ہم پر ہنس رہی تھی۔ کاش

مُجھے معلوم ہو جاتا کہ آگے میرے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ بلونت نے نجمہ کی آمد کو جو اچھّی نظر سے نہیں دیکھا تھا، یہ راز اس وقت تو مُجھے معلوم نہ ہو سکا مگر آئندہ پیش آنے والے واقعات بتائیں گے کہ بلونت نے کیوں یہ بات کہی تھی اور نجمہ کی موجودگی سے مُجھے کیا نقصان اور کیا فائدے پہنچے!

اسٹیمر کے نچلے حصّے میں کھانے پینے کا سامان تو زیادہ تھا ہی اس لئے دونوں بچّوں کو تکلیف تو کُچھ نہیں ہوئی البتّہ ان کے کپڑوں کا بندوبست کرنا مشکل ہو گیا۔ کیوں کہ نچلے حصّے میں ہر طرح کا سامان تھا، رنگ روغن، کوئلہ اور چونا وغیرہ۔ بچّوں کے اِدھر اُدھر چھپنے کی وجہ سے ایک تو ان کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے دوسرے بہت زیادہ دھبّے بھی پڑ گئے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اپنے کیبن میں بھیج دیا، جہاں وہ میرے رات کے کپڑے پہن کر بیٹھ گئے اور پھر چند ملّاحوں نے جلدی جلدی ان کے

کپڑے دھو دیے، سوامی نے ان پر استری کر دی اور بچّوں نے کپڑے دوبارہ پہن لئے، مگر اس ذرا سی تکلیف نے مُجھے یہ احساس دلا دیا کہ اگر اتّفاق سے سمندر میں زیادہ دنوں کے لئے رہنا ہو گیا تو پھر میں ان کے لئے کپڑوں کا بندوبست کیسے کروں گا؟ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بلونت بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔

رات معمول کے مطابق کافی ٹھنڈی تھی۔ چاند نکلا ہوا تھا اور اس کی ٹھنڈی چاندنی آسمان کی طرف اچھلتی ہوئی لہروں پر پڑ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہزاروں چاندنی کی مچھلیاں آسمان کی طرف لپک رہی ہیں۔ سمندر میں جوار بھاٹا آ رہا تھا اور اس کی وجہ سے ہمارا اسٹیمر آہستہ آہستہ ڈولنے لگا تھا۔ اسٹیمر میں بجلی بنانے کے جنریٹر بھی تھے اس لئے بجلی کے بلب ہر جگہ لگے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی ہمارے اسٹیمر کو دیکھتا تو اسے ایسا لگتا جیسے کوئی خوبصورت محل تیر رہا ہو! نجمہ اور اختر میرے کیبن میں چُپ چاپ

بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید اب وہ سوچ رہے تھے کہ ان کی ماں کا ان کے بغیر کیا حال ہو رہا ہو گا۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا تو محبّت سے میرا دِل بھر گیا۔ میں ان کے قریب پہنچا اور میں نے نجمہ سے کہا۔

"کیوں نجمہ۔۔۔ کیا دِل گھبرا رہا ہے؟"

"ہاں ابّا جی۔۔۔ مُجھے امّی یاد آرہی ہیں۔ نہ جانے ان کا کیا حال ہو گا؟"

"خیر اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔۔۔ تم فکر مت کرو، کل صُبح تک ہم تمہارے پاپا کو ضرور ڈھونڈ لیں گے اور اس کے بعد بمبئی واپس چلیں گے۔۔۔" میں نے اس کے سر پر محبّت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

جان کو وہ دونوں پاپا کہتے تھے۔ یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے کل صُبح تک ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں ان کی آنکھیں خُوشی سے چمکنے لگیں اور وہ خوش ہو گئے۔ اختر نے مُجھ سے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ابّا جی۔۔۔ ہم ذرا باہر ڈیک پر ہو آئیں۔۔۔ یہاں دِل گھبرا رہا ہے۔۔۔"

"ہاں ہاں جاؤ۔۔۔ ضرور جاؤ۔۔۔"

میں تو اتنا کہہ کر جنوبی سمندروں کا نقشہ دیکھنے لگا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔ نقشہ تو میں سہ پہر سے دیکھتا آ رہا تھا، مگر ابھی تک مُجھے معلوم نہ ہو سکا تھا کہ جان کون سے جزیرے میں ہو سکتا ہے۔ میں نے سوامی کو اپنے پاس بلا کر پوچھا:

"تمہارے خیال میں کہیں ایسا تو نہیں کہ جان اسی ابھرنے اور ڈوبنے والے جزیرے میں پہنچ گئے ہوں جہاں ہم لوگ ایک بار اپنے پچھلے سفر میں گئے تھے۔"

"وہی جزیرہ جہاں ہمیں زہرہ کے لوگ ملے تھے۔۔۔" سوامی نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "اتنے لمبے لمبے، جو بالکل دیو معلوم ہوتے تھے!"

"ہاں۔۔۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو۔۔۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہمیں اب اسی جزیرے کو تلاش کرنا چاہیئے۔۔۔"

"مسٹر جان اپنے پرچے میں یہ اور لکھ دیتے کہ وہ کس چیز کی تلاش میں نکلے تھے تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ اب تو ہم لوگ محض اندھیرے میں تیر مار رہے ہیں۔" میں نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ویسے دیکھئے کل صُبح کیا ہوتا ہے۔ نقشے کے مطابق تو ہم اس سمندر میں آ گئے ہیں جہاں کُچھ غیر آباد جزیرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے ہی کسی جزیرے میں جان ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ابھرنے اور ڈوبنے والا جزیرہ ہی ہو!" سوامی نے نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو سوامی۔۔۔" میں نے ایک آہ بھر کر جواب دیا:

"کون جانے کہ اب جان وہاں زندہ ہوں گے یا مُردہ۔۔۔ ممکن ہے ہمارے پہنچنے پر ہمیں ہڈّیوں کا ایک پنجر ہی ملے!"

میں ابھی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اچانک میرے کیبن کا دروازہ کھلا اور اختر دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ مگر کس حالت میں؟ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا تمام خون نچوڑ لیا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں خوف کی وجہ سے پھٹی ہوئی تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کے چہرے کی دہشت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کوئی بہت ہی خوفناک چیز دیکھی ہے۔ آتے ہی وہ یکایک ایک جگہ رُک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور پورا جسم بیری کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کُچھ بولے مگر معلوم ہوتا تھا کہ بہت زیادہ ڈر کی وجہ سے اس کے بولنے کی طاقت عارضی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں گھبرا گیا اور فوراً اس کی طرف اسے سنبھالنے کے لئے

لپکا۔ سوامی بھی اختر کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتے ہوئے بولا۔

"بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"اختر۔۔۔ کیا ہوا بیٹے، ہوش میں آؤ۔۔۔ کیا بات ہے؟" میں نے اسے فوراً اپنے سینے سے لگا لیا۔ مگر اختر مُجھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ میرا دِل بے چین ہو گیا۔ میرے پیارے بیٹے کی یہ حالت کس طرح ہو گئی۔ کیا ہوا اسے؟ آخر اس نے ایسی کون سی چیز دیکھ لی ہے جس کی دہشت سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے! میں نے اس کی ہتھیلیوں کو سہلایا۔ شفقت اور محبّت کا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اختر کی آنکھیں جو لگاتار ایک ہی سمت دیکھ رہی تھیں، اب اس مقام سے ہٹ کر مُجھے دیکھنے لگیں اور مُجھے دیکھتے ہی وہ ایک زور کی چیخ مار کر میرے سینے سے

بری طرح لپٹ گیا۔

"ابّا جی۔۔۔ ابّا جی، مُجھے بچائیے۔۔۔"

"کیا ہوا۔۔۔ کیا بات ہے؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"ابّا جی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ غائب ہو گیا۔۔۔ میری نظروں کے سامنے غائب ہو گیا۔۔۔" خوف کے مارے اختر پھر بُری طرح لرزنے لگا۔

"کون غائب ہو گیا۔۔۔" میں نے حیرت سے کہا۔ : "اختر کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے کیا چیز دیکھی ہے؟"

"کیا ہوا کیا بات ہے؟" بلونت جو کسی کام سے شاید کیبن کے باہر گیا ہوا تھا۔ اختر کی آوازیں سُن کر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نجمہ تھی۔

"کیا ہوا بھیّا کو۔۔۔" اس نے آتے ہی پوچھا۔ "یہ تو ڈیک پر ایک ایک کمرے کو جھانکتا ہوا پھر رہا تھا۔ ابّا جی۔۔۔ کیا ہوا اسے۔۔۔ اس کا چہرہ تو

بالکل سفید پڑا ہوا ہے!"

"اختر۔۔۔" میں نے تقریباً چلّا کر پوچھا۔ "تم بولتے کیوں نہیں۔ کس کا ذکر کررہے تھے تم۔۔۔؟"

"وہ۔۔۔ وہ غائب ہوگیا۔۔۔" اختر کی آنکھیں اچانک پتھرانے لگیں اور وہ زمین پر گرنے لگا۔ بلونت اور سوامی نے اسے ہاتھوں سے سہارا دیا اور زمین پر لِٹا دیا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔۔۔ میرے خُدا یہ کیا ہو رہا ہے! میرے بچّے کو کیا ہوا۔۔۔ میرا ننّھا سا اختر، میرا بچہ۔۔۔!

"اختر۔۔۔ کیا بات ہے، آنکھیں کھولو۔۔۔ کیا ہوا تمہیں!" بلونت نے بڑی محبّت سے پوچھا۔

اختر کی آنکھیں پھرنے لگی تھیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کے مُونہہ سے بس اتنی آواز اور نکلی۔

"ابّا جی۔۔۔ وہ۔۔۔ غا۔۔۔ ئب۔۔۔"

اوراس کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہم سب کے لئے یہ بات ایک معمّے سے کس طرح کم نہ تھی۔ سوامی اختر کو نجمہ کی مدد سے اٹھا کراس کے بستر پر لِٹانے لگا اور اِدھر میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ اختر اچھّا خاصا تھا مگراب اسے کیا ہوا۔ کس کے بارے میں یہ کہہ رہا ہے کہ وہ غائب ہوگیا۔ یقیناً اس نے کوئی خطرناک چیز دیکھی ہے۔۔۔ مگر وہ چیز آخر ہے کیا۔۔۔؟

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے وائرلیس سیٹ کا بزر بجنے لگا۔ سوامی نے جلدی سے آگے بڑھ کر سوئچ آن کر دیا۔۔۔ سیٹ سے آواز آئی :

ہیلوٹی۔ کے۔ ٹونٹی۔۔۔ٹی۔ کے۔ ٹونٹی۔۔۔

ٹی۔ کے۔ ٹونٹی میرے اسٹیمر کا خُفیہ نام تھا اوراب میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی

مُجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

بلونت یہ آواز سنتے ہی جلدی سے وائرلیس سیٹ کے قریب پہنچ گیا اور ریسیور اپنے کان سے لگا کر بولا:

"یس۔۔۔ اٹ از ٹی۔ کے۔ ٹو نٹی۔ ٹی۔ کے۔ ٹو نٹی۔"

"آفس سے آپ کے لئے پیغام ہے سر۔۔۔ بمبئی آفس سے سر۔۔۔" سیٹ سے آواز آئی۔

یہ سنتے ہی میری جان میں جان آئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید یہ پیغام کسی نامعلوم جہاز کی طرف سے ہے۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ ان دنوں سمندروں میں بحری قزّاقوں کا بہت زور تھا۔ یہ لوگ ڈاکو تھے اور سمندر میں اِدھر اُدھر بھٹکنے والے جہازوں کو گھیر کر انہیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ مردوں اور بوڑھوں کو قتل کر دیتے تھے اور عورتوں کو غُلام بنا کر لے

جاتے تھے۔ بعد میں اِن عورتوں کو ان علاقوں میں بیچ دیتے تھے جہاں
چوری چھپے بُردہ فروشی (عورتوں کی تجارت) ہوتی تھی۔ میرا خیال یہی تھا
اور بمبئی سے چلنے کے بعد مُجھے ہر وقت یہی خطرہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ہمارے
اسٹیمر کی مُڈبھیڑ ان بحری قزّاقوں سے نہ ہو جائے۔ اب یہ معلوم کر کے
مُجھے اطمینان ہوا کہ یہ پیغام میرے بمبئی کے دفتر سے وائرلیس
ڈیپارٹمنٹ نے بھیجا ہے۔

میرے اس اسٹیمر میں، جیسا کہ میں پہلے بھی بتا آیا ہوں، ہر قسم کا آرام تھا
اور نئی ایجادوں میں سے میرے کام آنے والی ہر چیز اس میں موجود تھی۔
یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پانی کے جہازوں میں خبریں بھیجنے اور پہنچانے کا
کام وائرلیس سے ہی لیا جاتا ہے، اس لئے یہ آلہ میرے تمام جہازوں
کے علاوہ میرے خاص اسٹیمر میں بھی لگا ہوا تھا۔ بلونت نے یہ پیغام سن
کر مُجھے دیکھا، گویا کہہ رہا ہو، آپ خود تشریف لے آئیے۔ میں نے آگے

بڑھ کر رسیور کان سے لگا لیا اور بولا :

"یس۔۔۔ کیا بات ہے، میں فیروز بول رہا ہوں۔۔۔"

"سر۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بات یہ ہے۔۔۔" دوسری طرف سے بولنے والا شاید میرے رُعب کی وجہ سے گھبرا گیا۔

"گھبراؤ مت۔۔۔ بولو کیا بات ہے؟"

"سر۔۔۔ کوٹھی سے مالکن آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ آپ فرمائیں تو میں کنکشن ملا دوں؟"

"ملا دو۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

مجھ کو یقین تھا کہ زرینہ بچّوں کی گمشدگی کی اِطّلاع مُجھے پہنچانا چاہتی ہو گی۔ کیوں کہ اس کے علاوہ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ کنکشن ملا دو، مگر پھر اچانک مُجھے خیال آیا کہ اختر کی بے ہوشی

کے بارے میں اس کی ماں سے کیا کہوں۔ اختر ابھی تک بے ہوش تھا،
اور سوامی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ محسوس کر کے میں
نے آپریٹر سے جلدی سے کہا۔

"سنو۔۔۔ ابھی کنکشن ملانے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مالکن سے کہو کہ وہ
فون بند نہ کریں تم کنکشن ملانے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔ اور جب میں
تمہیں حُکم دوں تب لائن ملا دینا۔۔۔ سمجھے؟"

"یس سر۔۔۔ سمجھ گیا۔۔۔"

اتنا کہہ کر میں جلدی سے اختر کی طرف پلٹا۔ نجمہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی رو
رہی تھی۔ میں نے بستر پر بیٹھ کر اختر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے
سہلانے لگا۔ میرے دِل کی عجیب حالت تھی۔ اختر میرا چھوٹا لڑکا تھا۔ اور
میں اس سے بڑی محبّت کرتا تھا۔ مگر اس وقت اس کی حالت ایسی تھی کہ
مُجھے اس کی زندگی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ دِل ہی دِل میں خُدا سے میں

دُعا مانگ رہا تھا کہ وہ اسے فوراً اچھا کر دے۔ شاید خداوند تعالیٰ نے میری دُعا قبول کر لی یا پھر یہ ہم سب کی محنت کا نتیجہ تھا کہ اختر نے آنکھیں کھول دیں اور پھر مُجھے مُسکرا کر دیکھا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور میں نے اس سے پوچھا۔

"کیوں اختر بیٹے کیا بات ہے؟"

بجائے اس کے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، اُلٹا وہ مجھی سے پوچھنے لگا:

"آپ سب میرے بستر کے پاس کیوں بیٹھے ہیں۔ مُجھے کیا ہوا۔۔۔؟"

"تم بے ہوش ہو گئے تھے اختر۔۔۔" نجمہ نے جلدی سے کہا۔ "تم شاید ڈر گئے تھے اور چیخ رہے تھے کہ وہ غائب ہو گیا وہ غائب ہو گیا۔۔۔ کون غائب ہو گیا تھا اختر۔۔۔؟"

شاید زندگی میں اتنا اچنبھا مُجھے کبھی نہیں ہوا جب کہ میں نے اختر کا جواب سنا۔ اس نے کہا۔

”نہیں تو نجمہ آپا۔۔۔ میں نے تو کُچھ نہیں کہا۔ نہ ہی میں کسی سے ڈرا تھا۔۔۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”بابا۔۔۔ باتیں تو تم عجیب کر رہے ہو۔۔۔“ سوامی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تم ڈرے اور سہمے ہوئے اندر آئے اور چلّانے لگے۔ تم کہہ رہے تھے کہ مُجھے بچائیے۔۔۔ وہ غائب ہو گیا اور پھر بے ہوش ہو گئے۔۔۔“

”جہاں تک مُجھے یاد ہے ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔“ اختر نے جواب دیا۔

”مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے ایسی کوئی بات کہی تھی۔۔۔!“

”خیر چھوڑئیے۔“ بلونت نے گُفتگُو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ

وائرلیس پر بمبئی سے بات کیجئے۔ لائن ملی ہوئی ہے۔۔۔"

اچانک کوئی بھولی ہوئی بات مُجھے یاد آگئی اور میں نے وائرلیس سیٹ کے قریب پہنچ کر سوئچ آن کر کے آپریٹر سے کہا :

"ہاں کنکشن ملادو۔۔۔"

آپریٹر نے فوراً حُکم کی تعمیل کی۔ سیٹ کے ریسیور سے زرینہ کی آواز آئی۔ "ہیلو فیروز۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ میں فیروز بول رہا ہوں۔"

"فیروز۔۔۔ یہ میں ہوں زرینہ۔۔۔" میری بیوی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"تم۔۔۔ تم کہاں ہو فیروز؟"

"میں بمبئی سے کافی دور ہوں زرینہ۔۔۔ مگر گھبراؤ مت۔ میں آرام سے ہوں کیا بچّوں کی وجہ سے بہت پریشان ہو۔۔۔؟"

"ہاں ہاں۔۔۔" وہ ایک دم بے چینی سے بولی۔ "تمہیں کیسے معلوم؟ فیروز وہ دونوں گھر سے غائب ہیں!"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "وہ دونوں شریر چُپکے سے میرے اسٹیمر میں بیٹھ گئے تھے اور اب میرے ہی ساتھ ہیں۔ تم فکر مت کرو۔"

"اوہ۔۔۔!" زرینہ نے شاید اطمینان کا سانس لیا۔

"میں ان دونوں کو ریسیور دیتا ہوں وہ تم سے باری باری بات کریں گے۔"

اختر اور نجمہ نے بڑے اشتیاق سے باری باری ریسیور ہاتھ میں لے کر اپنی ماں سے بات کی۔ اپنی دِل چسپ شرارت پر وہ دِل ہی دِل میں خوش بھی تھے اور شرمندہ بھی۔ شاید ان کی ماں نے انہیں ڈانٹا تھا اس لئے ان کے

مُونہہ لٹک گئے اور پھر انہوں نے وائرلیس پر ہی اس سے معافی مانگی۔ ماں بچّوں کی گفتگو کے بعد ریسیور میں نے پھر کان سے لگا لیا اور کہا۔

"ہیلو زرینہ۔۔۔ تُم نے دیکھی اِن دونوں شیطانوں کی حرکت!"

"ہاں فیروز۔۔۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "وہ بہت شریر ہیں۔ مگر دیکھو، تم ان کا بہت خیال رکھنا، اور انہیں جلد سے جلد بھیج دینا۔"

"اچھّا اچھّا۔۔۔ تم بے فکر رہو۔۔۔"

"بلکہ بہتر تو یہ ہو گا کہ کسی بھی جزیرے پر اترنے کے بعد تم ان دونوں کو اسٹیمر سے فوراً واپس بھیج دو۔ اسٹیمر انہیں یہاں پہنچا کر پھر واپس تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔"

"اچھّا۔۔۔ مطمئن رہو ایسا ہی ہو گا۔"

"اور دیکھو سمندر میں دور تک مت جانا۔ جلد واپس آنے کی۔۔۔۔۔"

اچانک عجیب بات ہوئی۔ بولتے بولتے وہ یکایک خاموش ہو گئی۔ میں نے گھبرا کر وائرلیس سیٹ کا بٹن دبا کر آپریٹر سے پوچھا کہ کیا بات ہے، آواز آنی کیوں بند ہو گئی؟ اس سے پہلے کہ مُجھے وہ جواب دیتا، زرینہ کی سہمی ہوئی آواز پھر آئی۔

"فیروز۔۔۔"

"ہاں زرینہ۔۔۔ کیا بات ہے، تم بولتے بولتے خاموش کیوں ہو گئی تھیں۔۔۔؟"

"مجھے کوئی آہٹ سُنائی دی تھی۔۔۔ عجیب سی آہٹ۔۔۔"

"تمہارا وہم ہو گا۔۔۔" میں نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہم نہیں۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔" اور اس کے بعد ایک تیز اور دہشت ناک چیخ!

یہ چیخ سُنتے ہی میں لرز گیا۔۔۔ نہ جانے زرینہ کو کیا ہوا جو اس نے یہ تیز اور دِل ہلا دینے والی چیخ ماری! میں نے بار بار اسے پکارا مگر اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ آپریٹر سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ فون کی لائن تو نہیں کٹی، البتّہ عجیب عجیب سی آوازیں آ رہی ہیں۔ اس نے ایک دو مرتبہ پھر کوشش کی کہ کنکشن مل جائے مگر سب بے کار۔۔۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرا دِل لرزنے لگا۔ مُجھے اپنی بیوی سے بہت محبّت تھی اور اب یہ سوچ کر خوف زدہ تھا کہ نہ جانے اسے کیا ہوا ہے۔۔۔ اس نے کیا چیز دیکھی؟ کیا کوئی چور اُچکا اس کے کمرے میں چوری چھپے آ گیا یا کوئی اور خاص بات ہوئی ہے۔۔۔ مگر پھر خیال آیا کہ گھر میں کافی ملازم ہیں۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان کی موجودگی میں کوئی زرینہ کے کمرے میں آ جائے! میرا دِل بڑا بے چین ہو گیا۔ اختر اور نجمہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مُجھے اور کبھی سوامی کو دیکھ رہے تھے۔ سوامی خود بھی بڑا بے قرار تھا۔ میں نے جب ان

کو سب باتیں بتائیں تو انہیں اور تعجّب ہوا۔ اختر اور نجمہ تو رونے لگے۔ اب میرے لئے یہ دوسری مصیبت کھڑی ہو گئی۔ بچّوں کو سنبھالوں یا اپنے دِل کو؟

سوامی بے چارے نے بچّوں کو سمجھایا اور پھر خود آگے بڑھ کر وائرلیس سیٹ کے بٹنوں کو اُوپر نیچے کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے سیٹ میں خرابی ہو گئی ہو۔ بلونت شاید باہر کے ملّاحوں کو کُچھ ہدایات دینے کے بعد اب اندر آ گیا تھا۔ اس نے کُچھ پوچھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اچانک ریسیور میں سے آواز آئی۔ "”فیروز۔۔۔!“

”کون زرینہ۔۔۔ کیوں کیا بات ہے، تم ٹھیک تو ہو۔ کیا ہوا تھا۔ کیوں ڈر گئی تھیں۔۔۔“ میں نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ کئی سوال پوچھ ڈالے۔

”میں اب تو ٹھیک ہوں فیروز۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر میں نے بڑی ہیبت ناک اور ڈراؤنی چیز دیکھی ہے۔ نہ جانے وہ کون تھا۔۔۔ اپنے آپ ہی وہ ہوا

میں سے اُبھرنا شروع ہوا اور اسی طرح۔۔۔۔۔۔"

وہ شاید پھر خاموش ہوگئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ہاں کہو کہو۔۔۔۔"

"نہ جانے کیا بات ہے فیروز، مُجھے نیند آ رہی ہے۔۔۔ ہاں کیا کہہ رہی تھی میں؟"

"تُم کہہ رہی تھیں کہ کہ تُم نے اپنے کمرے میں کوئی ڈراؤنی چیز دیکھی، جو ہوا میں سے ابھرنی شروع ہوئی اور۔۔۔"

"نہیں تو۔۔۔" زرینہ نے حیرت سے کہا۔ "میں نے تو یہ نہیں کہا تھا۔ تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو فیروز۔۔۔"

"تم نے کُچھ ہی دیر پہلے تو کہا تھا۔ یاد کرو تم نے ایک زور کی چیخ بھی ماری تھی۔۔۔!" میں نے پریشانی سے کہا۔

"چیخ!۔۔۔" وہ ہنسی۔ "کیا کہہ رہے ہو فیروز۔۔۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے چیخ کب ماری تھی، برابر فون پر بات کئے جا رہی ہوں اور میں نے کوئی ڈراؤنی چیز بھی نہیں دیکھی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آج تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ شاید یہ سمندر میں دور تک نکل جانے کا اثر ہے۔ میں کہتی ہوں فوراً واپس آ جاؤ۔" اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

زرینہ کا یہ جواب پا کر میں بے حد پریشان ہو گیا۔ جیسا کہ آپ سب سمجھ گئے ہوں گے۔ زرینہ نے مُجھ سے جھوٹ بولا تھا یا پھر اس کے ساتھ بھی وہی حادثہ پیش آیا تھا جو کُچھ دیر پہلے اختر کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ تقریباً ایک سا ہی واقعہ گذرا تھا۔ اختر نے بھی کوئی خوف ناک چیز دیکھی تھی اور پھر بعد میں مُکر گیا تھا اور یہی حالت زرینہ کی بھی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کون سی پُراسرار طاقت ہے جو میری بیوی اور میرے بچّے کو ڈرا رہی ہے یا پھر اپنے اثر میں لانا چاہتی ہے۔

میرا دِل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا۔ اس سفر کا آغاز جب یہ ہے تو خُدا جانے انجام کیا ہوگا۔۔۔! یہی سوچتا ہوا میں اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر میں نے یہ سب باتیں بلونت اور سوامی کو بھی بتا دیں۔ وہ بھی اچنبھے میں رہ گئے۔ بلونت نے کہا۔

"میرے خیال میں کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے پچھلے سفر کے دُشمن اب آپ سے بدلا لے رہے ہوں!"

"میرے دُشمن تو ختم ہو چکے۔۔۔ کبڑا چیتن اور عبدل یہی میرے دونوں دُشمن تھے۔ ایک تو خزانے کے مُونہہ پر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور دوسرے کو پتھرّ کے دیو (یہ حالات جاننے کے لئے ناول خوفناک جزیرہ ملاحظہ کیجئے) نے اپنے ہاتھوں سے مسل ڈالا۔۔۔ ان دونوں کے علاوہ تو میرا کوئی دُشمن نہیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" سوامی جلدی سے بولا۔ "لیکن سیّارہ زہرہ سے آئے

ہوئے وہ لمبے لوگ!"

"اُن کا میں نے کیا بگاڑا تھا۔ جو انھوں نے کہا تھا میں نے اس پر عمل کیا تھا۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"تو پھر آخر یہ کیا بات پیدا ہو گئی ہے۔" بلونت نے پوچھا۔ "جب آپ سفر پر روانہ ہوئے تب ہی سے یہ باتیں شروع ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے تو سب ٹھیک ٹھاک تھا۔"

"یہی بات تو مُجھے بھی پریشان کر رہی ہے۔" میں نے بے بسی سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "مجھے زرینہ کی طرف سے اب بہت فکر پیدا ہو گئی ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ میں وائرلیس پر ابھی حُکم دے دیتا ہوں کہ آپ کی کوٹھی کی کڑی نگرانی کی جائے، اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو پولیس کی

بھی امداد حاصل کی جائے۔۔۔ ٹھیک ہے!"

بلونت کو میں نے سر کے اشارے سے بتایا کہ ہاں یہ طریقہ درست ہے۔

بلونت ادب سے میرے سامنے جھُک کر باہر چلا گیا۔ سوامی نے دونوں بچّوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ سب بھی کیبن سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اکیلا بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ میری پریشانی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی اور سمجھ میں کُچھ نہیں آتا تھا کہ اب مُجھے کیا کرنا چاہیئے؟

میں اُمّید کرتا ہوں کہ آپ لوگ جو میری اس داستان کو پڑھ رہے ہیں ذرا خود انصاف سے کہیں کہ اس وقت میری حالت کتنی عجیب ہوگی! اس وقت تک کتنی ناقابلِ یقین باتیں پیش آ چکی تھیں۔ جان اور جیک کا کسی ویران جزیرے پر ایڑیاں رگڑنے کا جان لیوا خیال۔ اختر اور زرینہ کا کسی نامعلوم چیز کو دیکھ کر خوفزدہ ہونا اور پھر اب یہ تنہائی کی حالت۔۔۔ نہ کوئی منزل نہ

کوئی رہبر۔ ۔ ۔ دور تک پھیلا ہوا نیلا سمندر۔ ۔ ۔ اس میں اُٹھتی ہوئی اونچی اونچی لہریں۔ گہری اندھیری رات۔ ۔ ۔ میری حالت اس وقت قابلِ رحم تھی۔ نہ جانے میں کب تک یوں ہی سوچتا رہتا اگر نیند کو مُجھ پر رحم نہ آ گیا ہوتا۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے میں سو گیا۔

نیند کی حالت میں انسان خواب تو دیکھتا ہی ہے۔ میں نے بھی عجیب عجیب خواب دیکھے۔ کبھی دیکھا کہ اپنی عالیشان کوٹھی میں آرام کر رہا ہوں۔ کبھی محسوس ہوا کہ ہزاروں بلائیں میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ پھر ایسا نظر آیا کہ اپنے اسٹیمر کے کیبن میں تنہا بیٹھا ہوں کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک سفید سا دھواں اس کے راستے اندر داخل ہوا۔ اس دھوئیں نے آہستہ آہستہ شکل تبدیل کرنی شروع کی اور پھر کُچھ ہی دیر بعد ایک ایسا خوف ناک اور ہیبت ناک انسان اس میں سے نمودار ہوا کہ میرا دِل کانپ اٹھا۔ اس کا قد مشکل سے تین فٹ ہو گا۔ صورت ایسی ڈراؤنی کہ دیکھتے ہی پتہ پانی ہو

جائے۔۔۔ شاید یہ بیداری کا عالم تھا یا خواب۔۔۔ مگر مُجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ اس کا رنگ گہرا سبز تھا۔ لباس اس کے جسم پر کوئی نہ تھا۔ بس ایک کھال سی تھی جو سبز رنگ کی تھی۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے آنکھوں سے شُعلے نکل رہے ہوں۔ اس کے ہاتھ اور پیروں میں صرف دو دو انگلیاں تھیں۔ کان خرگوش کے کان سے بھی لمبے تھے اور سر چپٹا سا تھا۔ اسے دیکھ کر مُجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ اپنی دو انگلیوں سے جب اس نے میری طرف اشارہ کیا تو خوف کے مارے میری گھِگّی بندھ گئی اور میں نے ایک چیخ ماری۔۔۔۔۔۔

شاید اس چیخ کی آواز میرے کانوں نے بھی سُنی تھی۔ یہ وہم نہ تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ڈر کے مارے میرا جسم کپکپا رہا تھا اور شاید پسینہ کی وجہ سے بھیگا ہوا بھی تھا۔ میری چیخ کی وجہ تھی یا کُچھ اور۔۔۔ میں نے دیکھا کہ اختر اور نجمہ بھی ہوشیار ہو کر اپنے بستروں سے نیچے کود پڑے (میرے

خیال میں جب میں سو رہا ہوں گا تو سوامی ان دونوں کو میرے کیبن میں لِٹا گیا ہوگا) مگر یہ میری چیخ کا اثر نہیں تھا۔ یہ تو کُچھ اور ہی بات تھی۔ اور جب میں نے اپنے حواس اکٹھے کیئے تو مُجھے محسوس ہوا کہ اسٹیمر بُری طرح ڈول رہا ہے۔ میرے کیبن میں پڑا ہوا بہت سا سامان اپنے آپ ہی کبھی اس طرف سے اُس طرف اور کبھی اس کونے سے اس کونے تک لڑھکتا جا رہا تھا۔ اچانک شاید کوئی زوردار جھٹکا لگا اور میری آرام کرسی خود بخود اتنے زور سے پھسلی کے کیبن کی دیوار سے جا کر ٹکرائی۔ اس ٹکر سے چوٹ تو مُجھے بھی لگی مگر معمولی سی۔۔۔ فوراً ہی میں کرسی سے کھڑا ہو گیا، مگر کھڑے ہوتے ہی میرا توازن قائم نہ رہ سکا۔ اگر میں دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو بُری طرح گرتا۔ اختر اور نجمہ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے، اور دونوں نے کیبن کے ایک طرف بنا ہوا زینہ پکڑ رکھا تھا۔ مُجھے دیکھتے ہی اختر چیخنے لگا۔ خود میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے؟ مگر جو بات

تبھی وہ فوراً ہی سوامی کے اندر آنے سے ظاہر ہو گئی۔ وہ پانی میں شرابور تھا۔ ادھر اُدھر کے دروازوں اور دیواروں کو پکڑتا، لڑکھڑاتا ہوا وہ اندر داخل ہوا اور چلّا کر کہنے لگا۔

"مالک! بڑا زبردست طوفان ہے۔ اتنا بڑا طوفان میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔۔۔"

"طوفان کب آیا۔۔۔؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ چیخنا یوں پڑا کہ دروازے کے کھلنے کے ساتھ ہی زبردست شور بھی اندر آنے لگا تھا۔

"ابھی کُچھ دیر پہلے۔" سوامی نے بھی چلّا کر جواب دیا۔ "سمندر کی خوف ناک لہریں ہمارے اسٹیمر کے اوپر سے ہو ہو کر جا رہی ہیں مالک۔۔۔ مُجھے تو آثار اچھّے نظر نہیں آتے۔۔۔"

"پھر اب کیا ہو گا۔۔۔؟"

"میں حفاظتی کشتی تیّار کرا رہا ہوں۔ آپ ضروری سامان، ہتھیار وغیرہ لے کر بے بی اور بابا کے ساتھ باہر آ جائیے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اسٹیمر چھوڑنا پڑے۔ طوفان نے اس کی چولیں تک ہلا ڈالی ہیں۔ آپ صرف ضروری سامان لے لیجئے۔ باقی اہم چیزیں میں نے پہلے ہی سے کشتی میں رکھوا دی ہیں۔ آپ جس طرح۔۔۔"

ہوا کا زوردار اور پُرشور ریلا اندر آیا جس کی وجہ سے مُجھے سوامی کی باقی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ ہوا کا یہ ریلا کیبن کی کھڑکی توڑتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ سوامی کی باتیں میں سمجھ چکا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ ایک بہت بڑا خطرہ اپنا بھیانک مُونہہ کھولے ہماری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ مگر اب یہ وقت سوچنے سمجھنے کا نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنا ضروری سامان سمیٹا۔ لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے، کبھی دیواروں اور ساز و سامان سے ٹکراتے ہوئے میں نے یہ سامان پلاسٹک کے تھیلوں میں بھرا۔ نجمہ اور اختر سے کہا

کہ وہ دونوں بھی کپڑے اور جو کُچھ ان کی سمجھ میں آئے اپنے ساتھ لے لیں۔ اختر کی ہمّت کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہاں تو وہ ڈر کے مارے چلّا رہا تھا۔ مگر جیسے ہی اس نے خطرے کو محسوس کیا فوراً ہی اس میں جیسے کسی نے چابی بھر دی۔ اس نے بڑی مُشکل سے لکڑی کے زینے کو چھوڑا اور پھر لڑکھڑاتا ہوا کیبن کے فرش پر چلنے لگا۔ کئی بار وہ گرا بلکہ ایک بار تو بالکل میری ہی طرح کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ شاید اس کے چوٹ بھی لگی، مگر اس نے پروا نہ کی۔ ٹارچ، کپڑے، پھل اور دوسری ایسی ہی چیزیں اس نے جلدی جلدی تھیلوں میں بھریں۔ ایک تھیلا نجمہ کو دیا اور دوسرا خود اٹھایا اور پھر چلّا کر مُجھ سے کُچھ کہا۔ بپھرے ہوئے سمندر کے شور کی وجہ سے اس کی آواز تو مُجھے سُنائی نہیں دی۔ البتّہ ہونٹوں کے ہلنے سے میں نے اتنا سمجھ لیا کہ وہ شاید باہر نکلنے کو کہہ رہا ہے۔

سمندر کی جو لہریں کیبن کے اوپر سے ہو کر گزر رہی تھیں ان کے تھپیڑوں کی

وجہ سے لکڑی کی چھت اور دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اچھّے خاصے بڑے سوراخ ہو گئے تھے تو غَلط نہ ہو گا۔ ان سوراخوں سے پانی بُری طرح اندر گر رہا تھا۔ کیبن کے فرش کی نالیاں پتلی تھیں اس لئے پانی جلدی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ نتیجہ کے طور پر اندر فرش پر ایک حوض بن گیا تھا۔ کیبن کا سامان اب اس حوض میں تیر رہا تھا اور یہ سامان کبھی شمالی دیوار سے جا ٹکراتا اور کبھی جنوبی دیوار سے۔ اس طرح دیواریں بھی ٹوٹ رہی تھیں اور سامان بھی۔ نجمہ کا پاؤں پھسلا تو وہ بھی اس حوض میں ہچکولے کھانے لگی۔ میں نے دوڑ کر اسے پکڑا۔ اپنی چوٹوں کی فکر نہ کرتے ہوئے میں نے دونوں بچّوں کو سنبھالا اور پھر ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسٹیمر کی حالت یہ تھی گویا بس اب پلٹ جائے گا۔ میں الفاظ میں اس وقت کی حالت بیان نہیں کر سکتا مگر اُمّید کرتا ہوں کہ آپ لوگ جو اس داستان کو پڑھنے میں منہمک ہیں

میری اس وقت کی مُصیبت کا اندازہ اچھّی طرح لگا سکتے ہیں۔

جوں توں کر کے ہم تینوں ڈیک پر آئے۔ ملّاح ادھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کانوں پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ یکایک اندھیرا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ بجلی بنانے والے جنریٹر خراب ہو گئے ہیں۔ اس گھُپ اندھیرے میں اب کُچھ نظر نہ آتا تھا۔ بلونت نہ جانے کہاں تھا۔ سوامی بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اندر کیبن میں ایک فائدہ یہ تھا کہ ہوا کم تھی۔ مگر یہاں آ کر محسوس ہوا جیسے ہوا اسی مقام سے پیدا ہو کر پوری دُنیا میں پھیلتی ہے۔ ایسی تیز ہوا کہ معلوم ہوتا تھا بس ہم اب اُڑے اور جب اُڑے! ہوا کے ساتھ طوفانی لہریں گزوں اونچائی سے اسٹیمر کو ہلاتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر جاتیں۔۔۔ میرے خُدا! اب بھی وہ وقت یاد آتا ہے تو دِل کانپ جاتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!

طوفان اور ہواؤں کی تیزی کا حال بیان کر کے میں اپنی اس آپ بیتی کو بلا

وجہ لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ بس یوں سمجھئے کہ طوفان ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا، ملّاح اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور ہم تینوں رسّی کے بنے ہوئے زینے کو پکڑے اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے کہ اچانک سوامی کا ہاتھ میرے کندھے سے چھوا اور پھر اس نے پوری طاقت سے چلّا کر کہا کہ کشتی تیّار ہے، آپ لوگ اس میں جا کر بیٹھ جائیے۔ مُجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ کشتی کس طرف ہے۔ سوامی ہی مُجھے سہارا دے کر آگے آگے چلا۔ میرے پیچھے دونوں بچّے تھے۔ ہم اندھوں کی طرح رستہ ٹٹول ٹٹول کر چل رہے تھے۔ مُجھے تو کُچھ معلوم نہ تھا کہ کدھر چل رہے ہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر مُجھے سوامی کی آواز کان میں سُنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”۔۔۔ رسّے کی سیڑھی نیچے لٹک رہی ہے اور اس کا دوسرا سِرا کشتی کے اندر ہے۔ آپ اس کی مدد سے نیچے اتر جائیے۔ گھبرائیے نہیں، کشتی ڈوبے گی نہیں۔ اس کے ساتھ حفاظتی ڈنڈے لگے ہوئے ہیں۔۔۔“

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ پہلے میں اترا اور پھر میرے بعد نجمہ اور پھر اختر۔ یہ کشتی اس قسم کی تھی کہ پانی اس میں ٹھہرتا نہیں تھا۔ ٹارچ سے روشنی ڈال کر میں نے دیکھ لیا کہ کافی سے زیادہ سامان سوامی نے اس میں رکھ دیا ہے۔ میں نے ایک دوسری آواز سُنی۔ شاید سیڑھی پر سے سوامی نیچے اتر رہا تھا۔ مگر جب میں نے ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی تو معلوم ہوا کہ بلونت ہے۔ میں نے غُصّے سے چلا کر اس سے پوچھا کہ وہ اب تک کہاں تھا؟ شاید اس نے کوئی جواب دیا مگر شور کے باعث مُجھے سُنائی نہ دے سکا۔ ڈیک پر تو طوفان پھر بھی کم محسوس ہو رہا تھا۔ مگر یہاں چھوٹی سی کشتی میں تو میں ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ہمیں جامنیں گھلانے کی ہنڈیا میں بند کر دیا ہے۔ تیز پانی کے تھپیڑے جسم پر چابکوں کی طرح لگتے تھے۔ نجمہ نے اختر کو لپٹا رکھا تھا اور بلونت نے سامان کو قرینے سے لگانا شروع کر دیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ ہم میں سے جب بھی کوئی کھڑا ہوتا تھا فوراً ہی گر پڑتا

تھا۔ طوفانی شور میں یکایک سوامی کی چیختی ہوئی آواز سُنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب وہ دوسری کشتی نیچے اتار رہا ہے۔ مُجھے یہ جان کر خُوشی ہوئی کہ بلا سے اگر اسٹیمر غرق ہو جائے، سب آدمی تو بچ جائیں گے۔ مُجھے یاد آیا کہ میں نے اپنے تھیلے میں دو برساتیاں بھی رکھی تھیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے جلدی سے وہ برساتیاں نکال کر اختر اور نجمہ کی طرف بڑھائیں۔ جب میں برساتیاں ان دونوں کی طرف بڑھا رہا تھا تو ایک زوردار جھٹکا محسوس ہوا۔ میں اچانک گر پڑا اور میرا سر کشتی کے ڈنڈے سے ٹکرایا۔ اس کے بعد مُجھے کُچھ ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا۔۔۔؟

جب مُجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں آرام سے کشتی میں لیٹا ہوں اور میرے برابر نجمہ اور اختر بیٹھے ہیں۔ گیس کا لیمپ جل رہا ہے۔ طوفان اگرچہ کم ہو گیا ہے، مگر پھر بھی بہت زیادہ ہے۔ کشتی بری طرح سے ہچکولے کھا رہی تھی۔ میرا پورا جسم پانی میں بھیگا ہوا تھا، اور ہر جھٹکے کے ساتھ میں کبھی

دائیں طرف مڑ جاتا اور کبھی بائیں طرف۔ بلونت میرے قدموں کی طرف بیٹھا ہوا پانی کی تیز بوچھاڑ سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا اور سوامی۔۔۔ مگر سوامی کہاں تھا؟۔۔۔ یہ خیال آتے ہی میں جلدی سے اٹھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں نے چھوٹی سی کشتی کے ہر کونے کو دیکھا۔ گو ایسا کرتے ہوئے میری آنکھوں میں بڑی تکلیف ہوئی۔ سمندر کا نمکین پانی بوچھاڑ کے ساتھ آنکھوں میں سوئیوں کی طرح لگ رہا تھا۔ مگر میں نے کوشش کر کے ہر سمت غور سے دیکھا۔ سوامی کا اس کشتی میں کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے چلا کر بلونت سے پوچھا۔

"سوامی کہاں ہے۔۔۔؟"

بلونت نے تو کُچھ جواب نہ دیا۔ البتّہ اختر اور نجمہ بُری طرح رونے لگے۔ میں نے ان کی طرف مڑ کر انھیں تسلّی دیتے ہوئے سوامی کی گمشدگی کے بارے میں پھر پوچھا۔ اس پر اختر نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"ابا جی۔۔۔ جس وقت آپ ہمیں برساتیاں دے رہے تھے تو ایک زور دار جھٹکا کشتی میں لگا تھا۔ اور وہ رسّی ٹوٹ گئی تھی جس کے سہارے کشتی اسٹیمر سے بندھی ہوئی تھی۔ ہماری کشتی کو طوفانی لہریں ایک سیکنڈ میں نہ جانے کہاں لے گئیں۔ جب ہم نے غور سے دیکھا تو اسٹیمر کا دور دور پتہ نہیں تھا۔۔۔ اور اور سوامی چاچا اسی اسٹیمر میں تھے۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ پھر زور زور سے رونے لگا۔

ہوش میں آنے کے بعد اس خوف ناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میرا سب سے بڑا مددگار، میرے بچّوں پر جان چھڑکنے والا سوامی اب مُجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ اسٹیمر کے بارے میں مُجھے یقین تھا کہ وہ ضرور ڈوب گیا ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ سوامی بھی اس کے ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں پہنچ گیا ہو گا۔ مُجھے شدّت سے اس کی کمی کا احساس ہونے لگا۔ اپنی بے بسی اور لاچاری کا خیال کرتے ہی میرے آنسو نکل آئے اور پھر یہ آنسو سمندر کے نمکین

پانی کے ساتھ مل کر بہہ گئے۔ لیمپ کی ٹھٹھری اور بھیگی روشنی میں مُجھے نجمہ
اور اختر کے چہرے غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جگہ جگہ ان پر خراشیں نظر آ
رہی تھیں اور دونوں برساتیوں کے اندر سہمے اور سکڑے ہوئے بیٹھے
تھے۔ جن بچّوں کو کبھی مُصیبت اور تکلیف کا سامنا بھی نہ کرنا پڑا تھا۔ وہ
اس وقت بے بسی کے عالم میں خوف زدہ بیٹھے ہوئے تھے!

طوفان تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ کم تو بے شک ہو گیا تھا۔ وہ
اونچی اونچی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی لہریں اب حالانکہ نہیں اٹھ رہی
تھیں۔ مگر ہوا کے تیز جھکڑ برابر جاری تھے۔ اگر سوامی نے کشتی کے ساتھ
حفاظتی ڈنڈے نہیں لگا دیے ہوتے تو شاید میں اس وقت بیٹھا ہوا اپنا یہ
سفر نامہ نہیں لکھ رہا ہوتا۔۔۔!

بچّوں کو اس حالت میں دیکھ کر میرا دِل کُڑھنے لگا۔ اور پھر میں نے ان
دونوں کو باری باری اپنے سینے سے لگایا۔ انہیں تسلّی دی اور ان کی

ڈھارس بندھائی۔ چونکہ اس سے پہلے بھی سمندری سفر کرچکا تھا اور ہر قسم کے خطروں کا عادی ہوچکا تھا۔ اس لئے مُجھے کوئی زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ ہاں اگر تھی تو بس یہ کہ سوامی موجود نہ تھا اور اب منزل کا مُجھے کُچھ علم نہ تھا۔ میں کُچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مُجھے کتنا عرصہ اسی حالت میں سمندر میں اور گزارنا تھا۔۔۔!

شاید صُبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ بچّوں کی آنکھوں سے نیند غائب تھی اور بار بار وہ بوچھاڑ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلونت شروع سے لے کر اب تک کشتی میں جمع ہو جانے والے پانی کو ایک بڑے ٹین کے ڈبّے کی مدد سے باہر نکالنے میں مصروف تھا۔ اپنی واٹر پروف گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"کیوں بلونت۔ تمہارے خیال میں اب ہم کہاں ہیں؟"

"میں کُچھ نہیں کہہ سکتا۔" بلونت نے جواب دیا۔ "ایسی باتوں کا جواب تو

صرف سوامی ہی دے سکتا تھا، مگر افسوس اب وہ اس دُنیا میں نہیں رہا۔۔۔"

"۔۔۔ہاں ٹھیک کہتے ہو۔۔۔" میں نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا۔ "کون جانے کہ ہمارا بھی یہی حشر ہو!"

"ایسا نہ کہیئے۔۔۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ کو ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔۔۔"

"مجھے اپنی فکر نہیں بچّوں کی ہے بلونت۔۔۔ تم نے ایک بار ٹھیک کہا تھا کہ ان دونوں کی وجہ سے ہمیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی۔۔۔ واقعی ان کا خیال مُجھے بے چین کیئے ہوئے ہے۔۔۔"

"نہیں ابّا جی آپ ہماری فکر مت کیجئے، ہم ٹھیک ہیں۔" اختر نے بڑی بہادری کے ساتھ کہا۔ "اگر کوئی کام ہمارے کرنے کا ہو تو بتا ئیے، ہم فوراً

کریں گے۔۔۔"

"نہیں اختر۔۔۔ تُم آرام کرو، ایسا کوئی کام نہیں ہے۔۔۔" بلونت نے جواب دیا۔

کچھ دیر تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ہی سمت میں دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"ذرا دیکھئے گا۔۔۔ کہیں اُدھر سے سورج تو طلوع نہیں ہو رہا۔۔۔؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو واقعی آسمان اور سمندر جس جگہ مل رہے تھے وہاں ہلکی سی سفیدی نظر آرہی تھی۔

"بالکل وہی ہے۔۔۔" بلونت نے خود ہی کہا۔ "لیجئے اس سے ایک فائدہ تو ہوا، اب ہم کم از کم سمت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہم لوگ جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔۔۔"

"سمت کا اندازہ کرنے سے کیا ہوتا ہے بلونت۔۔۔" میں نے چلّا کر

جواب دیا۔ "سمت معلوم کرنے کے آلے اور نقشے تو اسٹیمر ہی میں رہ گئے۔ اب تو ہمیں یہ بھی اُمّید نہیں کہ ہم کسی ساحل سے لگیں گے بھی یا نہیں۔۔۔!"

بلونت خاموش ہو گیا۔ شاید وہ میری باتوں پر غور کر رہا تھا۔ مشرق کی طرف سفیدی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور اب اس سفیدی کے بیچ میں نارنجی رنگ کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔ کُچھ ہی دیر بعد سورج طلوع ہونے والا تھا۔ مگر میری اُمّیدوں کا سورج ڈوب چکا تھا۔ میں نے اختر اور نجمہ کو دیکھا، وہ دونوں بھی بار بار مشرق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ طوفان اب دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا۔ لہریں اب اونچی نہیں اٹھ رہی تھیں۔ ہوا کے تیز جھکڑ بھی بند ہونے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر ذرا ہمّت پیدا ہونے لگی۔ جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں تو ان خطروں کا عادی تھا۔ یہ تکلیفیں برداشت کرنے کی قوّت مُجھ میں پہلے سے موجود تھی۔ رات کو طوفان اور

بھیانک اندھیرے نے مُجھے بے شک سہما دیا تھا۔ مگر جوں جوں دِن نکل رہا تھا، توں توں میرا حوصلہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اختر اور نجمہ بھی اب الگ الگ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

آسمان پر سمندری پرندے منڈلانے لگے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آس پاس ہی کہیں کوئی زمین موجود تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ ہمیں بالکل علم نہ تھا کہ کدھر اور کس طرف ہے؟ اپنا معاملہ اب میں نے خُدا کے سپُرد کر دیا تھا کیوں کہ ایسے وقت اس سے بڑا مددگار کوئی نہیں ہوتا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ قسمت اب جس طرف لے جائے گی، اسی سِمت چلا جاؤں گا۔ جان اور جیک کا خیال سچ بات تو یہ ہے کہ میرے دِل سے عارضی طور سے دور ہو چکا تھا۔ اس وقت تو اپنی پڑی ہوئی تھی۔

کھانے کا سامان ہمارے پاس خاصا تھا اور پینے کا پانی بھی۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہوں گے کہ سمندر کا پانی بہت کھاری ہوتا ہے اور پینے کے

قابل نہیں ہوتا، اس لئے پینے کا پانی لکڑی کے پیپوں میں بھرا ہوا تھا اور کشتی میں دو بڑے پیپے موجود تھے۔ اپنی تکلیفیں اور مُصیبتیں بیان کر کے میں آپ سب کو جو اس داستان کو ذوق و شوق سے پڑھ رہے ہیں افسردگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا اگر میں لکھنے بیٹھوں تو ایسے کئی سو صفحے بھی ناکافی ہوں گے۔ مختصراً اتنا عرض کروں گا کہ شاید ایک یا ڈیڑھ ہفتے تک ہم اس کشتی میں سفر کرتے رہے۔ ہمارے سامنے سورج سمندر میں سے بار بار نکلا اور ڈوبا۔ پانی کا اب صرف ایک پیپہ باقی رہ گیا تھا۔ البتّہ کھانے کے لائق چیزیں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ اختر اور نجمہ بھوکے رہ رہے تھے۔ وہ کوشش کرتے کہ مُجھ پر ظاہر کریں کہ وہ بھوکے نہیں ہیں۔ مگر باپ کی نظروں سے ان کے پژمردہ چہرے کس طرح چھُپ سکتے تھے۔ میں بڑا پریشان تھا، کم زوری آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی اور میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔۔۔؟

آخر ایک وقت ایسا آ گیا جب کہ ہم سب مُردوں کی طرح کشتی میں لیٹ گئے۔ ہم میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہ رہی۔ گِدھ ہمارے اوپر منڈلانے لگے۔ سورج کی تیز کرنوں نے ہمارے جسم جھلسا دیے تھے۔ ہماری کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور کئی مقام پر تو اس میں سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ ایک دِن ہم نے پھر اسی طرح گزارا۔۔۔ رات بھی جوں توں گزر گئی۔۔۔ اس سے اگلا دِن بڑا امتحانی دِن ثابت ہوا۔ کشتی اپنے آپ ہی بہہ رہی تھی، سورج نکل رہا تھا اور ہماری کھالوں میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ بھوک کی وجہ سے محسوس ہوتا تھا کہ بس اب دم نکلا اور اب نکلا۔۔۔!

بچّوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دِل کا خون ہوا جا رہا تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ آواز مُونہہ سے نہیں نکل سکتی تھی، بس میں نے صرف آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور دِل ہی دِل میں دُعا

مانگی۔ خُدا سے گڑگڑا کر التجا کی کہ الٰہی! میرے معصوم بچّوں پر رحم کر۔۔۔ اگر ہمیں اسی طرح مرنا ہے تو ایسی بے کسی کی موت نہ دے۔۔۔ میرے بچّوں کے بدلے میری جان لے لے۔۔۔ اور نہ جانے اس کے علاوہ کیا کیا دعائیں مانگیں۔۔۔ اور پھر دعائیں مانگتے مانگتے ہی کمزوری کے باعث میری گردن ایک طرف ڈھلک گئی، اچانک مُجھے تیز اور کرخت چیخ جیسی آوازیں سُنائی دیں۔ میں نے اوپر دیکھا تو خوں خوار گِدھوں کی ایک ٹولی ہم سب کی طرف اپنے تیز پنجے اور نوکیلی چونچ بڑھائے چلی آ رہی تھی۔ میں نے کراہ کر ایک چیخ ماری اور پھر بے ہوش ہو گیا!

شاید وہ کسی سخت تکلیف کا ہی احساس تھا جس کی وجہ سے مُجھے ہوش آ گیا اور ہوش میں آنے کے بعد مُجھے معلوم ہوا کہ ایک گِدھ میرے سینے پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کی نوکیلی چونچ میں شاید میرے ہی سینے کی بوٹی ہے۔ اس خیال نے کہ گدھ ہم زندہ انسانوں کو نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، مُجھے پھر

سے زندہ کردیا۔ نہ جانے میرے جسم میں اچانک کہاں سے طاقت آگئی!
ہوسکتا ہے کہ اپنی موت کو سینے پر بیٹھے دیکھ کر میں نے بچاؤ کی ایک آخری
کوشش کی ہو۔ بہر حال ہوا یہ کہ میں تھوڑا سا کسمسایا۔ مُجھے ہلتے دیکھ کر وہ
گِدھ ایک چیخ مار کر اُڑ گیا اور اس کی دیکھا دیکھی باقی سب گِدھ بھی اڑ گئے۔
میرے سینے پر جلن ہو رہی تھی اور خون بہہ بہہ کر میرے پورے جسم پر
پھیلتا جا رہا تھا۔ جب اپنی جان بچ گئی تو میں نے دوسروں کی طرف دیکھا
بلونت بھی شاید بے ہوش تھا۔ اس کے شانے پر سے گِدھوں نے
بوٹیاں نوچی تھیں اور میں اب اس کا زخم صاف طور سے دیکھ رہا تھا۔ میں
نے پلٹ کر اختر اور نجمہ کو دیکھا۔ وہ دونوں آدھ مرے سے کشتی میں ایک
دوسرے سے چمٹے ہوئے لیٹے تھے۔ نجمہ کا ہاتھ اس کی آنکھوں پر تھا۔
شاید گِدھوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے ان سے بچنے کے لئے
اپنی آنکھیں ڈھک لی تھیں۔ نجمہ نے چوں کہ اختر کو چمٹا رکھا تھا اس لئے

اختر تو محفوظ تھا البتّہ نجمہ کے اس ہاتھ پر مُجھے ایک سوراخ سا نظر آ رہا تھا۔ شاید گدھ اپنی چونچ سے ہاتھ میں سوراخ ہی کر سکا تھا۔ بوٹی اڑانے کا موقع اسے نہیں مل سکا، کیوں کہ اتنی دیر میں میں ہوش میں آ ہی گیا تھا!

بھوک کی وجہ سے میں اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ہاتھ پاؤں میں معلوم ہوا کہ دم ہی نہیں ہے! آواز میرے حلق سے نکل ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے آخری کوشش کرتے ہوئے نجمہ کو پکارا۔

خُدا کا شکر ہے کہ آواز صاف نکلی اور نجمہ نے سُن لی۔ اس نے آنکھیں کھول کر مُجھے دیکھا اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو میرا ہوا تھا۔ یعنی کمزوری کی وجہ سے وہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکی۔ میرے سینے پر بہتا ہوا خون دیکھ کر بس اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں نے سمجھ لیا کہ بس اب یہ آخری لمحات ہیں۔ نہ ہم لوگ بول سکتے ہیں نہ ہل سکتے ہیں۔ گِدھ اوپر منڈلا رہے ہیں اور

دور دور تک پانی ہی پانی ہے۔

مگر یہ خیال آتے ہی جب میں نے پانی پر نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی کہ کُچھ ہی دور کے فاصلے پر پانی کی بجائے لمبے لمبے درخت نظر آ رہے ہیں۔۔۔! یقیناً یہ کوئی جزیرہ تھا، یہ دیکھ کر مُجھے اور اطمینان ہوا کہ ہماری کشتی خود بخود اسی جزیرے کی طرف جا رہی ہے۔ اگر کسی طرح ہم لوگ زمین تک پہنچ گئے تو پھر ہم بچ سکتے ہیں۔ اس خیال نے مُجھ میں پھر سے زندگی پیدا کر دی۔ مُجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم میں پھر سے طاقت آ گئی ہے۔ جوں توں کر کے میں اٹھا اور بلونت کے قریب پہنچ کر اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے نجمہ کو اس سمت اشارہ کیا تاکہ وہ بھی زمین دیکھ لے۔۔۔ زمین تھی یا کوئی جنّت! نجمہ اسے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل گئی اور اختر کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔

بلونت کو بڑی دیر میں ہوش آیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہلے تو اس نے

ادھر اُدھر دیکھا اور پھر جلدی سے اپنے شانے کو پکڑ لیا۔ گدھوں نے اس کے شانے پر سے شاید کافی گوشت نوچ لیا تھا اس لئے اسے تکلیف زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ خُوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

"بلونت دیکھو۔۔۔ وہ دیکھو، ہم زمین تک آ گئے۔"

ان الفاظ میں پتہ نہیں کیا جادُو تھا کہ بلونت اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا اور مُجھ سے کہنے لگا کہ میں چپّو چلاؤں۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا، مگر جب اس نے دیکھا کہ مُجھ اکیلے سے چپّو نہیں چلتے تو خود بھی دوسرے چپّو لے کر بیٹھ گیا۔ مُجھے اس کی ہمّت کی داد دینی پڑتی ہے کہ زخمی بازو سے بھی اس نے اتنی جلدی جلدی چپّو چلائے کہ کشتی آہستہ آہستہ ساحل سے قریب ہوتی گئی۔ شاید آپ سب ہماری اس وقت کی حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

اگر آپ پر ایسی بپتا پڑے (خُدا نخواستہ) تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ ہم پر وہ

وقت کتنا کٹھن گزرا! جسموں میں طاقت نہ تھی۔ حلق سوکھے ہوئے تھے۔ شورے کے پانی نے گوشت کو انگلیوں پر سے گلا دیا تھا۔ مگر زمین کو سامنے دیکھ کر ہم میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ شاید رستم میں بھی نہ ہو گی!

میں چپّوؤں کو زور زور سے چلا رہا تھا کہ اختر بھی جلدی سے میرے پاس ڈگمگاتا ہوا آ بیٹھا اور اس نے بھی اپنے دونوں ہاتھ چپوؤں پر رکھ کر زور لگانا شروع کر دیا۔ مُجھے اختر کی اس حرکت پر بڑا پیار آیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہماری مستقل جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا آ گیا جب کہ ہماری کشتی ایک نا معلوم زمین کے ساحل سے لگ گئی۔ جیسے ہی کشتی ساحل کے ریت میں پھنسی ہم سب اس میں سے کود پڑے اور پانی میں چھپاکے اڑاتے ہوئے گیلے اور نرم ریت پر جا کر گر گئے اور گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ہمارے چاروں طرف عجیب نسل

کے بندر بیٹھے ہوئے ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم ان کے لئے بہت ہی عجیب و غریب چیز ہوں۔ مُجھے کروٹ لیتے دیکھ کر وہ جلدی سے خوں خوں جیسی آوازیں نکالتے ہوئے دور جا بیٹھے۔ میں نے جب غور سے اس جگہ دیکھا جہاں وہ پہلے بیٹھے ہوئے تھے تو خُوشی کے باعث میرے مُونہہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی کیونکہ دو ٹوٹے ہوئے ناریل وہاں پڑے تھے۔ بندروں کا ایک جوڑا شاید یہ ناریل وہاں بیٹھا ہوا کھا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر وہ ناریل اٹھا لئے اور پھر بُری طرح ان کو نوچ نوچ کر کھانے لگا۔

اچانک مُجھے بچّوں کا خیال آیا۔ بھوک اور مُصیبت میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے! میرے بچّے بھوکے تھے اور میں ناریل انہیں کھلانے کی بجائے پہلے خود کھا رہا تھا!

میں نے اپنے اوپر لعنت بھیجی اور سینے کے بل گھسٹتا ہوا نجمہ کی طرف پہنچا۔

میں نے اسے جگانے اور ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر وہ ہوش میں نہ آئی۔ آخر میں نے ناریل کا تھوڑا سا میٹھا پانی اس کے حلق میں ٹپکا دیا۔ ایسا کرنے سے اسے فوراً ہوش آگیا۔

اپنے سفر کے لباس کے اندر میں ایک شکاری چاقو رکھنے کا عادی ہوں۔ اس وقت بھی وہی چاقو کام میں آیا۔ میں نے جلدی سے ناریل کے کئی ٹکڑے کئے اور پھر نجمہ کو دیے۔ نجمہ نے ناریل کا پانی باری باری اختر اور بلونت کے حلق میں ٹپکایا۔ ان دونوں کو بھی ہوش آگیا۔ مگر اتنے سے ٹکڑوں سے بھلا ہماری بھوک کب مٹتی؟

یہ سوچ کر میں نے بندروں کو اشارہ کیا کہ وہ اور ناریل لائیں۔ مگر بندر انسان تو تھے نہیں کہ میری بات سمجھ جاتے! وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھتے رہے۔ میں نے دوبارہ اشارہ کیا تو ان میں سے ایک غرّا کر میری طرف لپکا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ بندر لمبے لمبے

لنگوروں جیسے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا قد اختر کے برابر تھا۔ نجمہ اور اختر انہیں دیکھ کر خوفزدہ تو ہو گئے تھے مگر ان دونوں میں اتنی طاقت ضرور آ گئی تھی کہ وہ اٹھ سکتے تھے۔ وہ جلدی سے میرے پیچھے ہو گئے۔

جیسا کہ آپ پہلے بھی پڑھ آئے ہیں۔ اختر اور نجمہ دونوں ابھی تک برساتیاں پہنے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ دونوں کھڑے ہو کر میرے پیچھے آئے بندر شاید ان کی برساتیوں سے ڈر کر جلدی سے اُونچے اُونچے ناریل کے درختوں پر چڑھ گئے۔ مُجھے بڑا تعجّب ہوا، برساتی جیسی چیز سے بھلا ڈرنے کی کیا بات!

مگر جانور کس چیز سے ڈرتے ہیں اور کس سے نہیں، یہ بھلا میں کس طرح جان سکتا تھا۔ انہیں درختوں پر چڑھتے دیکھ کر اچانک مُجھے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک کہانی یاد آ گئی، جو ایک سوداگر کی تھی، جس کی ٹوپیاں بندر لے کر درختوں پر چڑھ گئے تھے اور پھر سوداگر کی عقل مندی سے وہ سب ٹوپیاں

اسے واپس مل گئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ لاؤ ایسا کر کے دیکھتا ہوں۔

اپنے شکاری چاقو کو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر میں درخت کی طرف چلا اور ساتھ ہی ایک بڑے سے ناریل کا خول اپنے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ درخت کے نیچے پہنچ کر میں نے وہ خالی ناریل بندروں کو دکھا کر زمین پر دے پٹخا۔ پہلے تو کُچھ نہیں ہوا۔ بندر مُجھے اسی طرح دانت نکال کر دیکھتے رہے لیکن میرے دوبارہ ایسا کرنے پر انہوں نے درخت سے ناریل توڑ توڑ کر میری طرف پھینکنے شروع کر دیے۔ میں نے دِل ہی دِل میں خُدا کا شکر ادا کیا، جس نے وقت پر مُجھے یہ ترکیب سجھائی۔

ہم سب نے آرام سے بیٹھ کر ناریل کھائے اور ان کا پانی پیا اس طرح ہماری بھوک مٹ گئی۔

جب پیٹ بھر گیا تو جسم کے ہر حصّے پر لگی ہوئی چوٹ ہری ہونے لگی۔ ہر ایک کو اپنے اپنے زخم نظر آنے لگے۔ ہم نے پہلے تو آپس میں ایک

دوسرے کی مرہم پٹّی کی (کشتی میں ضرورت کا سب سامان موجود تھا اور یہ سوامی کی عقل مندی کی وجہ سے تھا)۔

اور اس کے بعد بیٹھ کر یہ سوچنے لگے کہ ہم کہاں ہیں، یہ کون سا جزیرہ ہے اور یہ بھی کہ ہمیں بمبئی سے چلے ہوئے کتنے دِن ہو چکے ہیں؟۔۔۔ اس کے بارے میں کہ ہم کہاں ہیں، کسی کو بھی علم نہ تھا۔ جزیرے کی بابت بھی ہم میں سے کوئی بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کون سا جزیرہ تھا۔ ہاں البتّہ سورج کے اترنے اور چڑھنے سے ہم یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ بمبئی سے چلے ہوئے ہمیں ایک ماہ سے بھی کُچھ زیادہ ہی ہو چلا تھا۔۔۔!

اس صورت میں بھلا جان اور جیک کس طرح زندہ رہ سکتے ہیں!

۔۔۔ یہ خیال آتے ہی میرے دِل سے ایک ہُوک سی اُٹھی۔ مُجھے جان کا خیال شدّت سے ستانے لگا۔ اب جب کہ مُجھے اپنے مستقبل کے ہی بارے میں کُچھ معلوم نہ تھا، میں جان کے لئے کیا کر سکتا تھا۔ بھلا ہڈّیوں

کے ایک بے جان پنجر کو ڈھونڈ نکالنے کی جدوجہد، اس سے زیادہ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ اب یہاں اس ویران جزیرے میں آکر میری ہمّت جواب دینے لگی تھی۔ کیوں کہ مُجھے یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے مُجھے اب کیا کرنا چاہیئے؟ بہت دیر تک ہم چاروں اسی حالت میں ریت پر بیٹھے رہے۔ آخراس کے بعد طے پایا کہ کشتی کو کھینچ کر درختوں کے کسی جھنڈ میں اس طرح چھپا دیا جائے کہ کسی دوسرے کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے ہماری یہ احتیاط آگے جا کر بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ ناریل کے درختوں کے قریبی جھنڈ کے نیچے کُچھ جھاڑیاں تھیں۔ ہم نے وہی جگہ کشتی کو چھپانے کے لئے منتخب کی۔ مگر اب مشکل یہ پیش آئی کہ کشتی کو ریت میں گھسیٹ کر وہاں تک کون لے کر جائے۔ حالاں کہ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے وہ جگہ مشکل سے پندرہ گز بھی نہ ہوگی۔ مگر ہماری ہمّتیں چونکہ جواب دے گئی تھیں اس لئے پہلے تو

ہم نا امید ہو گئے۔ آخر میرے اصرار کرنے پر چاروں نے کشتی کا رسّہ پکڑ کر اسے ریت پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ کبھی میں زور لگاتا، کبھی دونوں بچّے۔ گرتے پڑتے بڑی دقّت کے بعد ہم کشتی کو اس جھنڈ تک لے کر آ ہی گئے۔ اس کام میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اسی سے آپ ہماری پریشانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس بات کو بیان کرنے میں تو صرف چند سطریں لگی ہیں لیکن جس مُشکل اور مُصیبت کے بعد یہ کام ہم نے کیا اسے تو کُچھ ہمارا ہی دِل جانتا ہے!

جب یہ کام ہو گیا تو اسی جگہ بیٹھ کر ہم نے کشتی کے سامان کو جانچا اور پھر یہ معلوم کر کے ہمیں بڑا اطمینان ہوا کہ سوائے خوراک اور پانی کے باقی سب سامان ٹھیک حالت میں ہے۔ اس سامان میں بارود، گولیاں، بندوقیں، دوربین، ٹارچیں اور ان کے سیل، مٹّی کا تیل، کوئلہ اور مختصر سا لباس موجود تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لئے فی الحال یہ سامان بہت

ضروری تھا۔ جب اس طرف سے بھی ہمیں اطمینان ہو گیا تو ہم لوگ درختوں کے تنوں سے کمر لگا کر بے خبر سو گئے۔ تھکن اتنی تھی کہ آنکھیں بند کرتے ہی ہمیں تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ شاید ہم تمام دِن سوتے رہے، جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ہمارے عجیب و غریب دوست ہمارے چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہمیں دانت نکالے دیکھ رہے ہیں!

ہمیں اُٹھتے دیکھ کر وہ جلدی سے دور جا بیٹھے۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور پرندے جزیرے کی طرف آ رہے تھے۔ شام ہو جانے پر مُجھے محسوس ہوا کہ اس جزیرے میں ہلکی سی سردی ہے اور یہ معلوم ہو جانے پر مُجھے اختر اور نجمہ کی فکر ہوئی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں برساتیاں اوڑھے ہوئے لیٹے تھے۔ اس جزیرے کی بابت مُجھے کُچھ علم نہ تھا کہ یہاں آبادی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ رات کو کہیں کسی خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑے

سب کو اٹھا دیا۔ اور اس کے بعد میں نے بلونت سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب تمہارا زخم پہلے سے اچھّا ہو گا!"

"جی ہاں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اور نجمہ بیٹی تمہارے ہاتھ کا زخم۔۔۔؟"

"اب زیادہ تکلیف نہیں ہے ابّا جی۔۔۔" نجمہ نے مُسکرا کر جواب دیا۔

ابھی میں کُچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ دھب سے کوئی چیز اختر کے اوپر گری وہ چیخ مار کر ایک دم اچھل پڑا۔ پھر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ بندر کا ایک ننّھا سا بچہ ہے، جس کے ہاتھ میں ایک کیلا بھی ہے اور جو شاید اوپر درخت پر سے گر پڑا تھا۔ نجمہ تو ہنسنے لگی مگر اختر نے قریب جا کر اس بچّے کو اٹھایا، پیار کیا اور پھر کیلا چھیل کر اُسے کھلانے لگا۔

یکایک اوپر سے کوئی چیز پھر زمین پر کودی۔۔۔ یہ وہ بندریا تھی جس کا یہ بچّہ

تھا۔ اختر کے قریب آ کر وہ خاموشی سے بیٹھ کر بچّے کو دیکھنے لگی۔ اختر کو اس نے کُچھ نہیں کہا۔ ایک دو بار بچّے کی جوئیں (جو میرے خیال میں بالکل نہیں تھیں) بھی نکال کر اس نے کھائیں اور پھر اختر کے پاس بچّے کو چھوڑ کر جلدی سے جنگل کے اندر گھُس گئی۔

ہم سب کو بڑا تعجّب ہو رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً اپنا چاقو ہاتھ میں لے لیا تھا کیوں کہ مُجھے ڈر تھا کہ بندریا کہیں اختر کو نقصان نہ پہنچائے۔ اچانک ہی جھاڑیاں ہلیں اور بندریا کسی چیز کو اپنے سینے سے لگائے اختر کی طرف آئی۔ وہ چیز اختر کے پاس پھینک کر اور اپنے بچّے کو کلیجے سے لگا کر وہ پھر درخت پر چڑھ گئی۔ جب ہم نے غور سے اس چیز کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بیس پچیس کیلوں کا ایک گُچھّا ہے۔۔۔ حیرت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک ہم انسان ہیں کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور ایک یہ جانور ہیں جو کسی انسان کا ذرا سا احسان بھی اٹھانا

گوارہ نہیں کرتے اور فوراًاس احسان کا بدلہ چکا دیتے ہیں۔

ہم لوگوں نے کیلیے بڑے مزے لے لے کر کھائے۔ آپس میں باتیں کرنے کے بعد ہمیں یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ کیلوں کے یہ درخت کہیں قریب ہی ہیں، جب ہی بندریا اتنی جلدی کیلیے لے کر آ گئی تھی۔ کھانے کی فکر تو دور ہو گئی۔ سوچ لیا کہ صُبح اٹھ کر وہ درخت تلاش کریں گے۔ اب تو اپنی حفاظت اور رات گزارنے کی فکر تھی!

۔۔۔ رات کو تو آخر کسی طرح گزرنا ہی تھا اس لئے وہ گزر گئی۔ ہم لوگ وہیں کشتی کے پاس سو گئے تھے۔ رات کو خلاف توقع کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سوائے ایک حادثے کے۔۔۔ میں تو اسے حادثہ ہی کہوں گا۔ اور یہ حادثہ رات کو کوئی دو بجے پیش آیا۔ اختر اور نجمہ سو رہے تھے کہ اچانک میری آنکھ ان کے چلّانے سے کھُل گئی۔ دونوں کے چہروں پر خوف چھایا ہوا تھا۔ تقریباً وہی حالت تھی جو کُچھ دِن پہلے اختر کی میرے

اسٹیمر میں ہوئی تھی۔ میرے بار بار پوچھنے پر نجمہ نے اتنا بتایا کہ اس نے ایک بہت ہی خوف ناک سایہ دیکھا ہے۔ یہ سایہ روشن بھی تھا۔ مطلب یہ کہ اس کے چاروں طرف روشنی کا ایک ہالا سا بھی نظر آتا تھا۔ اور اس کی شکل بہت خوف ناک تھی۔ نجمہ نے کہا کہ وہ اس کے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ میں نے ان دونوں کو تسلّی دی اور ان سے سو جانے کے لئے کہا۔ بعد میں میں بھی گزرے ہوئے واقعات پر غور کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح بندروں اور پرندوں کی آوازوں نے ہمیں جگایا۔ بندروں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر پہلے ہی سے درخت کو جھنجھوڑ کر بہت سے ناریل نیچے گرا رکھے تھے۔ ہم سب نے ناریلوں کا پانی پیا اور ان کا گودا کھایا۔ اس کے بعد رات کے بنے ہوئے پروگرام کے مطابق ہم لوگ کیلوں کے درخت اور آس پاس کی کسی آبادی کو ڈھونڈنے کے لئے تیّار ہو گئے۔ ہمارے پاس کمر پر لٹکانے والے سفری تھیلے تھے۔ اور ہم نے

پہلے ہی سے ان تھیلوں میں کافی سے زیادہ سامان رکھ لیا تھا۔ نجمہ کے پاس
چونکہ کپڑے نہیں تھے اس لئے اس نے احتیاطاً برساتی پہن لی تھی۔ میں
سمجھ گیا تھا کہ اس نے برساتی کیوں پہنی ہے! کپڑوں کے پھٹ جانے کے
بعد ظاہر ہے کہ برساتی ہی جسم کو چھپانے کے کام آتی اور نجمہ نے یہی
سوچا ہو گا۔ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں اتنا اور بتا دینا ضروری سمجھتا
ہوں کہ ہمارے ان تھیلوں میں کشتی کا تقریباً سب ہی سامان آ گیا تھا۔ ہم
لوگ اب ہتھیار چاقو اور مُصیبت میں کام آنے والی ہر چیز سے لیس تھے۔
ہمارا سفر اب شروع ہونے والا تھا۔ سمندر کا سفر تو ایک حد تک ختم ہو چکا
تھا۔ اب یہ خشکی کا سفر شروع ہو رہا تھا۔ ہمیں کُچھ معلوم نہ تھا کہ جزیرہ کون
سا ہے، کتنا بڑا ہے، اس میں آبادی بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو لوگ کیسے
ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ کیا جان اور جیک یہاں مل جائیں گے؟

چلنے سے پہلے ہم سب نے مل کر درختوں کے بڑے بڑے پتے توڑ کر کشتی کو ان سے ڈھک دیا۔ ابھی ہم یہ کام کر ہی رہے تھے کہ اچانک درخت پر سے وہی بندریا کا بچّہ کُودا اور اختر کے کندھے پر بیٹھ کر جلدی جلدی اس کے سر کی جوئیں دیکھنے لگا۔ اختر بچّے کی یہ محبّت دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مُجھ سے کہنے لگا کہ وہ بچّے کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلے گا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ کہیں بندریا ناراض نہ ہو جائے مگر اختر نہ مانا اور آخر مجبوراً مُجھے اختر کو اپنے اس نئے دوست کو ساتھ لے چلنے کی اجازت دینی ہی پڑی۔

ہم لوگ اب خُدا کا نام لے کر آگے بڑھے۔ ہم نے میدانی راستے کی نسبت جنگل میں سے گزرنا زیادہ پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میدان میں ہم کسی کی بھی نگاہوں میں آسکتے تھے اور جنگل میں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اونچی نیچی زمین کو پھلانگتے، راستے کے جھاڑ جھنکاڑ تیز چاقوؤں کی

مدد سے صاف کرتے اور خطرے کی بُو سونگھتے ہوئے ہم آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہو گا، اسٹیمر میں نجمہ کو پہننے کے لئے میں نے ایک پتلون دی تھی اور وہ ابھی تک یہی پتلون پہنے ہوئے تھی۔ اگر اس کا لباس یہ نہ ہوتا تو پھر اس کی ٹانگوں کا زخمی ہو جانا یقینی تھا۔ کیوں کہ راستے میں خاردار جھاڑیاں کافی تھیں۔ ان جھاڑیوں کو ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے ہمارے جسموں پر خراشیں بھی آئیں مگر ہم نے کوئی پرواہ نہ کی۔

جلد ہی ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں کیلے کے لاتعداد درخت تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ خود بخود اگے ہیں۔ انہیں زمین میں کسی نے نہیں بویا۔ ان کی بے ترتیبی یہی بتاتی تھی۔ ہم سب نے جلدی جلدی پکے ہوئے کیلے توڑے اور انہیں اپنے تھیلوں میں رکھ لیا۔ بھوک کے وقت سوائے کیلوں کے اب اور کوئی چیز ہمارے کھانے کے لائق نہ تھی۔ کیلوں کی اس زمین پر اور

اس کے قریبی درختوں پر نشان لگانے کے بعد ہم آگے بڑھے۔ یہ نشان ہم نے اس لئے لگائے تھے کہ دوبارہ اگر ہم اس طرف آئیں تو جگہ تلاش کرنے میں کوئی دقّت نہ ہو۔ اختر اور نجمہ نے اپنے اسکاؤٹ ہونے کا یہاں کافی اچھّا ثبوت دیا اور یہ نشان ان دونوں ہی نے لگائے۔

یہ جنگل جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ساحل کے کنارے کنارے نہ جانے کہاں تک چلا گیا تھا۔ درندے تو شاید اس میں بالکل ہی نہ تھے البتّہ پرندوں کا شور بہت زیادہ تھا۔ جوں جوں ہم جنگل کے اندر بڑھتے جاتے تھے یہ شور بھی تیز ہوتا جاتا تھا۔ راستہ اب دشوار گزار ہونے لگا تھا۔ ہم بڑی احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سب سے آگے میں تھا، پھر نجمہ، اور اس کے بعد اختر اور سب سے آخر میں بلونت۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ عنقریب ہی کُچھ نہ کُچھ ہونے والا ہے۔ ہمیں کشتی کے پاس سے چلے ہوئے اب کوئی دو

گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ میں کُچھ نہیں جانتا تھا کہ آگے ہی آگے کیوں چلتا جا رہا تھا اور جیسا کہ آپ آگے دیکھیں گے کہ اس میں بھی خُدا کی مصلحت تھی!

شاید اللہ کو ہماری حالتوں پر رحم آگیا تھا اوراس نے ہمارے دلوں سے نکلی ہوئی خاموش دُعا سُن لی تھی!

جنگل کے بائیں طرف چلتے چلتے اچانک ہمیں سمندر پھر مل گیا۔ ہم یہ تو جانتے ہی تھے کہ سمندر کے کنارے کنارے جنگل میں چل رہے ہیں اور شاید چلتے ہی رہتے اگر میری نگاہ ساحل کی گیلی ریت پر پڑی ہوئی ایک سفید چیز پر نہ پڑتی!

اس چیز کو میں اچھّی طرح جانتا تھا اس لئے دیوانوں کی طرح اس طرف دوڑا اور پھر جلدی سے نیچے جھک کر اسے اٹھالیا۔ یہ ایک سفید ہیٹ تھا اور یقیناً یہ ہیٹ میرے بزرگ جان کا تھا! اس کی تصدیق ہیٹ کے آس پاس

پڑے ہوئے سامان سے بھی ہو گئی۔ ایک پیٹی تھی جو میں نے ایسے سفر میں ہمیشہ جان کو باندھے ہوئے دیکھی تھی۔ سفری جوتے، ایک چھوٹا ایک بڑا، بڑا جوتا لازمی طور پر جیک کا تھا۔ ایک لمبا سا دو دھار والا چاقو جسے میں نے جیک کے پاس بارہا دیکھا تھا۔ جان کا ریوالور بھی قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ مگر وہ دونوں کہیں نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر میرا خُون جوش کھانے لگا۔ میرے پیچھے پیچھے نجمہ، اختر اور بلونت بھی دوڑتے ہوئے آ گئے تھے۔ اور اب وہ تینوں خاموش کھڑے ہوئے میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے تھے۔ خُدا نے مُجھ پر کتنی بڑی مہربانی کی تھی! گزشتہ طوفان نے میری کتنی بڑی مدد کی تھی کہ مُجھے خود بخود اس جزیرے پر پہنچا دیا تھا جہاں مُجھے خود پہنچنا تھا!

جان اور جیک کے سامان کے ملنے سے مُجھے جتنی خُوشی ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اب مُجھے ان دونوں کو تلاش کرنا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ

مُونہہ پر لگا کر زور زور سے ہر سمت آوازیں لگائیں۔ جواب ملا تو ضرور مگر یہ جواب پرندوں نے ایک دم اڑنے کے بعد شور مچا کر دیا تھا۔ آوازیں میں نے پھر لگائیں اور جب کوئی جواب نہ آیا تو بڑی ناامیدی کے ساتھ میں وہیں گیلی ریت پر بیٹھ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بڑے جنگل میں انہیں کہاں اور کیسے تلاش کروں؟ سامان کے مل جانے سے یہ بات تو ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ وہ دونوں زندہ بھی ہیں۔ کون جانے وہ اندر، جنگل میں پڑے ہوں اور صرف ہمیں اب ان کے ڈھانچے ہی ملیں۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ جان نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ ایک ویران جزیرے پر پڑا ہے۔ وہاں پینے کا پانی بھی نہیں ہے اور گِدھ درختوں پر بیٹھے اس کی جان نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ کوئی اور جزیرہ ہو گا! مگر میرے اس خیال کی تردید فوراً ہی میرے دِل نے کر دی۔ پینے کا پانی ابھی

تک تو ہم لوگوں کو بھی نہیں ملا تھا۔ ہم تو صرف ناریلوں کا میٹھا پانی پی پی کر ہی گزارہ کر رہے تھے۔ جس جگہ جان کا سامان پڑا تھا وہاں آس پاس تو ناریل کے درخت بھی نہیں تھے اس لئے جان نے ٹھیک لکھا تھا کہ اس جزیرے میں پینے کا پانی نہیں ہے۔ لہٰذا یہی وہ جزیرہ ہے۔

اس وقت سب مُجھے غور سے تک رہے تھے۔ اختر کا نیا دوست بندر بھی اپنی آنکھیں پھاڑے مُجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے اپنے دِل کی باتیں سب کو بتائیں تو بلونت نے کہا :

"میرے خیال میں کسی جنگلی درندے نے ان دونوں کو ہلاک کر دیا ہے۔"

"نہیں ابّا جی یہ بات غلَط ہے۔" اختر نے کہنا شروع کیا۔ "درندہ اوّل تو جنگل میں کوئی ہے ہی نہیں۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے پاپا اور جیک چچا کو اتنا موقع کیوں دیا کہ وہ دونوں آرام سے اپنے جوتے، پیٹی، ہیٹ، چاقو اور دوسرا سامان اتاریں۔ وہ

چاہتا تو فوراً ہی انہیں ہلاک کر دیتا۔۔۔“

میں نے محبّت بھری نظروں سے اختر کو دیکھا۔۔۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

”اور ابّا جی ایک بات اور ہے۔۔۔“ نجمہ نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لے کر کہا۔ ”اگر آپ غور سے ریت اور پھر اس سے آگے جنگل کی قریبی مٹّی کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ دونوں اپنے پیروں پر چل کر جنگل میں داخل ہوئے ہیں۔ ریت اور مٹّی پر ان کے قدموں کے نشان ہیں۔۔۔!“

نجمہ کی اس ہوشیاری کا بھی کوئی جواب نہ تھا! اس نے بہت اچھّی بات نوٹ کی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو سچ مچ ان دونوں کے قدموں کے نشان جنگل کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ گو یہ نشان اب ایک حد تک بھر گئے تھے، مگر صاف نظر آتا تھا کہ یہ قدموں کے نشان ہیں۔ ان نشانوں کو دیکھتے دیکھتے اچانک میری بھویں تن گئیں۔

میں نے محسوس کیا کہ بقیہ سب بھی حیرت سے زمین کو تک رہے ہیں۔ وہ چیز ہی ایسی تھی جسے دیکھ کر ہمیں بڑا اچنبھا ہوا۔ جان اور جیک کے پیروں کے نشان کے ساتھ ہی کسی تیسری شخصیت کے قدموں کے بھی نشان تھے۔۔۔ مگر کیسے نشان۔۔۔؟

آپ سب تعجّب کریں گے۔ وہ نشان ڈیڑھ فٹ لمبے تھے اور ڈیڑھ فٹ لمبے اس پیر میں صرف دو انگلیاں تھیں اور یہ پیر ہم زمین پر رہنے والے انسانوں میں سے کسی کا ہرگز نہ تھا۔

میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ یہ حقیقت جان لینے کے بعد مُجھے کتنی پریشانی ہوئی ہے۔ آج تک کسی درندے کے پاؤں میں نے انسانوں جیسے نہیں دیکھے۔ دو انگلیوں والے ڈیڑھ فٹ لمبے پیر تو کسی اور ہی جاندار کے ہو سکتے ہیں۔ اور وہ جان دار بھی اس دنیا کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کے انکشاف سے مُجھے کم از کم یہ اطمینان ضرور ہو گیا کہ جان اور جیک زندہ یقیناً

ہوں گے۔ جب کسی تیسری مخلوق کی موجودگی اس جزیرے میں پائی جاتی ہے تو یقیناً خواہ وہ کوئی بھی ہو، اس نے جان اور جیک کو ختم نہیں کیا ہوگا!

بات حالاں کہ غلط تھی مگر میرا دِل یہی گواہی دیتا تھا۔ جان اور جیک کا پتہ چل جانے کے بعد اب میرے دِل کو یہ کرید لگ گئی کہ یہ تیسری مخلوق کون ہے، کہاں ہے اور ان دونوں کو وہ اپنے ساتھ کہاں لے گئی ہے؟

ان باتوں کا جواب میرے دِل نے یہی دیا کہ اب ہمیں جتنی جلد ہو سکے انہیں تلاش کرنا چاہیئے، کیوں کہ بغیر انہیں تلاش کیئے ان باتوں کا مکمل جواب ہمیں نہیں مل سکتا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی جیسے کسی نے میرے تھکے ہوئے بدن میں چابی بھر دی۔ سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے میں ان قدموں کے نشانوں کے سہارے پھر جنگل میں داخل ہوگیا۔ مگر اس سے پہلے میں نے جان اور جیک کے سب سامان کو اٹھا لیا تھا اور اپنے سفری تھیلوں میں بھر لیا تھا۔ مُجھے اُمّید تھی کہ وہ زندہ ہیں اور

جب ملیں گے تو ان کا یہ سامان انہیں دے دوں گا۔

گھنے جنگل میں آنے کے بعد ایک مُشکل یہ پیش آئی کہ قدموں کے نشان اب غائب ہو گئے تھے۔ ریت پر تو وہ صاف دکھائی دیتے تھے، مگر یہاں جنگل میں جھاڑیوں اور کانٹے دار پودوں میں انہیں تلاش کرنا ناممکن تھا۔ نجمہ اور اختر اپنے چاقوؤں کی مدد سے جگہ جگہ نشان لگاتے جا رہے تھے۔ بار بار راستے میں پتھرّ اکٹھے کر کے اسکاوَٹ کے طریقوں سے سمت کا نشان بنا دیتے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے یہی جواب دیا کہ اس طرح واپسی میں راستہ تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔

اختر کا بندر کبھی اُچک کر درختوں پر چڑھ جاتا اور کبھی اختر کے کندھے پر آ بیٹھتا۔ اتنی ہی دیر میں اختر نے اسے اتنا سدھا لیا تھا کہ جب وہ کہتا بندر درخت پر چڑھ جاتا اور جب بلاتا تو واپس آ جاتا۔ ایک بار تو اختر نے اس سے ناریل بھی منگوا لیا تھا۔ میری نگاہ جنگل کی زمین پر ہی لگی ہوئی تھی۔

قدموں کے نشان تو غائب تھے، اس لئے اب میں اندازے سے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

طویل فقروں سے میں اپنی اس داستان کو بلاوجہ لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ مختصراً اتنا ہی کہوں گا کہ اسی طرح چلتے چلتے کافی دیر ہو گئی۔ جنگل کبھی گھنا ہو جاتا اور کبھی چٹیل میدان نظر آ جاتا۔ میدان میں آ کر کئی بار مُجھے قدموں کے نشان پھر نظر آئے اور میری ڈھارس بندھ گئی کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔

ایک بجے کے لگ بھگ ہی میں نے یکایک دو عجیب باتیں نوٹ کیں۔۔۔ جس طرف ہم جا رہے تھے اس طرف سے ایک مدھم سی آواز ہر بیس سیکنڈ کے بعد سُنائی دینے لگی تھی۔ یہ آواز عجیب تھی، میں اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کیسی تھی!

اگر آپ سمجھ سکیں تو یوں سمجھئے کہ وہ کسی گرجا گھر کے بہت بڑے گھنٹے کی گونج جیسی آواز تھی۔ یہ آواز آخر میں کافی دیر تک گونجتی رہتی تھی۔ جب

بھی یہ آواز سُنائی دیتی اس کی ضرب مُجھے اپنے دِل پر پڑتی ہوئی محسوس ہوتی، ایسا لگتا کہ جیسے یہ آواز میرے دِل کو دبا دیتی ہے۔

دوسری عجیب بات یہ تھی کہ اس آواز کو سُن کر اختر کا دوست بندر کُچھ بے قرار سا ہونے لگا تھا۔ جب بھی اسے وہ آواز سُنائی دیتی میری ہی طرح وہ لرز جاتا اور خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ میرے ساتھ ہی شاید اور سب بھی اس آواز سے چوکنے ہو گئے تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جاتے یہ آواز بھی تیز ہوتی جاتی۔ بندر کی حالت سب سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی جا رہی تھی۔ اختر نے اس ڈر سے کہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے اس کے گلے میں رسّی ڈال دی تھی۔ مگر اس کی حالت میں کُچھ کمی واقع نہ ہوئی۔

اختر، نجمہ اور بلونت بھی سوالیہ نظروں سے اب مُجھے دیکھ رہے تھے، مگر میں خاموش تھا۔ حقیقت جانے بغیر میں انہیں ان خاموش سوالوں کا کیا

جواب دیتا؟ گھنٹے کی آواز آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ہم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجہ سا بنا کر دور دور دیکھا مگر نظر کچھ بھی نہ آیا۔ صرف آواز سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ کس جانب سے آ رہی ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے بلونت سے کہا :

"بلونت میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ مگر کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ آواز کیسی ہے ؟"

"میرے خیال میں تو یہ آوازیں کسی گھنٹے کی ہیں۔ اور وہ گھنٹہ بھی بہت بڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آواز بہت دیر تک گونجتی رہتی ہے۔۔۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ مگر۔۔۔"

"ابّا جی ایک بات اور بھی ہے۔" اختر نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "گھنٹے کے بجنے سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس جزیرے میں آبادی ہے۔

اگر کوئی انسان یہاں نہیں ہوتا تو اتنے بڑے گھنٹے کو بجاتا کون؟"

اختر نے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور میں نے کہا۔

"واقعی اختر تم نے بہت کارآمد بات نوٹ کی ہے۔ مگر اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیسے ہیں؟"

"ان کے بارے میں میں بتاتی ہوں۔" نجمہ نے کہا۔ "لوگ میرے خیال میں وحشی ہیں۔ وحشی نہ ہوتے تو گھنٹے کو اتنے زور زور سے نہیں بجاتے۔ یہ میں نے یوں بھی جانا ہے کہ بندروں کا غول میری برساتی سے کافی ڈرتا رہا ہے۔ جہاں تک مُجھے یقین ہے وہ لوگ برساتی جیسے کُچھ کپڑے پہنتے ہیں۔"

"بہت خوب۔ تمہارا یہ اندازہ کافی حد تک درست ہے۔" میں نے جواب

دیا۔

"ایک بات اور ہے ابّا جی۔۔۔" اختر نے چونک کر کہا۔

"وہ کیا۔۔۔؟"

"شاید وہ لوگ جانوروں پر رحم نہیں کرتے، اسی لئے بندر ان سے ڈرتے ہیں۔"

"جو جانوروں پر رحم نہیں کرتا ہو گا ظاہر ہے وہ کافی ظالم ہو گا۔ اس لئے غالباً وہ لوگ ظالم بھی ہوں گے۔"

"ہاں تمہارا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔۔۔" بلونت نے کہا۔

"اچھّا آؤ یہاں بیٹھ کر ہم لوگ اب یہ سوچیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

اتنا کہہ کر میں وہیں ایک درخت کی جڑ پر بیٹھ گیا۔ وہ سب بھی بیٹھ گئے اختر کی پتلون کے پائینچے کافی پھٹ چکے تھے اور یہی حالت ہم سب کے لباسوں

کی بھی تھی۔ میرے اور بلونت کے کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ نجمہ کی برساتی نیچے سے بے شک پھٹ گئی تھی مگر اوپر سے ٹھیک تھی، کافی دیر تک ہم چاروں اپنی اس وقت کی حالت پر غور کرتے رہے۔ آخر بڑی لمبی چوڑی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا چاہیئے۔ مگر اب وہ بات یاد آتی ہے تو میرا قلم لرزنے لگتا ہے!

اوہ خدایا!

۔۔۔ کتنا منحوس وقت تھا وہ جب کہ ہم نے سفر جاری رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔۔۔!

کاش ہمیں معلوم ہو جاتا کہ ہمارے ساتھ اب کیا پیش آنے والا ہے!

سفر پھر شروع ہو گیا۔۔۔ پہلے ہی کی طرح جھاڑیوں سے اُلجھتے، کانٹے والے پودوں سے جسموں کو زخمی کرتے اور اونچی نیچی زمین کو پھلانگتے

ہوئے ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ گھنٹے کی آواز آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وحشی لوگوں کی بستی اب قریب ہی ہے، مگر بستی کا دور دور پتہ نہ تھا۔ تقریباً چار گھنٹے تک ہم لگاتار چلتے گئے۔ شام ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ ہم اس قدر پریشان ہو چکے تھے کہ میں چاہتا تھا جو بھی ہونا ہے بہت جلد ہو جائے۔ اگر وہ لوگ ظالم ہیں تو کیا ہوا، ہم ان کے ظُلم کا خاتمہ کر دیں گے۔ ہمارے پاس بندوقیں اور پستول بھی تھے۔ ان کی موجودگی میں مُجھے ہر خطرہ سے ٹکر لینا آسان نظر آتا تھا۔ خطروں میں کودنے کی عادت بچپن سے پڑی ہوئی تھی۔ شوق رہ رہ کر اُکساتا تھا کہ آخر دیکھوں تو وہ لوگ کون ہیں۔ کس قسم کے ہیں اور یہ گھنٹہ کس لئے بجا رہے ہیں؟

چلتے چلتے دو گھنٹے اور ہو گئے تھے۔ گھنٹے کی آواز اب اتنی تیز تھی کہ اس کی آواز کی لہریں درختوں کی ڈالیوں کو ہلا رہی تھیں۔ بندر بہت پریشان تھا اور

رسّی تڑانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا مگر اختر نے اس کی رسّی اپنی کمر سے باندھ رکھی تھی۔ گھنٹے کی بے حد اونچی آواز سے ہمارے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ میں نے فرسٹ ایڈ کے سامان میں سے روئی نکال کر ہر ایک کو کافی دیر پہلے ہی دے دی تھی اور سب نے یہ روئی اپنے کانوں میں ٹھونس لی تھی مگر اس احتیاط کے باوجود بھی کانوں پر جیسے کوئی ہتھوڑے مار رہا تھا!

چند قدم آگے چلنے کے بعد اچانک میں رُک گیا۔ میرے ساتھ ہی اور سب بھی رُک گئے۔ میری نظریں جھاڑیوں سے کافی دور لگی ہوئی تھیں۔ جو کُچھ میں نے دیکھا، اسے دیکھ کر میں اچنبھے میں رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاف اور چٹیل سا میدان ہے اور اس میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر عجیب قسم کے جھونپڑی نما مکان بنے ہوئے ہیں۔ ایسے مکان میں نے دنیا کے کسی کونے میں بھی نہیں دیکھے تھے! سورج ڈوب رہا تھا

اور ہلکے ہلکے بادلوں کی اوٹ میں تھا، اس لئے یہ عجیب سے مکان اس دُھندلکے میں بہت ہی بھیانک نظر آتے تھے۔ میدان کے ایک طرف یہ مکان تھے۔ اور دوسری طرف صاف میدان۔ اس میدان کے درمیان میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جو کالا ہو رہا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ یہ چبوترہ کس قسم کا ہے؟ اس کے علاوہ یوں لگتا تھا کہ یہاں کوئی انسان نہیں رہتا! کیوں کہ لگاتار دس منٹ تک ادھر دیکھتے رہنے کے باوجود ہمیں کوئی انسان ٹہلتا ہوا نظر نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی بستی ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟ جہاں تک میری یادداشت کام دیتی تھی، دنیا کے نقشے میں ایسا جزیرہ میں نے کہیں نہیں پایا تھا۔۔۔!

گھنٹے کی آواز اب بھی برابر آ رہی تھی اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد لگاتار سُنائی دے رہی تھی۔ میں نے دبے دبے پاؤں رکھتے ہوئے ہر ایک کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر جلد ہی ہم اس جگہ آ گئے جہاں

سے میدان کے دوسرے کونے کو بھی ہم دیکھ سکتے تھے۔ اور اس دوسرے کونے کو دیکھتے ہی میں حیرت زدہ رہ گیا۔

ایک بہت بڑا گھنٹہ۔۔۔ شاید دِلّی کی جامع مسجد کے گُنبد سے بھی بڑا۔۔۔ یہ گھنٹہ نہ جانے کس چیز کے سہارے آسمان میں ٹنگا ہوا تھا؟ میرے خیال میں اس کی اونچائی دو سو فٹ تو ضرور ہوگی اور اسی طرح نیچے سے اس کا گھیر بھی کافی تھا۔ وہ دِل ہلا دینے آواز اسی گھنٹہ میں سے نکل رہی تھی۔

نہ جانے یہ گھنٹہ یہاں کیوں لٹکایا گیا تھا اور اس کی ہیبت ناک آواز سے کسی کا مقصد کیا تھا؟ میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر اپنے ان سوالوں کا جواب نہ پا سکا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نجمہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا میں نے پلٹ کر اسے دیکھا تو نگاہوں سے اس نے گھنٹے کی نچلی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو حیرت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس گھنٹے کے نیچے دو آدمی دائیں بائیں کھڑے ہوئے

تھے۔ ان کے ہاتھوں میں دو لمبے لمبے گرز سے تھے۔ آگے سے یہ گرز موٹے تھے اور پیچھے سے پتلے۔ باری باری وہ دونوں آدمی اس گرز کو گھنٹے پر مارتے تھے اور تب ایک زور دار آواز گھنٹے میں سے نکلتی تھی۔ ان دونوں آدمیوں کا شاید کام ہی یہی تھا۔ کیوں کہ ایک دوسرے سے بات کئے بغیر وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔

اندھیرا اتنا ہو گیا تھا کہ مُجھے ان کی شکلیں نظر نہ آتی تھیں۔ بس دور سے یہ نظر آتا تھا کہ ان کی ڈاڑھیاں کافی بڑھی ہوئی ہیں۔ میں نے پلٹ کر ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھا۔ سورج پر سے بادل کے ٹکڑے اب ہٹ رہے تھے، اس کی آخری سنہری کرنیں گھنٹے پر پڑیں اور گھنٹے کے ساتھ ہی جب ان دونوں آدمیوں کے چہرے روشنی میں آئے تو حیرت کی ایک تیز چیخ میرے مُونہہ سے نکل گئی۔ میں دیوانوں کی طرح اس طرف دوڑا۔۔۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟۔۔۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دونوں آدمی

جان اور جیک کے علاوہ اور کوئی نہ تھے۔۔۔!

گھنٹے کی طرف دوڑنے سے پہلے میں نے اس بات کو بالکل بھی نہیں سوچا کہ میرے اِس طرح میدان میں پہنچ جانے سے ہم سب دُشمنوں کی نظروں میں آسکتے ہیں! یہ تو کوئی ایسا جذبہ تھا جس نے بھلائی اور بُرائی کی تمیز بالکل مٹا دی تھی۔ میرے پیچھے پیچھے اور سب بھی بھاگتے ہوئے آئے۔ جان اور جیک برابر اپنے کام میں مصروف تھے۔ گھنٹے کی آواز اتنی تیز تھی کہ کانوں میں بہت زیادہ روئی ٹھونس لینے کے باوجود بھی میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔

گھنٹے پر ضرب پڑتے ہی آس پاس کی سب چیزیں اس کی گونج سے ہِل جاتی تھیں۔ ہم جان اور جیک کے بالکل پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ حالانکہ ان کی آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں مگر شاید انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ ہم سب نے مل کر انھیں آوازیں دیں، بچّوں نے چلّا چلّا کر پاپا، پاپا پکارا مگر جان

نے یہ آوازیں یا تو سُنی ہی نہیں یا پھر جان بُوجھ کر انجان بن گیا۔ میں نے اور قریب جا کر اِن دونوں کی صورتوں کو غور سے دیکھا۔ اِن کی ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور ناف سے نیچے تک پہنچ رہی تھیں۔ ان کے کانوں سے خُون بہہ رہا تھا۔ میرے خیال میں گھنٹے کی تیز آواز نے اُن کے کانوں کے پردے پھاڑ دیے تھے۔ لباس ان کے جسم پر کوئی نہ تھا۔ وہ ننگے بدن تھے، بس ایک معمولی سا پھٹا ہوا جانگیا پہنے ہوئے تھے۔ جسموں کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان پر لمبی لمبی دھاریاں پڑی ہوئی ہیں اور ان دھاریوں سے خون بہہ رہا ہے۔ یہ یقیناً کوڑے سے لگائے ہوئے زخم تھے!

اُن کی یہ حالت دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری کیا حالت ہوئی ہو گی۔ میں نے پھر چلّا کر آوازیں دیں۔ اختر اور نجمہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخے مگر ان دونوں میں سے کسی نے بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔ مایوسی

کے باعث میں دیوانہ ہو گیا۔ میں نے دوڑ کر وہ لمبا سا گُرز جس سے جان گھنٹے کو بجا رہا تھا اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میری دیکھا دیکھی اختر نے بھی آگے بڑھ کر جیک کے ہاتھوں سے گُرز چھین کر دور پھینک دیا۔ اس کے بعد میں جلدی سے جان سے لپٹ گیا اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"آپ کی یہ کیا حالت ہو گئی ہے۔۔۔ آپ کو کیا ہوا۔ آپ ہمیں پہچانتے کیوں نہیں؟"

مگر جان اب بھی خاموش تھا۔ میں نے پلٹ کر جیک کو دیکھا۔ وہ بھی چُپ تھا۔ البتّہ ایک بات میں نے محسوس کی۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف جھلکنے لگا اور وہ بار بار پلٹ کر ان عجیب سے جھونپڑی نما مکانوں کو دیکھنے لگے۔

"آپ لوگ کیوں سہمے ہوئے ہیں۔ یہ گھنٹہ کس لئے بجا رہے ہیں۔ خُدا کے لئے کُچھ تو جواب دیجئے۔۔۔؟"

میں نے پھر بے قراری سے کہا :

”مجھے دیکھئے، میں فیروز ہوں ۔ یہ اختر اور نجمہ ہیں ۔ ۔ ۔ کُچھ تو بولیے ۔ “

”پاپا ۔ ۔ ۔ پاپا آپ کو کیا ہوا؟ “ اختر نے روتے ہوئے پوچھا ۔

”آپ بولتے کیوں نہیں، جواب کیوں نہیں دیتے؟ “ نجمہ نے جان کے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہا ۔

شاید نجمہ کی ملائم اور میٹھی آواز نے جان کے کانوں میں رس ٹپکایا ۔ اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر پہلے نجمہ کو دیکھا اور پھر باری باری ہم سب کو ۔ مُجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں محبّت کی چمک پیدا ہو گئی اور پھر اس نے لپک کر مُجھے اپنے سینے سے لگا لیا ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، بلونت الگ کھڑا ہوا خاموشی سے ہم سب کو دیکھ رہا تھا اور اختر کے کندھے پر بیٹھا ہوا بندر گھنٹے کے نہ بجنے سے اب مطمئن دکھائی دیتا تھا ۔

"تم نے آخر مُجھے ڈھونڈ ہی لیا فیروز۔ ۔ ۔" جان نے بڑی کمزور آواز میں آہستہ سے کہا۔

"آپ کا پرچہ ملتے ہی میں آپ کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ اتنے دنوں کے بعد آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"مگر اس سے کیا۔ ۔ ۔ میں اب بچ نہیں سکتا۔" جان نے کہا۔

"جاؤ جیک کو سنبھالو، وہ بھی سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

جان کے یہ کہتے ہی مُجھے جیک کا خیال آیا۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے قریب لا کر کہا۔

"جیک۔ ۔ ۔ کیا بات ہے، ہوش میں آؤ، دیکھو ہم تمہاری مدد کے لئے آ گئے۔"

جیک کے ساتھ بھی وہی واقعہ ہوا۔ یعنی مُجھے پہچانتے ہی اس کی آنکھوں

سے بھی آنسو بہنے لگے۔ وہ میرے سینے سے لگ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے اس کے بعد سب کا تعارف کرایا۔۔۔ اور پھر ان دونوں کے جسموں سے رِستا ہوا خُون ہم نے پونچھا۔ ابھی ہم یہ کام کر ہی رہے تھے کہ یکایک جیک خوف کے مارے چلّا اُٹھا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ ہم تمہیں اس خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔۔۔ چلے جاؤ، یہاں سے چلے جاؤ فیروز۔۔۔"

اتنا کہتے ہی وہ دور پڑا ہوا گُرز اٹھانے کے لئے بڑھا۔ مگر میں نے اسے روک لیا۔

"مت روکو فیروز۔۔۔" جان نے بڑی اداسی سے کہا۔

"اِسے گُرز اُٹھا کر گھنٹہ بجانے دو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری جگہ تم کھڑے زندگی بھر تک یہ گھنٹہ بجاتے رہو۔ گھنٹے کی یہ منحوس اور دِل دہلا دینے والی

آواز جکاریوں کی خوراک ہے۔ جکاری اسی آواز کے ساتھ جیتے ہیں اور اسی آواز کو سُن سُن کر اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ جاؤ میرے بچّے! گھنٹہ بجے ہوئے دیر ہو گئی۔۔۔ تم جاؤ، ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔۔۔"

"نہیں میں ایسا ہر گز نہ ہونے دوں گا۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"میں آپ کو اِس مُصیبت سے نجات دلانے آیا ہوں۔ پہلے مُجھے آپ کے زندہ ملنے کی اُمّید نہیں تھی۔ مگر اب جب کہ آپ دونوں مُجھے مل گئے ہیں میں آپ کو پا کر کھونا نہیں چاہتا۔ میرے پاس حفاظت کا کافی سامان موجود ہے۔ آپ دونوں میرے ساتھ چلیئے، آپ کا کوئی کُچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"فیروز جاؤ، بھاگ جاؤ۔ اپنا نہیں تو بچّوں کا خیال کرو۔۔۔ جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ۔۔۔۔۔۔" فقرہ ادھورا چھوڑ کر یکایک اس نے زور کی ایک چیخ ماری اور جھونپڑیوں کی طرف اشارہ کر کے چلایا۔

"وہ۔۔۔وہ، جکاری۔۔۔ دیکھووہ آ گئے، اب ہم سب کی خیر نہیں۔"

میں نے جلدی سے پلٹ کر جھونپڑیوں کی طرف دیکھا، اور پھر جو کُچھ میں نے دیکھا، اس کے باعث خوف کا ایک حملہ میرے دماغ پر ہوا۔ بلونت اور دونوں بچّے جلدی سے سہم کر میرے پیچھے آ گئے۔ میں نے فوراً اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور بلونت سے کہا کہ وہ بھی سامنے آئے اور باقاعدہ مقابلہ کرے۔

مگر جان نے بڑی کمزور آواز میں کہا کہ اب کُچھ نہیں ہو سکتا۔ پستول ان جکاریوں کا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آہستہ آہستہ وہ گھنٹے کے قریب آ رہے تھے۔ اُن کی شکلیں ایسی تھیں جنہیں دیکھتے ہی ڈر کے مارے میرا ہاتھ لرزنے لگا۔ ان کا قد کوئی تین فٹ کا تھا۔ جسم پر گوریلے جیسے لمبے لمبے بال تھے۔ پیٹ نیچے سے آ کر پھول گیا تھا۔ جسم کے ساتھ ٹانگیں مشکل سے ایک فٹ لمبی تھیں، البتّہ پیر ڈیڑھ فٹ لمبے تھے اور اِن پیروں میں دو دو

انگلیاں تھیں۔ اسی لحاظ سے ہاتھ بھی ایسی ہی تھے اور ان میں بھی دو دو انگلیاں تھیں۔ گردن بالکل نہیں تھی اور ان کے کندھوں کے ساتھ ہی گوریلے کے سر سے بھی بڑا ایک سر جڑا ہوا تھا۔

میں اس سر کی کیا تعریف بیان کروں! میرا قلم لرز رہا ہے اور میری پیشانی پر پسینہ نمودار ہونے لگا ہے۔ ایسا خوفناک اور ہیبت انگیز چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس چہرے میں صرف ایک آنکھ تھی اور وہ بھی پیشانی پر۔ ناک کی جگہ ایک سوراخ تھا اور مُونہہ اتنا چوڑا تھا کہ ہاتھی جیسے کانوں کے ساتھ جا کر مل گیا تھا۔ مُونہہ سے باہر دو نوکیلے دانت لٹک رہے تھے۔ ٹانگوں کے ساتھ ہی ان کی ایک موٹی سی دم بھی تھی اور یہ مُجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اس دم کو زمین پر ٹکا کر آسٹریلیا کے کنگرو کی طرح بیٹھنے کا کام لیتے تھے۔

یہ تھے جکاری۔۔۔ خُدا جانے یہ کیا بلا تھی؟ اس جزیرے میں رہنے والی

قوم تھی یا پھر جہنّم سے زمین پر بھیجی گئی کوئی مخلوق۔۔۔ بہر حال جو کُچھ بھی یہ تھے، بہت خوف ناک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہنٹر تھے اور تعداد میں یہ کل دس تھے۔

"ہوشیار ہو جاؤ فیروز۔۔۔ آتے ہی یہ جانور ہنٹروں کی بارش کر دیں گے۔" جان نے چلّا کر کہا۔

"اِن پر گولی مت چلانا۔۔۔ یہ گولی سے نہیں مریں گے۔۔۔ بس خاموش کھڑے رہو۔۔۔" جیک نے جلدی سے کہا۔

جان اور جیک کا کہنا مانتے ہوئے میں نے پستول جیب میں رکھ لیا اور اس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ نجمہ اور اختر کو بھی میں نے ڈھارس دی کہ وہ ڈریں نہیں۔ مگر جکاریوں کی صورتیں اتنی خوفناک تھیں کہ نجمہ کا گلابی رنگ بھی اس وقت سفید پڑا ہوا تھا۔ اختر اپنے بندر کو سنبھالنے میں مصروف تھا کیوں کہ جکاریوں کو دیکھتے ہی اس نے چلّانا

شروع کردیا تھا۔

جکاری قریب آکر اپنی موٹی دُموں کی کرسی بنا کر بیٹھ گئے اور اپنی گول گول سُرخ آنکھوں سے ہمیں اس طرح دیکھنے لگے جیسے کوئی جج اپنی کرسی پر بیٹھ کر ملزموں کو دیکھتا ہے۔ باری باری وہ ہر ایک کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک بات میں نے عجیب نوٹ کی۔ ہر شخص کو دیکھنے بعد وہ کُچھ دیر تک آنکھیں بند رکھتے تھے۔ بعد میں مُجھے جان نے بتایا تھا کہ اس طرح وہ اس آدمی کی شکل اپنے مالک کے ذہن تک پہنچاتے ہیں۔ جب وہ آنکھیں بند کرتے ہیں تو ان کے مالکوں کے ذہنوں میں یہاں کے لوگوں کی شکلیں خود بخود پہنچ جاتی ہیں۔ یہ ایک قسم کا ٹیلی ویژن سسٹم ہے۔

میں یہ جان کر بہت حیران ہوا۔ ہمیں دیکھنے کے بعد جکاریوں نے آہستہ سے اپنی زبان میں ایک دوسرے سے کُچھ کہا۔ اندھیرا زیادہ ہوچکا تھا اس لئے میں یہ تو نہیں دیکھ سکا کہ وہ ایک دوسرے کو کیا اشارہ کر رہے ہیں۔

ہاں بس میں نے انہیں اٹھتے ہوئے دیکھا اور پھر جیسے کوئی طوفان آ گیا۔ شڑا شڑ کی آوازیں آئیں اور مُجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے جسم پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیے ہوں۔ یہ کوڑوں کی مار کا اثر تھا جو ان کم بخت جکاریوں نے اچانک ہم سب پر برسائے تھے۔ ہائے ہو کی آوازوں سے وہ پورا میدان گونج اُٹھا۔ کافی دیر تک ہم سب پر ہنٹر برستے رہے۔ ہم چِلّاتے رہے مگر ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

اچانک مُجھے خیال آیا کہ آخر کب تک اسی طرح پٹتا رہوں گا۔ کیوں نہ آگے بڑھ کر میں ایک دو کو زمین پر لٹا دوں؟ یہ سوچتے ہی میں نے ایک جکاری کو پکڑنے کی کوشش کی۔۔۔ ابھی میری انگلیاں اس کے بالوں سے مس ہوئی ہی تھیں کہ اچانک جیسے ۴۴۰ وولٹ کا ایک جھٹکا مُجھے محسوس ہوا اور میں تڑپ کر نیچے گِر گیا۔ اور شاید گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

جب مُجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک جھونپڑی میں لیٹا ہوا ہوں۔

میرے چاروں طرف میرے ساتھی بیٹھے ہوئے کراہ رہے ہیں، چھت میں ایک عجیب قسم کا لیمپ جل رہا ہے، جس کی روشنی شاید ہماری دنیا کی کسی بھی روشنی جیسی ہرگز نہ تھی۔ جان، جیک اور باقی سب لوگ اسی جگہ موجود ہیں لیکن یہ گھنٹہ اب کون بجا رہا ہے۔ مُجھے اپنے اس سوال کا جواب فوراً ہی نہ ملا۔ کیوں کہ میرے کروٹ لیتے ہی نجمہ لپک کر میرے قریب آئی اور آہستہ سے بولی۔

"ابّا جی۔۔۔ ابّا جی، شکر ہے آپ ہوش میں آ گئے۔"

"ہوشیار ہو جاؤ فیروز۔۔۔ ہم ابھی تک دشمنوں کے نرغے میں ہیں۔" جان نے کہا۔

"دیکھو اب صُبح بھی ہو گئی۔"

"میں کھڑکی کھول دیتی ہوں پاپا۔ شاید باہر کا کُچھ حال معلوم ہو۔"

نجمہ یہ کہتے ہوئے کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ کھڑکی کھولنے کے بعد اس نے باہر کا منظر دیکھ کر مجُھ سے کہا۔

"ارے وہ گھنٹہ تو اب خود دو بجا رہے ہیں۔ مگر تعجّب ہے کہ انہوں نے ہم ہی میں سے دو آدمی کیوں نہیں چُنے؟"

"دیکھوں۔۔۔" اتنا کہہ کر جان جلدی سے کھڑکی کے قریب پہنچا اور باہر دیکھنے کے بعد مجُھ سے کہنے لگا۔

"یہ تو ٹھیک ہے، مگر فیروز مجُھے اب ایک خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ سامنے میدان کے بیچوں بیچ ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ تُم نے دیکھا؟"

"ہاں ہاں۔۔۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"وہ چبوترہ نہ جانے اتنا کالا کیوں ہو رہا ہے۔ میں نے یہاں آتے ہی یہ بات نوٹ کی تھی۔"

"کالا تو اُسے ہونا ہی ہے۔" جان نے بڑی مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"دو جکاری اس وقت اس چبوترے کو صاف کر رہے ہیں۔ اسے دیکھ کر میرے بدترین خدشہ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"مطلب یہی کہ گھنٹہ انہوں نے ہم سے اس لئے نہیں بجوایا کہ آج دوپہر کو وہ اس چبوترے پر ہماری قربانی کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" ایک ساتھ سب چیخے۔

"ہاں یہی بات درست ہے۔" جان نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

"یہاں سے بھاگنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ایک ذریعہ تھا مگر افسوس وہ اب میرے پاس نہیں ہے۔ کاش کسی طرح میرے پاس سوبیا کی تھوڑی سی مقدار ہوتی!"

"سوبیا۔۔۔؟!" میں نے حیرت سے کہا۔

(سوبیا دھات کی پوری کہانی معلوم کرنے کے لئے سراج انور کا گذشتہ ناول 'خوف ناک جزیرہ' پڑھئے)

"وہی حیرت انگیز طاقت ناجس کی تلاش میں زہرہ کے لوگ آئے تھے اور جو ہمیں ہمارے پچھلے سفر میں ملی تھی۔۔۔ مگر اس دھات سے آپ کیا کام لیتے؟"

"اس دھات سے۔۔۔" مری ہوئی آواز میں جان نے کہا۔ "اس دھات سے میں کیا کام لیتا یہ اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہی دھات اس وقت ہم سب کی نجات کا ذریعہ بن سکتی تھی۔"

اچانک مُجھے خیال آیا کہ جان نے اپنے سفر کی داستان مُجھے ابھی تک نہیں سُنائی تھی۔ مُجھے کُچھ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں اور کس طرح اس جزیرے

میں آ پھنسا تھا۔ میرے پاس وہ کیوں آنا چاہتا تھا اور آخر اس پر کون سی اُفتاد پڑی تھی جو اس نے کسی کے ڈر سے یا مجبوراً وہ پرچہ بوتل میں بند کر کے سمندر میں بہا دیا تھا جس کو پا کر میں اس لمبے سفر پر نکلا تھا۔ میں نے جب یہ بات جان کو بتائی تو بڑی اداسی سے ہنسنے کے بعد اس نے کہا۔

"ایسے خطرناک وقت میں بھی تمہاری یہ جستجو کی عادت نہیں گئی۔ ویسے ایک طرح یہ ٹھیک بھی ہے۔ اپنے مرنے کے خیال سے سہمتے رہنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم باتوں میں وقت گزاریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح رہائی کا کوئی طریقہ ہمیں سوجھ جائے۔ اچھّا میں اپنی داستان سناتا ہوں۔ اتنے تم سب مل کر اپنے زخموں پر مرہم لگاؤ اور مُجھے کُچھ کپڑے پہننے کے لئے دو۔ اس جانگیے میں تو مُجھے شرم آتی ہے، جیک کو بھی کپڑے درکار ہوں گے۔ بلونت کے کپڑے شاید اُس کے فٹ آ جائیں گے۔ نجمہ اور اختر کو تم اپنے ساتھ ناحق لائے۔ اختر کی برساتی تو کافی پھٹ

گئی ہے۔ البتہ نجمہ کی ٹھیک ہے۔ شکر ہے کہ ہنٹر ان دونوں کے زیادہ نہیں پڑے۔"

میں نے اِس کے بعد مختصراً اختر اور نجمہ کو ساتھ لانے کا واقعہ اور پھر طوفان کے آنے اور سوامی کے ڈوب جانے کی پوری کہانی اسے سنا دی۔ اس کے ساتھ ہی اختر، نجمہ اور زرینہ کو نظر آنے والے اس خوف ناک سایہ کا بھی ذکر کر دیا جس کے بارے میں آپ پچھلے صفحات میں پڑھ آئے ہیں۔ سایہ کا ذکر سنتے ہی جان اور جیک چونک اٹھے۔

"وہ سایہ تو مُجھے اور جیک کو بھی نظر آ چکا ہے۔" جان نے جلدی سے کہا۔

"اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم سب کو دیدہ و دانستہ ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ خیر اب تو بہتر یہ ہے کہ تم میں سے ایک کھڑکی کے پاس کھڑا رہے اور باقی سب میری کہانی سنیں کہ آخر کیوں اتنے لمبے عرصے کے بعد میں دوبارہ اس بحری سفر پر آمادہ ہوا۔۔۔؟"

کتنا عجیب وقت تھا!

یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت کی تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے۔ ہم سب جان کی اس کہانی کو بڑے اشتیاق کے ساتھ سننے کے آرزو مند تھے، جس کی بدولت آج ہم اس مُصیبت میں گرفتار ہوئے تھے! جیک خاموشی کے ساتھ نجمہ کے پاس ہی اس جھونپڑی کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں، بلونت، اختر اور اختر کا بندر جان کی کہانی سُننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

جان کی عجیب کہانی

جان نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا :

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے فیروز کہ تُم سے جدا ہونے کے بعد میں نے امریکہ میں اندھے بچّوں کے اسکول کو چلانا شروع کر دیا تھا۔ پچھلے سفر میں حاصل کی ہوئی خوف ناک مکھّی کی آنکھوں سے میں نے بہت سے اندھے بچّوں کی آنکھوں کو روشنی دی۔ میں بڑے آرام سے اپنی زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک ایک رات کو ٹھیک بارہ بجے میرے مکان کی چھت کو کسی نے کھٹکھٹایا۔

شاید تم چھت کو کھٹکھٹانے والی بات سُن کر حیرت میں پڑ گئے ہو، مگر تمہاری حیرت ابھی دور ہو جائے گی۔ تم غور سے سُنتے رہو۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرا مکان نیویارک شہر سے کافی دُور

سنسان سے علاقے میں ہے۔ میرے چاروں طرف کھیت ہی کھیت ہیں اور رات کو تو ہر طرف ہُو کا عالم طاری رہتا ہے۔ مکان کی چھت کو ہلتے دیکھ کر مُجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ میں سمجھا کہ شاید زلزلہ آ گیا ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور غور سے پھر چھت کو دیکھنے لگا۔ چھت پھر ہلی اور ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے کوئی دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے۔ میں ابھی بستر سے اتر کر نیچے بھی نہیں آنے پایا تھا کہ میرے تمام نوکر بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں آ پہنچے۔ ان کے چہروں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ سانس پھولے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے کوئی بہت ہی ڈراؤنی چیز دیکھی ہو۔

میں نے ان سے پوچھا بھی کہ آخر کیا بات ہے وہ سب اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟ مگر ان کے دِل اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ وہ جواب ہی نہ دے سکے۔ مجبوراً میں نے سوچا کہ لاؤ میں خود ہی باہر جا کر دیکھتا ہوں، ابھی میں نے چند قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ یکایک ایک عجیب لرزتی ہوئی

آواز، بالکل ویسی جیسی ہم نے ڈوبتے ابھرتے جزیرے میں سیّارہ زہرہ
کے لوگوں کی سُنی تھی، سُنائی دی۔

کوئی لرزتی اور کپکپاتی آواز میں کہہ رہا تھا:

"مسٹر جان! آپ براہ کرم ذرا باہر آئیے، میں آپ سے کُچھ گفتگو کرنا چاہتا
ہوں۔۔۔"

یہ آواز اتنی تیز اور اتنی عجیب تھی کہ میں چونک گیا۔ مُجھے خیال تھا کہ شاید یہ
آواز میں نے پہلے بھی کہیں سُنی ہے۔

مگر کہاں؟ یہ مُجھے اس وقت یاد نہیں آیا۔ انگریزی جس انداز سے بولی گئی
تھی اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ بولنے والا انگریزی نہیں جانتا، یہی وجہ
ہے کہ وہ عجیب سے لہجے میں بول رہا ہے۔

خیر یہ آواز سُن کر میں نے سرہانے سے اپنا پستول اٹھا لیا اور نوکروں کے

ساتھ اپنے گھر سے باہر نکل آیا۔ لیکن باہر دروازے پر مُجھے کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ جب میں نے غور سے میدان میں دیکھا تو مُجھے دو کالے کالے سے ستون کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں تعجّب سے ان ستونوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اچانک جب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو یہ دیکھ کر میرے تعجّب کی کوئی حد نہ رہی کہ جنھیں میں ستون سمجھ رہا تھا وہ دراصل کسی کی ٹانگیں ہیں۔ کسی بہت ہی لمبے دیو نما انسان کی ٹانگیں!

میں نے آہستہ آہستہ ان ٹانگوں کے سہارے نظر اوپر اٹھائی تو حیرت کی ایک چیخ میرے مُونھہ سے نکل گئی۔ کیوں کہ میرے سامنے اس وقت وہی دیوزاد کھڑا ہوا تھا۔

(دیوزاد کے پورے حالات جاننے کے لئے سراج انور کا ناول "خوف ناک جزیرہ" مُلاحظہ کیجئے)

جسے میں اپنے پہلے سفر میں دیکھ چکا تھا اور جس کے بچّوں نے ہم سب کو کھلونا سمجھ کر کھیلا تھا۔ اس کی اونچائی اتنی تھی کہ اگر میرے سر پر پگڑی ہوتی تو اسے دیکھتے ہوئے ضرور گِر جاتی۔ مُجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ ایک خاص انداز سے جھُکا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر مُجھے گویا سلام کیا۔ میں نے بھی اسے اس کا جواب دیا۔ اس کے بعد وہ بولا:

"آپ اپنے نوکروں کو بھیج دیں۔ میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں آپ سے چند منٹ کُچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میری اور آپ کی ملاقات کا حال آپ کے نوکروں کے ذریعے باہر نہ پہنچے۔"

میں نے یہ سُن کر نوکروں کو اشارہ کیا کہ وہ چلے جائیں۔ نوکر جب لرزتے کانپتے واپس چلے گئے تو وہ آہستہ سے زمین پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد بھی وہ مُجھ سے اتنا اونچا تھا کہ میں بدستور اپنی گردن اُٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس

وقت میں اس کے سامنے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی ہاتھی کے سامنے چیونٹی!

آخر رات کا وقت، ہر طرف سنّاٹا اور چاروں طرف چھایا ہوا گھرا اندھیرا۔۔۔ اس اندھیرے میں ہم دونوں کُچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ میرا دِل دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے سیّارہ زہرا کا یہ باشندہ مُجھ سے اب کیا کہنا چاہتا ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی بھاری اور لرزتی آواز آئی۔

"میں بہت آہستہ بولوں گا مگر پھر بھی آپ کو میری آواز تیز معلوم ہو گی۔ میں یہ جانتا ہوں۔ مگر کیا کروں میں مجبور ہوں۔ اس سے آہستہ میں بول نہیں سکتا۔ خیر اب میں اصل مطلب کی طرف آتا ہوں۔۔۔ کیا آپ سُننے کے لئے تیّار ہیں۔"

"جی ہاں بالکل۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ مُجھے اپنا دوست سمجھیں، بلکہ آج سے ہماری اور آپ کی دوستی پکّی ہے۔۔۔ آپ کا نام مُجھے معلوم ہے۔ آپ کو مسٹر جان ولیم کہتے ہیں اور میرا نام شاگو ہے۔۔۔ اُمّید ہے کہ آپ کو یاد رہے گا۔"

"میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں، مسٹر شاگو۔۔۔" میں نے اخلاقاً کہا۔

"ہمارے ہاں ایسے موقع پر مصافحہ کی رسم ہے مگر میں جانتا ہوں کہ میں آپ سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔ میرا ہاتھ چھوٹا ہے اور آپ کا بہت بڑا۔۔۔ میرا ہاتھ تو پِس کر رہ جائے گا۔۔۔"

"شکریہ!" اس نے ہنس کر جواب دیا۔ "اب آپ میری باتیں سُننے کے لئے تیّار ہو جائیے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مُجھے ابھی واپس جانا ہے۔"

"ہاں سُنائیے، میں سُننے کے لئے بے قرار ہوں۔۔۔" میں نے اور زور سے چلّا کر کہا۔

"سیّارہ زہرہ میں میرا کام سائنس کے مختلف شُعبوں کی نگرانی کرنا ہے۔ ایک طرح سے آپ مُجھے سائنس کے ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ سمجھ لیجئے۔ سوبیا دھات دراصل میری ہی تحقیق ہے۔ اتّفاق سے ایک بار ہمارا راکٹ زمین پر سے گُزرتے وقت خراب ہوگیا تھا۔ ہم نے اسے نہایت حفاظت کے ساتھ اس جزیرے میں اُتارا جہاں آپ سب پہنچ گئے تھے، اور جہاں میرے بچّوں نے آپ کو بہت پریشان کیا تھا۔ وہیں میں نے یہ دھات دریافت کی تھی۔ ہم زہرہ والوں کے لئے یہ دھات بہت قیمتی ہے۔ آپ یوں سمجھئے کہ یہ ہماری زندگی ہے۔ ہمارے کارخانے موٹریں، روبوٹ، راکٹ وغیرہ سب اسی دھات کی بدولت چلتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ جیسی آپ کی ایٹمی طاقت ویسی ہی ہمارے لئے یہ سوبیا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔۔۔ آگے کہئے۔"

"ہم اسے پانی میں ڈبو کر رکھتے ہیں اور اس طرح اس میں اور طاقت پیدا ہو

جاتی ہے۔ خیر تو اب یہ ہوا کہ اس دھات کا نمونہ زہرہ لے گیا اور وہاں پہنچنے پر اس پر تجربے کئے گئے۔ ہم لوگوں نے اس کا مرکز ڈوبنے اور ابھرنے والا جزیرہ بنا لیا۔ سوبیا کا سب سے بڑا ذخیرہ وہیں تھا۔ جس طرح آپ کی دنیا میں اچھّے اور بُرے دونوں طرح کے لوگ ملتے ہیں، ہمارے ہاں بھی بُرے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے۔

ہمارے ملک کا ایک سائنس داں جس کا نام 'جی گا' ہے، اسے اس دھات کا پتہ چل گیا۔ اس نے اسے اچھّے مقصد کے لئے استعمال کرنے کی بجائے بُرے مقصد کے لئے استعمال کرنے کی سوچی۔ ایک حد تک وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ جب اس کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئیں تو ہم سب نے مل کر اسے زہرہ سے نکال دیا اور ایک خود بخود چلنے والے راکٹ میں بِٹھا کر اُسے سزا کے طور پر خلا میں چھوڑ دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اتّفاق سے پہنچا بھی وہیں جہاں سوبیا کا سب سے بڑا ذخیرہ

موجود ہے۔ یعنی آپ کی دُنیا میں۔۔۔ یہاں آ کر اس نے ڈوبنے اور ابھرنے والے جزیرے پر قبضہ کرلیا اور یہیں اس نے اپنی زمین دوز دنیا بنا لی ہے۔

اس زمین دوز دُنیا کو آپ کالی دُنیا بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ وہ آپ کی زمین کی سطح سے کئی سو فٹ نیچے ہے۔ میں یہ تو نہیں جان سکتا کہ وہاں رہ کر وہ کیا کر رہا ہے؟ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کے ارادے خطرناک ہیں۔۔۔ اس نے یہاں رہ کر کچھ راکٹ بنائے اور پھر چوری چھُپے زہرہ میں واپس پہنچا۔ اس نے وہاں سے جکاری قوم کو اپنے ساتھ ملالیا۔ ایک آنکھ والے یہ جکاری بہت خطرناک ہیں۔ دراصل وہ جانور ہیں، مگر انسانوں کی سی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ان میں ایک صِفت یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کے بعد وہ اس آدمی کی شکل ہزاروں میل دور اپنے مالک یعنی 'جی گا' کے دماغ کو بھیج سکتے ہیں۔

جی گا میں بھی کئی خوبیاں ہیں۔ وہ سائنس کے بل بوتے پر اپنی شکل بھی
تبدیل کر سکتا ہے۔ چاہے تو ہوا میں مل سکتا ہے اور چاہے تو پانی بن سکتا
ہے۔ جکاریوں کے ساتھ ہی جی گا نے زہرہ کے کُچھ چھوٹے لوگ بھی
اکٹھے کر کے یہاں بھیج دیے تھے۔ اس قوم کو 'زوک' کہا جاتا ہے۔ یہ سب
جی گا کے غُلام ہیں۔ جو وہ چاہتا ہے وہ کرتے ہیں۔۔۔ خیر جو بات اب
میں کہنا چاہتا ہوں اسے غور سے سُنئیے۔

سیّارہ زہرہ کے ڈکٹیٹر کے پاس جب یہ معاملہ پہنچا تو میں بھی وہاں موجود
تھا۔ بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوئیں اور آخر طے یہ پایا کہ سوبیا دھات کے
ذخیرے کو یا تو ختم کر دیا جائے یا پھر زہرہ میں لے آیا جائے۔ مگر زہرہ
میں لے جانے کا سوال یوں پیدا نہیں ہوتا کہ وہاں پانی نہیں ہے۔ ہم سب
زہرہ کی ہوا کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ پانی کے بغیر سوبیا ہمارے کسی کام کی
نہیں ہے۔ میں نے اس بات کی مخالفت کی اور پھر یہ ذمّہ لیا کہ آپ کی مدد

سے جی گا کو یا سوبیا کو ختم کر دوں گا۔۔۔ آپ ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں کیوں کہ دنیا میں آپ ہی ایک ایسے آدمی ہیں جس پر میں بھروسہ کر سکتا ہوں۔۔۔"

"فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے مُسکرا کر پوچھا۔

"روپے پیسے کی آپ فکر مت کیجیۓ۔ کئی سوٹن سونا میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک لمبا سفر کریں، اپنے مددگار اپنے ساتھ لے جائیں اور جی گا کو یا سوبیا کو ختم کر دیں۔ آپ کی مدد کے لئے میں سوبیا کی تھوڑی سی مقدار اِس ڈبّے میں لے کر آیا ہوں۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا ڈبّہ اپنے کان میں سے نکال کر مُجھے دیا اور پھر بولا۔

"سوبیا آپ کے لئے خطرناک نہیں ہے، البتّہ جکاریوں اور زوکوں کے

لئے بہت خطرناک ہے۔ سوبیا کی نہ دِکھائی دینے والی کرنیں اُن کے لئے موت کا پیغام ہیں۔ سوبیا اگر تھوڑی سی دور رکھ دی جائے تو جکاری اس کے قریب نہیں آسکتے اسی طرح زوک بھی۔ سوبیا اگر بہت قریب رکھ دی جائے تو جکاری آپ سے آپ مرجائیں گے۔ رہے زہرہ کے دوسرے چھوٹے لوگ، وہ مریں گے تو نہیں البتّہ کمزور ہوجائیں گے۔ ممکن ہے کہ آپ پوچھیں کہ آخر میں خود ہی کیوں یہ کام نہیں کرسکتا جب کہ میں آپ سے کافی بڑا اور طاقتور ہوں۔۔۔"

"جی ہاں میں یہی سوال آپ سے کرنے والا تھا۔۔۔" میں نے کہا۔

"اس کا جواب یہ ہے کہ جی گا جس جگہ موجود ہے وہاں تک پہنچنے کے لئے مُجھے اس علاقے کو ہی نہیں بلکہ آپ کی پوری دُنیا کو ختم کرنا پڑے گا۔ جسے آپ کبھی منظور نہیں کریں گے۔۔۔ یا کرلیں گے؟"

"ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔۔۔" میں اچانک کانپ گیا۔

"بس تو اب آپ معاملے کو پوری طرح سمجھ گئے ہیں۔ میں آپ سے اِلتجا کروں گا کہ آپ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور پیشتر اس کے کہ جی گا کوئی خطرناک قدم اُٹھائے آپ خود اُسے تباہ کر دیں۔۔۔ معاوضہ کے طور پر آپ کے مکان کو سونے کا بنا کر ہیرے جواہرات سے بھر دیا جائے گا۔ کیوں کہ ان پتھروں کی ہمارے ہاں کوئی وقعت نہیں۔۔۔ اب فرمائیے آپ اس کام کا بیڑا اٹھانے کو تیّار ہیں؟"

بات بہت سنجیدہ اور خطرناک تھی۔ کُچھ دیر تک میں خاموش رہا۔ میں نے دِل میں سوچا کہ اگر میں اس کام کو نہ کروں گا تو شاگو خود کرے گا۔ اس طرح یقیناً ہماری دُنیا تباہ ہو جائے گی۔ اس لئے فیروز میں نے یہی سوچا کہ اس کا کہنا مان لوں۔ یہ کام میں نے کسی لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی حسین دُنیا کو بچانے کے لئے کیا ہے۔ جیک سے مشورہ کرنے کے بعد آخر میں اس لمبے سفر پر نکلنے کے لئے تیّار ہو گیا۔ تمھیں میں نے کئی خط ڈالے مگر مجھے

ایک کا بھی جواب نہ ملا۔ تم نے جواب کیوں نہیں دیا تھا؟

"مجھے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔۔۔ سوائے بوتل والے خط کے۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر یقیناً یہ جی گا یا اس کے آدمیوں کا کام ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اتنے خطوں میں سے ایک بھی تمہیں نہ ملے۔ رہی تمہاری وہ بات کہ تمہیں، بچّوں کو اور تمہاری بیوی کو وہ عجیب و غریب سایہ نظر آیا تھا تو مُجھے یقین ہے کہ وہ بھی جی گا ہی کا ہو گا۔ کیوں کہ یہ تم نے سُن ہی لیا ہے کہ جی گا شکل بدلنے میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہمارے ارادوں کو بھانپ گیا ہے اور ہم سب کو اس جزیرے میں جمع کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ ہمیں اپنے راستے سے صاف کر دے۔۔۔ مگر افسوس میں اس کا کُچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کاش سوبیا اس وقت میرے پاس ہوتی!"

"مگر پاپا آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ اس جزیرے پر کس طرح پہنچے۔۔۔؟" اختر نے فوراً پوچھا۔

"ہاں بھئی وہ تو میں بھول ہی گیا۔۔۔میں تمہیں بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ سوبیا کو ساتھ لے کر میں ہوائی جہاز میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ ہوا میں سوبیا دھات کو پانی میں ڈبونے کا کوئی طریقہ نہیں تھا جب کہ پانی کے جہاز میں سفر کرنے سے یہ کام آسان ہو جاتا تھا۔ اسی لئے میں نے سمندری سفر کیا۔ تمام راستے سوبیا سمندر کے پانی میں ڈوبی رہی۔ جہاز چلتا رہا اور ہم لوگ آہستہ آہستہ افریقہ کے قریب پہنچ گئے۔ سمندر میں اس زمانے میں بہت زیادہ طوفان آتے تھے۔ ایسے ہی ایک طوفان سے ہمیں بھی دوچار ہونا پڑا۔ ایسا زبردست طوفان تھا کہ جہاز کی چولیں تک ہل گئیں۔ خُدا خُدا کر کے طوفان کم ہوا تو ہمیں بحری قزّاقوں نے گھیر لیا۔ جہاز میں بارہ آدمی تھے۔ نو آدمیوں نے تو فوراً لڑتے لڑتے جان دے دی۔ قزاقوں نے ہمیں بُری

طرح لوٹا۔ ہماراجہاز، سامان اور کپڑے تک انہوں نے لوٹ لئے۔ اس کے بعد انہوں نے ہم پر اتنا کرم کیا کہ ہمیں اس جزیرے کے کنارے اُتار دیا۔

جیک نے سوبیا کا ڈبہ اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا۔ بس ایک یہی چیز ہمارے پاس قیمتی رہ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے ہم نے یہ ڈبہ ان کی نظروں سے چھپایا تھا۔ قزّاقوں نے ہم پر ایک عنایت یہ بھی کی تھی کہ صرف دو دِن کے کھانے پینے کا سامان ہمیں دے دیا تھا۔ یہ سامان ہم نے بعد میں ایک ہفتے تک چلایا۔ اس جزیرے میں دو دِن کے بعد ہی ہمیں گرمی لگنے لگی۔ خُدا جانے یہ کیا بات تھی؟ اب تک اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم لوگوں نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ اتار دیئے، چاقو، جوتے اور خالی پستول سب ایک جگہ رکھ دیا۔

اس کے بعد ہم نے جزیرے کا کونہ کونہ پانی کی تلاش میں چھان مارا۔ مگر نہ

توہمیں پانی ملااور نہ ہی یہ جگہ نظر آئی جہاں اس وقت ہم ہیں۔ سوبیا ہماری نظر میں بڑی قیمتی تھی اس لئے ہم نے اسے قریب ہی سمندر میں ایک جگہ رسّی سے باندھ کر لٹکا دیا۔ کیوں کہ سوبیا کو پانی پہنچانا بہت ضروری تھا۔"

"ٹھیک ہے، یہی وجہ تھی کہ ہمیں آپ کے اور جیک کے کپڑے وہاں پڑے ہوئے ملے اور تبھی سے ہمیں یہ فکر کھانے لگا کہ آپ دونوں خود نہ جانے کس جگہ ہیں۔۔۔؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں۔۔۔" جان نے پھر کہنا شروع کیا۔

"تُم نے ٹھیک سوچا۔۔۔ خیر جب کئی دِن اسی طرح گزر گئے اور کوئی جہاز اس طرف سے نہیں گذرا جس کو ہم مدد کے لئے پکارتے، تو ہمارے دِل ناامیدی سے بیٹھنے لگے۔ تبھی میں نے اپنی ڈائری کے ایک ورق پر دو خط لکھ کر اور پھر پانی کی خالی بوتل میں بند کر کے سمندر میں بہا دیے تھے۔ مُجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دِن بوتل کنارے پر ضرور لگے گی۔ کیوں کہ سمندر

کی لہریں ایسی چیزوں کو ہمیشہ ساحل پر پھینک جایا کرتی ہیں۔۔۔ جو میں سمجھتا تھا وہی ہوا، نتیجہ کے طور پر تم یہاں آ گئے۔۔۔ مگر تمہارا آنا نہ آنا اب برابر ہے، کیوں کہ اب ہم جکاریوں کے قیدی ہیں۔

ساحل پر پڑے پڑے جب ہمیں دو ہفتے ہو گئے تو اچانک ایک جکاری نے ہم پر حملہ کر دیا، ہم اسے دیکھتے ہی ڈر گئے۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ یہاں لے آیا اور ہمارے سپُرد یہ گھنٹہ بجانے کا کام کر دیا۔ ہمیں تھوڑا سا واہیات کھانا اور عجیب سے مزے کا پانی دو وقت دے دیا جاتا تھا اور بس۔۔۔ ہم تھے اور یہ اونچا گھنٹہ۔۔۔ اب اس کے آگے میں کیا بتاؤں۔۔۔ آگے جو کُچھ ہوا وہ تمہارے سامنے ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر جان خاموش ہو گیا۔

میں سوچنے لگا کہ اب کیا ہو؟ اس مُصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کیا ترکیب ہو۔ مگر افسوس میری سمجھ میں کُچھ نہ آیا کہ اب کیا کروں۔ جان بار

بار مُجھ سے معافی مانگ رہا تھا کہ صرف اسی کی وجہ سے میں اور میرے بچّے اس آفت میں گرفتار ہوئے۔ سورج کافی ڈھل چکا تھا۔ گھنٹہ بجنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔۔۔ دو جکاری اس کالے پتھرّ کو ابھی تک صاف کرنے میں مصروف تھے۔ میں یہ تو سمجھ ہی چکا تھا کہ اب ہم جی گا کے قیدی ہیں۔۔۔

مگر جی گا خود کہاں ہے، سامنے کیوں نہیں آتا؟ یہی سوال رہ رہ کر میرے دِل کو پریشان کر رہا تھا۔ بلونت بھی بڑی اداسی کے عالم میں اپنا سر گھٹنوں میں دیے بیٹھا تھا۔ جان خاموشی سے ٹکٹکی باندھے زمین کو دیکھ رہا تھا۔ اختر جان کے پاس بیٹھا ہوا واقعات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بندر اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا اُس کے بالوں سے کھیل رہا تھا اور جیک و نجمہ بدستور کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اچانک اس جھونپڑی میں لگے ہوئے لیمپ کی روشنی خود بخود تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دروازے پر

کھٹکا ہوا۔۔۔ ہم نے جلدی سے پلٹ کر دروازے کو دیکھا تو ہمارے دِل یکایک ڈوب گئے۔۔۔ دو جکاری جھونپڑی کے اندر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ مُونہہ سے باہر نکلے ہوئے دانتوں سے رال ٹپک رہی تھی اور ان کے خوف ناک چہروں پر بھیانک تبسّم ناچ رہا تھا۔

اندر آتے ہی انہوں نے پہلے ہمیں خوں خوار نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ہمیں ایک کونے میں سمٹتے اور سہمتے دیکھ کر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انہوں نے اس طرح ایک دوسرے کو دیکھا گویا ہماری اس حالت پر وہ خوش ہیں۔ اس کے بعد اُن کی نظریں کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی نجمہ اور جیک پر پڑیں۔ اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی ایک آنکھ میں پیدا ہونے والی وہ خُوشی کی چمک یکایک ماند پڑ گئی۔ جسم کے بال خوف کی وجہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان کے منحوس چہروں پر جو مسکراہٹ آئی تھی وہ اچانک غائب ہو گئی۔ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہنٹر

گھبراہٹ میں زمین پر گر پڑے۔

جلدی سے لپک کر وہ اپنی بھدّی چال چلتے ہوئے آگے بڑھے اور پھر نجمہ کے سامنے پہنچ کر زمین پر مُونہہ کے بل جھُک گئے۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی بطخ زمین سے دانہ چگتے وقت نظر آتی ہے۔۔۔!

شاید آپ سب اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ ہمیں یہ دیکھ کر کتنا اچنبھا ہوا۔ وہ جکاری جو شاید ہمارے خُون کے پیاسے تھے اور جنھوں نے ہمیں قربان کرنے کے لئے قربانی کا چبوترہ صاف کیا تھا وہ اچانک اتنے نرم دِل بن جائیں گے!

یہ تو ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ نجمہ بھی حیرت زدہ کھڑی تھی۔ جیک شاید یہ سمجھا تھا کہ جکاری نجمہ کو قتل کرنے آ رہے ہیں۔ اس لئے وہ پہلے ہی سے اس کے بالکل پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ نجمہ کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا مگر اس وقت اس نے جو

اداکاری کی وہ قابلِ دید تھی۔

وہ یہ تو سمجھ ہی گئی تھی کہ جکاری اس کا اس طرح ادب کر رہے ہیں جیسے وہ ان کی مَلکہ ہو۔۔۔ مگراِس کے بعد اُس کی سمجھ میں کُچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اُس نے بڑے تعجّب سے مُجھے دیکھا اور پھر جان کو۔۔۔ جان اس کی نظروں کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے جلدی سے کہا۔

"نجمہ بیٹی جکاری اس وقت تم سے مرعوب ہو گئے ہیں۔ اور اب میں جان چکا ہوں کہ کیوں؟ بات یہ ہے جی گا کے غلام زوک عام طور سے برساتی جیسا لباس پہنتے ہیں اور اس وقت یہ جکاری تمہیں زوک سمجھ کر تمہارے آگے جھُک گئے ہیں، کیوں کہ تم ابھی تک برساتی پہنے ہوئی ہو۔"

"لیکن پاپا یہ برساتی تو میں اس وقت بھی پہنے ہوئے تھی جب جکاریوں نے ہم سب پر ہنٹروں کی بارش کی تھی۔" نجمہ نے فوراً سوال کیا۔

"اصل میں اُس وقت رات ہو چکی تھی اور تم اور اختر ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے تھے شاید اس لئے جکاری تمہارے لباس کو اچھّی طرح نہ دیکھ سکے۔"

"مگر انکل ذرا سوچئے تو۔۔۔" یہ بات سُن کر میں نے فوراً کہا۔ "آپ جو کُچھ بول رہے ہیں کہیں جکاری وہ سمجھ نہ لیں اور ہوشیار نہ ہو جائیں۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا" جان نے کہا۔ "یہ ہماری شکلیں تو اپنے دماغ کے ذریعے جی گا تک بھیج سکتے ہیں مگر ہماری گُفتگُو نہیں بھیج سکتے اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

"مگر پاپا۔۔۔ اب میں کیا کروں، ان سے کیا کہوں؟" نجمہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"میں نے اتنے عرصے یہاں رہ کر یہ دیکھا ہے کہ زوک جب ان جکاریوں کو

جانے کے لئے کہتے ہیں تو اپنی انگلی سے ناک کو چھوتے ہیں۔ تب یہ جکاری فوراً چلے جاتے ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔" جان نے آہستہ سے جواب دیا۔

جکاری اب اپنا سر زمین سے اُٹھا چُکے تھے اور اپنی دُموں پر آرام سے بیٹھے ہوئے نجمہ کو دیکھ رہے تھے، نجمہ نے انہیں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر جلدی سے اپنی ایک انگلی ناک سے لگائی۔ اس نے کئی بار ایسا ہی کیا۔ اور پھر یہ دیکھ کر ہم سب کی خُوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ جکاری فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھا، تھوڑے سے جھکے اور پھر پلٹ کر ہمیں گھورتے ہوئے، اپنی وہی بھدّی چال چلتے دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی جھونپڑی میں لگی ہوئی وہ عجیب سی روشنی پھر ہلکی ہو گئی اور پھر نجمہ دوڑ کر مُجھ سے لپٹ گئی۔

"ابّا جی۔۔۔ ابّا جی، مُجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کا پورا جسم خوف کی وجہ سے

لرز رہا تھا۔

میں نے اسے تسلّی دی تب اس کی کُچھ ڈھارس بندھی، اس کے بعد میں نے جان سے پوچھا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے؟

"ارادہ!۔۔۔" جان نے بے بسی سے کندھے جھٹک کر کہا۔ "اب ارادہ ہو بھی کیا سکتا ہے، جکاری عارضی طور پر دھوکے میں آ گئے ہیں، مگر ہمیشہ ہی وہ دھوکے میں تھوڑی رہیں گے، ابھی چند منٹوں کے بعد انہیں حقیقت کا پتہ چل جائے گا اور تب ہمارا بچنا محال ہو گا۔۔۔ زوک لوگ بہت عقل مند ہیں اور جی گا کے غُلام۔ ظاہر ہے کہ جکاریوں کے بعد اب زوک آئیں گے اور ہم سے بازپرس کریں گے۔"

"زوک لوگوں سے نپٹنے کا بھی کوئی طریقہ ہے؟" بلونت نے پوچھا۔

"کوئی طریقہ نہیں سوائے سوبیا کے۔ سوبیا کی کرنیں سوائے جی گا کے اور

سب کو ہلاک کر سکتی ہیں۔ مگر سوبیا اب ہمارے پاس کہاں ہے؟"

"اگر آپ کہیں تو کسی نہ کسی طرح میں جھونپڑی سے باہر جاؤں اور سوبیا کا بکس لے آؤں؟" جیک نے پوچھا۔

"تم پاگل ہو۔ اوّل تو تم بھاگ نہیں سکتے کیوں کہ جکاری تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے۔ بھاگنا ہی ہوتا تو ہم دونوں کبھی کے اس جزیرے سے بھاگ گئے ہوتے۔۔۔ دوسری بات یہ کہ سوبیا کو تلاش کرنے میں جو وقت تُم صرف کرو گے، اتنے عرصے میں ہم سب کا خاتمہ ہو جائے گا۔۔۔ پھر آخر سوبیا کی تلاش سے فائدہ۔۔۔؟"

"تو پھر آخر ہم کیا کریں۔۔۔؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"خدا کو یاد کرو۔۔۔ کیوں کہ مُصیبت میں اُس سے بڑا مددگار اور کوئی نہیں ہے۔۔۔" جان نے اتنا کہہ کر سر جھُکا لیا۔

اِس فقرے نے اب ہماری ہمّتیں توڑ دیں۔ مجبوراً ہم نے وہی کیا جو جان نے کہا تھا۔ میں نے دعائیں مانگنی شروع کیں۔ جتنی دُعائیں مُجھے یاد تھیں وہ سب پڑھ ڈالیں۔ خُدا سے رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اِس طرح سے مُجھے کُچھ سکون مل گیا۔ یہ سوچ کر کہ اب مرنا تو ہے ہی میں نے اختر اور نجمہ کو باری باری گلے سے لگا کر پیار کیا۔ جان بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا اور جیک بے قراری کے عالم میں جھونپڑی میں اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔ بلونت کی حالت یہ تھی کہ جیسے اُسے اِن باتوں سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ اس نے شاید سوچ رکھا تھا کہ اگر مرنا ہے تو خاموشی کی موت کیوں نہ مرا جائے!

بڑی نااُمّیدی کا عالم تھا اور اِسی عالم میں شاید آدھ گھنٹہ گُزر گیا۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے کہ اچانک جھونپڑی کی روشنی پھر تیز ہوگئی۔ دروازہ کھُلا اور دو جکاری ایک زوک کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

انھوں نے بڑی خوف ناک مُسکراہٹ کے ساتھ نجمہ کو دیکھا اور پھر زوک نے آگے بڑھ کر نجمہ کی برساتی پھاڑ ڈالی۔ نجمہ سہم کر کھڑی ہو گئی۔ اس پر جکاری آگے بڑھے اور نجمہ کے جسم سے برساتی نوچ کر انھوں نے ایک کونے میں پھینک دی۔ اس کے بعد وہ زوک کے پیچھے جا کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں نجمہ کے جسم پر اچھّا خاصہ لباس تھا، صرف لباس کا نچلا حصّہ تھوڑا سا پھٹ گیا تھا۔ نجمہ کے ساتھ ہی ہم سب بھی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

زوک ہمیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ یہ شخص شکل و صورت میں جکاریوں سے بالکل الگ تھا۔ اس کی صورت انسانوں کی سی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک تو اس کا رنگ سُرخ تھا دوسرے کان اوپر سے نوکیلے تھے، ہاتھ اور پیروں کی تین تین انگلیاں تھیں اور قد وہی تین فٹ کا تھا۔۔۔ ہمیں خوف سے لرزتے دیکھ کر وہ ہنسا اور پھر اپنی ایک انگلی اٹھا کر جھونپڑی میں

لگی ہوئی اس عجیب سی روشنی کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ہم نے جلدی سے اوپر دیکھا تو وہ روشنی اب اپنا رنگ بدل رہی تھی۔ کئی رنگ بدلنے کے بعد جب وہ سُرخ ہو گئی تو ایک سرّاٹا سا اس میں گونجنے لگا اور پھر کسی نے صاف اُردُو میں کہنا شروع کیا۔

"تم نے ہمیں دھوکا دینا چاہا تھا مگر تم کامیاب نہیں ہوئے۔۔۔ بتاؤ تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

زوک نے اس کے بعد ہمیں دیکھا، گویا جواب چاہتا ہو۔ اس پر جان نے کہا :

"ہم کسی کو تباہ کرنے نہیں آئے۔ ہمارا جہاز ٹوٹ گیا تھا اس لئے ہم نے یہاں پناہ لی تھی۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ خیر کوئی بات نہیں، جکاریوں کا روحانی گھنٹہ اب تم

نہیں بچاؤ گے بلکہ جکاری تمہارا خون پینے کے بعد اب خود اِسے بچائیں گے۔ میرے ساتھ خاموشی سے باہر چلے چلو، اب تمہاری قربانی کا وقت آگیا ہے۔ سورج یعنی ہماری طاقتوں کا مرکز اب ڈوبنے والا ہے۔ اس کے ڈوبنے سے پہلے ہم تمہارے خون کا لال رنگ اُس کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔"

شاید یہ زوک کے الفاظ تھے جو کسی خاص طریقے سے اس کی زبان سے نکلنے کی بجائے اس روشنی سے نکل رہے تھے۔ اتنا کہہ کر وہ مُڑا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس کے جانے کے بعد جکاریوں نے ہمیں باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ یہ وقت عجیب تھا۔ نجمہ اور اختر مُجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ ہم لوگ لاکھ دِل گُردے والے سہی مگر اس وقت تو ہمارا کلیجہ بھی مُونہہ کو آیا ہوا تھا۔

بلونت جیک اور جان سب کے سب خوفزدہ تھے۔ جکاریوں نے دھکّے

دے دے کر ہمیں باہر نکالا۔ اور ہم لرزتے کانپتے اس جھونپڑی سے باہر آ گئے۔ یہاں آ کر ہم نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ جکاریوں کی ایک بڑی تعداد کالے چبوترے کو دو طرف سے گھیرے بیٹھی تھی۔ گھنٹہ لگاتار بج رہا تھا۔ سورج کے غروب ہونے میں تقریباً بیس منٹ کی دیر تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اچانک زمین میں سے نہ جانے کس طرح زوک اُبھرنے شروع ہو گئے۔ ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جکاری انہیں آتا دیکھ کر اسی طرح مُونھہ کے بل زمین پر جھُک گئے۔ زوک لوگوں کی جب پوری تعداد زمین سے باہر آ گئی تو ایک بھیانک سیٹی بجی۔ اسی سیٹی کو سُن کر جکاری پھر کھڑے ہو گئے۔ چبوترے کے نیچے اس جگہ پر جہاں ہمیں قتل ہونا تھا ایک بہت بڑا برتن رکھا ہوا تھا۔۔

اف خدا! اب بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ برتن ہم سب کے خُون کو بھرنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔

نجمہ اور اختر برابر روئے جا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت زرینہ کا کیا حال ہو گا۔ ایک تو بچّوں کی جدائی میں پہلے ہی وہ غمگین ہوگی، لیکن جب ہم لوگ گھر نہ پہنچ سکیں گے تو اس کی زندگی کس طرح گزرے گی۔ میرے کاروبار کا کیا ہو گا؟ یہ سوچ کر میرے آنسو بھی بہنے لگے اور میں بالکل ہی نِڈھال ہو گیا۔

اس لمبے چوڑے میدان کا رنگ اب نرالا ہی تھا۔ بیچ میں چبوترہ تھا۔ ایک طرف جکاری کھڑے تھے۔ دوسری طرف زوک اور چبوترے کے بالکل سامنے ہم سب۔ یکایک وہ سیٹی جیسی تیز چیخ پھر سُنائی دی اور جکاریوں میں سے ایک جکاری ہاتھ میں کافی لمبا اور وزنی تیر لئے ہوئے چبوترے پر پہنچ گیا۔

گھنٹہ اب جلدی جلدی بجنے لگا۔ آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے گھبرا کر میدان سے دور دور اڑنے لگے۔ ہوا بند ہو چکی تھی اور سورج جزیرے کے

درختوں سے جھانک رہا تھا۔ زوکوں میں سے ایک نے جس کے برساتی نما لباس پر زرد رنگ کا ایک فیتہ ٹکا ہوا تھا، اپنا ہاتھ ہوا میں اٹھایا۔ یہ اشارہ تھا کہ ہاں اب دیر کس بات کی ہے؟ قربانی شروع کرو۔

اشارہ پاتے ہی وہ جکاری جنہوں نے ہمیں پکڑ رکھا تھا۔ اب آگے بڑھے اور انہوں نے جیک کو ہنٹر کے دستے سے ٹھوکا دیا۔ مطلب یہ تھا کہ سب سے پہلے تم آگے بڑھو۔

اختر اور نجمہ بُری طرح رونے لگے اور ہم سب بے بسی سے آسمان کو تک کر رہ گئے۔ خُدا نے شاید ہمارے گناہوں کو معاف نہیں کیا تھا۔ اس لئے شاید اب اسے ہمیں بچانا منظور نہ تھا۔ جیک نے کوشش کی کہ موقع ملتے ہی بھاگ نکلے مگر وہ کسی طرح بھی نہیں بھاگ سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو جکاریوں کی آنکھوں سے ایک روشنی نکلتی اور جیک بے کار ہو کر گر پڑتا۔ جان نے ہمیں یہی بتایا تھا۔ اب جیک کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے قصائی

کے ہاتھ میں کسی بکرے کی ہوتی ہے۔

جیک کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بار بار سینے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔ نجمہ بُلند آواز سے اللہ سے دُعا مانگ رہی تھی اور ہم لوگ گردن نیچی کئے کھڑے تھے۔ جیک کو لے جا کر جکاریوں نے چبوترے پر کھڑا کر دیا اور پھر اسے اشارے سے بتایا کہ وہ گھٹنوں کے بل جھُک جائے تاکہ جلّاد آسانی سے اُس کا سر اُڑا سکے۔ جیک نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس لئے وہ غریب مجبوراً گھُٹنوں پر جھُک گیا۔ خوف کے مارے میرے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی مُٹھّیاں کسی ہوئی تھیں۔ اپنی آنکھوں میں نے بھینچ کر بند کر رکھی تھیں تاکہ قتل ہوتے وقت جیک کی صورت نہ دیکھ سکوں۔

وہی ہیبت ناک تیز سیٹی پھر سُنائی دی اور اختر و نجمہ مُجھ سے لپٹ گئے۔ گھنٹہ جلدی جلدی بجنے لگا۔ میرے کان جیک کی بھیانک چیخ سُننے کے لئے تیّار ہو

گئے۔

ایک سیکنڈ گُزرا۔۔۔!

دوسرا سیکنڈ گُزرا۔۔!!

اور مُجھے یقین ہو گیا کہ بس اب جیک کا خُدا حافظ!

اچانک ایک بھیانک اور دِل دہلا دینے والی چیخ سُنائی دی۔ میرا دِل لرز گیا۔ میں سمجھ گیا کہ جیک کا سر کٹ کر اب دُور گِر چُکا ہو گا اور اس کی بے سر کی لاش چبوترے پر پڑی تڑپ رہی ہو گی۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے میرے دانت آپس میں بجنے لگے۔ آنکھیں کھولتے ہوئے میں ڈر رہا تھا کہ کس طرح اِن آنکھوں سے مُردہ جیک کو دیکھوں گا۔ اچانک ویسی ہی چیخ پھر سُنائی دی۔

مگر یہ چیخ انسانی ہرگز نہ تھی۔ میدان میں شور بڑھنے لگا اور پھر اُن چیخوں کی

آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ اب میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور چبوترے کی طرف دیکھا۔۔۔

آپ سب جو میری اس داستان کو پڑھ رہے ہیں شاید میری اس وقت کی حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے! میرے خُدا نے مُجھ گناہگار کی اِلتجا قبول کر لی تھی۔ جیک زندہ سلامت چبوترے پر کھڑا حیرت سے زمین پر ایک کے بعد ایک ِگرتے ہوئے جکاریوں کو دیکھ رہا تھا۔

ہم سب تعجّب سے آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے اور ہماری سمجھ میں کُچھ نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ جکاریوں میں سے کوئی نہ کوئی یکایک زور کی ایک بھیانک چیخ مارتا۔۔۔ اور پھر دِل پکڑ کر زمین پر ِگر جاتا۔ زوکوں کی حالت بھی خراب تھی۔ وہ اپنی جگھوں پر کھڑے ہوئے یوں جھوم رہے تھے جیسے انھوں نے افیون کھا لی ہو۔ ان میں سے ایک دو نے قدم بڑھانے کی کوشش بھی کی مگر لڑکھڑا کر رہ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا

جیسے کوئی غیبی طاقت ہماری مدد کو آ گئی ہو۔

جکاریوں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ گھنٹہ بجنا اب بند ہو گیا تھا۔ کیونکہ گھنٹے کو بجانے والے جکاری بھی گھنٹے کے نیچے مُونہہ کے بل گرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا گویا کوئی قیامت آ گئی ہو۔ ان کی بھیانک چیخوں سے آسمان گونج رہا تھا۔ ہم لوگ بڑی پریشانی کے ساتھ ہر سِمت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے جکاریوں کو مارنے والے اگر کُچھ انسان ہیں تو وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟

جیک نے جب یہ حالت دیکھی تو دوڑ کر وہ ہمارے پاس آ گیا اور گھبرا کر کہنے لگا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوا۔ مگر آپ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔، جلدی سے سمندر کی طرف بھاگیے۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ ہم اندھا دُھند ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے مگر اس کو اب آپ ہماری بد قسمتی کہہ لیجئے کہ ہم اندھیرے میں راستہ نہ دیکھ سکے اور گھوم پھر کر پھر وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ یہ جگہ کالے چبوترے سے کُچھ فاصلے پر ضرور تھی اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ چار جکاری اس جگہ بالکل ٹھیک حالت میں کھڑے ہوئے تھے یہ بات میرے لئے بڑی عجیب تھی کہ وہاں تو کالے چبوترے کے پاس کھڑے ہوئے جکاری خود بخود زمین پر ڈھیر ہوئے جا رہے تھے اور یہاں صرف بیس گز دوری پر یہ چار جکاری ہمیں زندہ حالت میں نظر آ رہے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ مسکرائے۔ وہی خوفناک اور بھیانک مسکراہٹ! اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ہمارے قریب آنے لگے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس وقت مُجھے خود پر کتنا غصّہ آیا تھا۔ ۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ کالے چبوترے

سے بھاگنے کی سمت ہم پہلے ہی دیکھ لیتے۔ ہماری اس بے وقوفی نے ہمیں پھر دشمنوں کے چنگل میں لا کے پھنسا دیا تھا۔۔!

جکاری بہت آہستہ آہستہ ہماری طرف رہے تھے۔ ان کی چال دیکھ کر اچانک جان نے کہا۔

"میں اب سمجھ گیا۔ ضرور یہی بات ہے۔ کوئی انسان اس جزیرے میں پہنچ گیا ہے اور اس کے پاس سوبیا کا ڈبہ ہے۔ سوبیا کے بغیر یہ خوفناک قوم کبھی نہیں مر سکتی تھی۔ چونکہ یہ جگہ وہاں سے دور ہے جہاں ہم پہلے کھڑے تھے، اس لئے سوبیا کی کرنیں یہاں تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔۔۔ فیروز کوشش کرو کہ تم بھی بچّوں کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہو۔ اس طرح ہم کالے چبوترے تک پہنچ جائیں گے اور سوبیا کی قاتل کِرنیں وہاں ان جکاریوں کو ضرور مار ڈالیں گی۔"

میں نے جان کی اس بات پر عمل کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ میں

پیچھے ہٹتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ بھلا اس گُم نام اور بھیانک جزیرے پر کوئی انسان کس طرح پہنچ سکتا ہے ؟

اور اگر پہنچ بھی گیا ہے تو پھر وہ انسان ہے کون ؟ اسے سوبیا کا علم کس طرح ہوا کہ وہ ساحل کے پاس پانی میں ڈوبی ہوئی ہے !

یہ علم اگر ہو بھی گیا تو آخر وہ ہمیں بچانے کیوں آیا؟ یہ خیال آتے ہی مُجھے فوراً یہ بات بھی یاد آئی کہ ہو سکتا ہے وہ انسان ہمیں بچانا نہیں چاہتا ہو، بلکہ لاعلمی میں وہ ہمارا مددگار بن گیا ہو۔ سوبیا کا ڈبّہ جب اس کے پاس ہے تو اسے کیا معلوم کہ اس دھات کی کیا کرامت ہے ۔ وہ تو اتّفاق سے سوبیا کی زہریلی کرنوں نے جکاریوں کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح سے ہم بچ گئے ۔ ۔ ۔

یہی باتیں سوچتا ہوا میں پیچھے ہٹتا رہا۔ ہم سب کی نگاہیں جکاریوں کی طرف لگی ہوئی تھیں اور انہیں دیکھتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے ۔

اور پھر یہ دیکھنے کے لئے کہ اب کالا چبوترا کتنی دور رہ گیا ہے۔ میں نے پیچھے نظر ڈالی تو خوف کی ایک چیخ میرے مُونہہ سے پھر نکل گئی۔ میرے بعد ہی اور سب نے بھی ایسی ہی چیخیں ماریں۔ وجہ یہ تھی کہ اب ہمارے پیچھے سے بھی تین زوک آہستہ آہستہ ہمیں پکڑنے کے لئے ہمارے طرف آ رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر اب میں سمجھ گیا کہ اس وقت تو ہم اتّفاق سے بچ گئے تھے۔ مگر اب شاید مشکل ہی سے بچیں!

زوک اور جکاری آہستہ آہستہ ہمارے قریب آتے جا رہے تھے۔ موت اپنا بھیانک مُونہہ کھولے ہماری طرف بڑھتی آ رہی تھی اور ہم لوگ بالکل بے بس تھے۔ میں یہ اچھّی طرح جان چکا تھا کہ جوں ہی جکاری اپنے خوفناک اور دو انگلیوں والے ہاتھ ہماری طرف بڑھا کر ہمارے جسم کو چھوئیں گے تو بجلی کا وہی زوردار جھٹکا مُجھے پھر محسوس ہوگا، جو بہت پہلے روحانی گھنٹہ کے نیچے مُجھے ایک بار لگا تھا۔ نجمہ، اختر بیری کی طرح لرز

رہے تھے۔ بلونت کا چہرہ غُصّے کی وجہ سے سُرخ ہو گیا تھا اور جیک بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ ہمیں جو بھی کرنا تھا فوراً کرنا تھا مگر سمجھ میں کُچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔۔ اچانک جان نے جلدی سے مُجھ سے کہا:

"فیروز۔۔۔ کیا تمہارے پاس کاغذ قلم ہے؟"

"جی ہاں موجود ہے۔ آپ کی ڈائری اور اس میں لگی ہوئی چھوٹی سی پنسل ابھی تک میرے پاس ہے۔"

"بس تو اندھیرے میں اہم ایک تیر چلاتے ہیں۔ خُدا سے دُعا کرو کہ وہ ہمیں کامیاب کرے۔ لاؤ ڈائری مُجھے دو۔ جلدی! جکاری کُچھ ہی دیر میں ہمارے پاس آجائیں گے۔ وہ تو کبھی کے آجاتے مگر سوبیا کی کرنوں کا تھوڑا بہت اثر ان پر ضرور پڑ رہا ہے اس لئے وہ لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے ہیں۔"

میں نے فوراً ڈائری جان کو دے دی۔ جان نے جلدی جلدی اس کے ایک صفحے پر کُچھ لکھا اور پھر وہ صفحہ پھاڑ کر اختر کو دیتے ہوئے کہا۔

"اختر بیٹے، یہ پرچہ بندر کے گلے میں رسّی سے باندھ دو اور پھر اسے جنگل کی طرف چھوڑ دو۔ مُجھے معلوم ہے کہ تم نے بندر کو سدھا لیا ہے اور تم اس سے بہت سی چیزیں منگوا لیا کرتے ہو!"

"ہاں پاپا۔۔۔ میں نے بندر کو سدھا لیا ہے۔۔"اختر نے جواب دیا۔

"بس لو پھر جلدی سے یہ کام کرو۔۔"

جان کی مرضی کے موافق اختر نے بندر کے گلے میں پرچہ باندھ دیا اور پھر اُس کے کان میں کُچھ بولی بولی، ہاتھوں سے اشارے کیئے۔ اِس کے بعد اس نے بندر کو جنگل کی طرف چھوڑ دیا۔ بندر جب چھلانگیں لگاتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا تو میں نے جان سے پوچھا۔

"آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ آپ نے پرچے پر کیا لکھا ہے؟"

جان نے پلٹ کر جکاریوں کی طرف دیکھا۔ جکاری اب ہم سے دس پندرہ گز دور تھے۔ ان کی چال بہت سُست ہو گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ بھد بھد کرتے ہوئے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ جان نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے پرچہ اس شخص کے نام لکھا ہے جو اس وقت سوبیا کا ڈبّہ ہاتھ میں لئے جنگل میں کھڑا اس خوفناک جگہ کو چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس سے التجا کی ہے کہ سوبیا کا ڈبّہ بندر کو دے دے تاکہ بندر یہ ڈبّہ لے کر ہمارے پاس واپس آ جائے۔ اس کے بعد میں نے وعدہ کیا ہے کہ اس کا ڈبّہ اسے واپس کر دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس صورت میں کامیابی کی بہت کم اُمّید ہے۔ مگر جب جان پر بنی ہو تو ایسی حماقتیں انسان سے ہو ہی جاتی ہیں۔ اور پھر کون جانے کہ یہ حماقتیں بعض دفعہ بھلائی کی راہ دکھا دیں!

مرنا تو ہے ہی، مگر میں ذرا کوشش کر کے مرنا چاہتا ہوں۔"

"جکاری قریب آ رہے ہیں جان صاحب۔" بلونت نے گھبرا کر کہا۔

"بھاگنے کا کوئی طریقہ سوچیئے۔"

"طریقہ کوئی نہیں ہے، بس صرف خُدا پر بھروسہ رکھو۔ اسے اگر ہمیں زندہ رکھنا منظور ہے تو ہم ہر گز نہیں مر سکتے۔ ہمارے بھاگنے کی راہیں سب طرف سے بند ہیں۔ ہم کُچھ نہیں کر سکتے۔" جان نے جواب دیا۔

ہمارا دِل بیٹھا جا رہا تھا۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اختر اور نجمہ تھر تھر کانپ رہے تھے، کبھی ہم سامنے سے آتے ہوئے جکاریوں کو دیکھتے اور کبھی پیچھے سے آتے ہوئے خونخوار زوکوں کو۔۔۔ جو ہر لمحہ میں قریب سے قریب آتے جا رہے تھے۔ کُچھ ہی دیر کے بعد یہ فاصلہ صرف دو گز رہ گیا۔

جکاریوں کے بھیانک جبڑے کھُلے ہوئے تھے۔ ان کے لمبے لمبے دانتوں

سے رال ٹپک رہی تھی۔ ان کے چہروں کی ایک ایک آنکھ میں خون اُترا ہوا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ بس اب یہ آخری وقت ہے۔ خُدا کو یہی منظور ہے کہ میں اپنے بچّوں اور ساتھیوں کے ساتھ ایک گم نام جزیرے میں چند بہت ہی خوفناک اور طاقتور جانور نما انسانوں کے ہاتھوں سے مارا جاؤں۔۔۔ میں نے دِل ہی دِل میں خُدا کو یاد کیا اور پھر اختر اور نجمہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ جکاریوں نے ہمیں بے بس اور قریب پا کر بڑی بھیانک چیخیں ماریں اور ہماری طرف جھپٹے۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مگر پھر وہی ہوا جو اب سے کُچھ دیر پہلے ہو چکا تھا۔ اللہ کو ہماری حالت پر رحم آگیا تھا شاید۔ اس نے ہمارے دِلوں سے نکلی ہوئی خاموش دعائیں سُن لی تھیں۔ ہمیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی جکاری بڑی ہیبت ناک آوازیں نکالتے ہوئے زمین پر گر پڑے۔ ان کے گرنے کے کُچھ ہی دیر بعد گھاس پر کسی کے بھاگنے کی آواز قریب آنے لگی اور پھر اندھیرے میں سے کوئی

چیز زمین سے اچھل کر اختر کے کندھے پر بیٹھ گئی۔ اختر نے گھبرا کر چیخ ماری، مگر پھر فوراً ہی مطمئن ہوگیا۔ یہ اختر کا بندر تھا اور اس کے گلے میں اس وقت ایک چھوٹا سا ڈبّہ لٹک رہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "میری تدبیر آخر کام دے ہی گئی۔ اور یہ سب کچُھ اختر کے بندر کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر اس سفر میں یہ بندر نہیں ہوتا تو آج ہم سب ضرور مر گئے ہوتے۔"

اتنا کہہ کر جان نے بندر کے سر پر محبّت کا ہاتھ پھیرا اور جواب میں بندر نے اسے دانت دکھائے۔ جان نے پھر اس کے گلے میں سے ڈبّہ نکالا اور اُسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"بالکل وہی۔۔ وہی ہے، دیکھو جیک یہ وہی ڈبّہ ہے نا۔۔ مگر یہ ڈبّہ کس شخص کے پاس تھا؟ اس نے آخر بندر کو بغیر سوچے سمجھے یہ ڈبّہ کیوں دے دیا؟ ہمیں اُس مہربان انسان کو تلاش کرنا چاہیئے۔ وہ ہمارے لئے رحمت

کا فرشتہ بن کر آیا ہے۔ آؤ فیروز ہم اسے ڈھونڈیں۔"

جان کا اشارہ پا کر جیسے ہی میں نے آگے بڑھنے کے لئے قدم اٹھایا جیک نے جلدی سے بڑھ کر میرا بازو دبایا اور ساتھ ہی آہستہ سے مُجھ سے کہا کہ میں سامنے میدان کی طرف دیکھوں۔۔ میرے ساتھ ہی سب لوگ بھی میدان کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ چاند ابھر چکا تھا اور اس کی پھیکی پھیکی روشنی میں میں نے دیکھا کہ دو آدمی بھاگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے ہیں۔ ان کے بھاگنے کے انداز سے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ انسان ہیں۔

احتیاطاً میں نے اپنا پستول نکال لیا اور ان دونوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ دونوں قریب آ گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ چاند اُن کے پیچھے تھا اس لئے اُن کے چہرے اندھیرے میں تھے۔ البتّہ چاند کی روشنی ہمارے چہروں پر پوری طرح پڑ

رہی تھی۔ جو شخص آگے تھا وہ تو خاموش کھڑا رہا۔ لیکن جو آدمی پیچھے تھا وہ خُوشی کا ایک نعرہ لگا کر دوڑا اور پھر میرے قدموں میں آ کر گر گیا۔ ساتھ ہی اُس نے چلّا کر کہا۔

"بھگوان کا شکر ہے کہ آپ مل گئے۔۔ میرے مالک۔۔۔ مُجھے پہچانئے میں کوئی غیر نہیں۔۔۔ آپ کا وہی پرانا خادم ہوں۔۔۔ سوامی!!"

آواز بے شک سوامی کی تھی۔ اندھیرے میں اگرچہ چہرہ نہیں تو یہ آواز تو میں ضرور پہچان سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے نیچے جھک کر سوامی کو دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر اُٹھا لیا۔ اُسے غور سے دیکھا اور پھر جلدی سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ایسا کرنے سے مُجھے بڑی خُوشی ہوئی۔ مالک اور نوکر کا فرق اس وقت بالکل مٹ چکا تھا۔ ہم سب برابر تھے اور ایک ہی ناؤ میں سوار، مصیبتوں کے سمندر میں بہے چلے جا رہے تھے۔

سوامی مُجھ سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے میں وہ شخص

جو بالکل خاموش کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا، آگے بڑھا اور سوامی سے کہنے لگا۔

"یہ وقت ضائع مت کرو، سوامی۔ جن کی تمہیں تلاش تھی وہ تمہیں مل گئے۔ اب تو جلد سے جلد اس خطرناک جگہ سے نکلنے کی کوشش کرو۔ باقی باتیں کسی محفوظ جگہ پر ہوں گی۔"

اس شخص کی بات معقول تھی۔ جکاریوں اور زوکوں کا ڈر ہمیں اس قدر تھا کہ ہم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور پھر تیزی سے جنگل کی سمت بھاگے۔ سوامی اب اختر اور نجمہ کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اندھیرے میں تو خیر میں کُچھ نہ دیکھ سکا، البتّہ مُجھے یقین تھا کہ اختر اور نجمہ کے دِل سوامی کو پا کر خُوشی کی وجہ سے کھل اٹھے ہوں گے۔ کافی دیر تک ہم لوگ اندھا دُھند ایک ہی سمت بھاگتے رہے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بار بار ہم میں سے کوئی نہ کوئی کسی درخت یا پتھرّ سے ٹکرا جاتا اور اس کی ہلکی سی سِسکاری اس سنّاٹے میں سُنائی دے جاتی۔

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ویسے میرا اندازہ ہے کہ ہم لوگ شاید آدھ گھنٹے تک بغیر دم لئے لگاتار بھاگتے رہے۔ آخر ایک مقام ایسا آگیا جہاں درخت زیادہ گنجان نہ تھے۔ جگہ بے شک کھلی ہوئی تھی مگر محفوظ تھی۔ یہاں آکر ہم لوگ جلدی سے درختوں کے تنوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کان لگا کر سُننے کی کوشش کی کہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں آرہا؟ جب اطمینان ہوگیا کہ ایسا نہیں ہے تو جان نے کہا۔

"دشمن کو غافل تو سمجھو نہیں۔ ویسے یہ جگہ فی الحال ایسی ہے کہ کوئی ہمیں تلاش نہیں کر سکتا۔ میں آواز لگاتا جاتا ہوں، تم میں سے ہر ایک جواب دیتا جائے تاکہ میں سمجھ لوں کہ کوئی شخص کم تو نہیں ہے۔"

جان نے باری باری ہر ایک کا نام پکارنا شروع کیا۔ سب جواب دیتے گئے۔ مگر آخر میں معلوم ہوا کہ بلونت غائب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ لگ گیا کہ سوامی کے ساتھ آنے والے نوجوان کا نام امجد ہے۔

بلونت کی ہم سب کو فکر تھی کہ آخر وہ کہاں گیا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے
تھے کہ اچانک دور سے کسی کے بھاگنے کی آواز قریب آتی سُنائی دی۔

احتیاطاً ہم سب نے اپنے ہتھیار نکال لئے۔ ہم نے اندھیرے میں
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر یہ اندازہ کر کے ہمیں
اطمینان ہو گیا کہ آنے والا بلونت ہے۔

"کہاں رہ گئے تھے تم۔۔۔؟" جان نے اس طرح دریافت کیا جیسے اسے
بلونت کا دیر سے آنا اچھّا نہ لگا ہو۔

"آپ لوگ تو بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کسی نے مُجھے دیکھا بھی نہیں۔
میں تو ایک درخت سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو بڑی
مشکل سے راستہ تلاش کرتا ہوا آیا ہوں۔"

میں نے بلونت کو دِلاسا دیا اور پھر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ واقعی یہ ہماری

غلطی تھی کہ ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے اور پیچھے مُڑ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ کوئی رہ گیا ہے۔ بلونت ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ سوامی کی چھاگل میں کافی پانی موجود تھا۔ اس نے تھوڑا سا بلونت کو پینے کے لئے دیا اور تب اس کی جان میں جان آئی۔ جب ہمیں معلوم ہو گیا کہ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے تو جان نے کہا:

"اب ہم لوگ مل ملا کر کل آٹھ آدمی ہو گئے ہیں، ہمیں جو کُچھ کرنا ہے وہ تو ہم بعد میں سوچیں گے۔ پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اپنا ایک لیڈر مقرّر کر لیں۔ اس طرح فائدہ یہ ہو گا کہ ہم سب ایک شخص کے کہنے پر چلیں گے اور کوئی بھی اپنی من مانی نہیں کر سکے گا۔ کیوں فیروز تمہارا کیا خیال ہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیڈر کو دوسروں کا بھی خیال رہتا ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی کو تکلیف نہ ہو۔"

"بس تو پھر میں آپ کو اپنا لیڈر مانتی ہوں پاپا۔" نجمہ نے جلدی سے کہا۔

"میں بھی۔" اختر نے کہا۔

اور پھر ان دونوں کے ساتھ ہی ہم سب نے بھی جان کو اپنا لیڈر مان لیا۔ یہ دیکھ کر جان نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم مُجھے بُوڑھے اور کمزور آدمی کو ہی اپنا لیڈر بناؤ گے۔ خیر میں پوری کوشش کروں گا کہ اپنے فرض کو نبھاؤں۔ اب آپ سب کو چاہیئے کہ میرا کہا مانیں اور میری اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی میں اب سوامی سے کہتا ہوں کہ وہ ہمیں یہ بتائے کہ اسٹیمر سے سمندر میں گرنے کے بعد اس پر کیا بیتی؟ یہ امجد صاحب کون ہیں، اسے کہاں سے ملے اور آخر وہ اس جزیرے میں کس طرح آیا؟ مگر اس سے پہلے کہ سوامی اپنی داستان شروع کرے، سب لوگ قریب آ جائیں۔ اپنے ہتھیار ہاتھ میں رکھ کر چوکنّے بیٹھیں اور کسی قسم کی روشنی جلانے کی کوشش نہ کریں۔ ہاں سوامی اب تم اپنی کہانی سناؤ۔"

اتنا کہہ کر جان خاموش ہو گیا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ بس رات کے سنّاٹے میں کبھی کبھار جنگلی ٹِڈّوں کا شور گونج اُٹھتا تھا۔ چاند کی مدھم سی روشنی درختوں سے چھن کر کہیں کہیں پڑ رہی تھی۔ ہم سب اندھیرے میں تھے۔ بس ایک دوسرے کو اس کی آواز سے پہچان رہے تھے۔ ورنہ شکل کسی کی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سوامی ایک مرتبہ کھانسا اور اس کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

سوامی کی داستان

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ بڑے حیرت انگیز واقعات ہیں۔ بہت سی باتیں تو میں بھول چکا ہوں۔ پھر بھی جو کُچھ مُجھے یاد ہے وہ سُناتا ہوں۔ اسٹیمر سے نیچے سمندر میں گرنے کے بعد مُجھے بالکل ہوش نہ رہا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ طوفان بڑا زبردست تھا۔ شاید میں لہروں کے تھپیڑے کھاتا ہوا اِدھر سے اُدھر بہتا رہا۔ بڑی دیر کے بعد مُجھے ہوش آیا اور میں نے محسوس کیا کہ لہروں کے ہاتھوں میں میں کھلونا بنا ہوا ہوں۔ ایک لہر اُچھال کر مُجھے دوسری لہر کی طرف پھینک دیتی تھی۔ اور دوسری لہر تیسری کی طرف۔ لہروں کے طمانچے کھاتے کھاتے میرا مُونہہ سوج گیا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بہت اچھّا تیراک ہوں۔ مُجھ سے جہاں تک ہو سکا میں نے تیرنے کی کوشش کی۔

بے ہوشی کے عالم میں میرے پیٹ میں کھاری پانی کافی جا چکا تھا۔ میں

نے اُلٹی کر کے یہ پانی نکالا اور پھر تیرنے لگا۔ کیوں کہ اب صرف تیرنے ہی پر میری زندگی کا دار و مدار تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں نے ہر طرف دیکھا، مگر اسٹیمر مُجھے دور تک نظر نہ آیا۔ نہ ختم ہونے والا سمندر تھا، میں تھا اور میرے تھکتے ہوئے بازو تھے۔

کئی گھنٹے کے بعد طوفان ختم ہوا اور سمندر پُر سکون ہو گیا۔ میں اب بھی برابر تیرے جا رہا تھا۔ سمجھ میں کُچھ نہ آتا تھا کہ اب کیا کروں؟ سمندر مُجھے نگل لینے کے لئے بے تاب تھا اور آسمان پر منڈلاتے ہوئے گِدھ میری بوٹیاں نوچنے کے لئے تیار!

مُختصر یہ کہ ایک وقت ایسا آ گیا جب کہ میرے بازو بالکل شل ہو گئے۔ ہمّت جواب دینے لگی۔ بھوکی لہریں بے تابی سے اپنے خوفناک مُونہہ کھول کر میری طرف لپکنے لگیں اور گِدھ آہستہ آہستہ قریب آنے لگے۔ میں نے پھر اپنی رہی سہی ہمّت کو جمع کر کے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش

کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہاتھوں کا اب دم نکل گیا ہے۔ میرے نزدیک اب یہ آخری وقت تھا۔ میں دِل ہی دِل میں بھگوان کو یاد کرنے لگا اور پھر یہ سوچ کر کہ گِدھوں کی خونخوار چونچوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ سمندر کے اندر ڈوب جاؤں اور فوراً ہی میں نے پانی کے اندر ایک ڈبکی لگائی۔

ڈبکی لگاتے ہی اچانک ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر ہتھوڑا مارا ہو! میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ بڑھائے تو کوئی سخت سی چیز میرے ہاتھوں کو لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ٹوٹا ہوا تختہ ہے جو سمندر میں بہتا ہوا چلا جا رہا ہے، اچانک مُجھ میں نہ جانے کہاں سے طاقت آ گئی۔ میں نے جلدی سے اس تختے کو پکڑ لیا۔ تختہ کافی بڑا تھا۔ جوں توں کر کے، بڑی مُشکل سے میں اس تختے پر سینے کے بل چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ تختے کو دونوں ہاتھوں سے میں نے یوں پکڑ لیا جیسے وہ کوئی قیمتی چیز ہو۔ اور قیمتی چیز وہ تھی بھی۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ یہ تو پھر ایک تختہ تھا۔

شاید رات بھر میں اسی تختے سے چمٹا ہوا بہتا رہا۔ حتّٰی کہ صُبح ہو گئی۔ تختے سے چمٹنے کے بعد اتنا تو ہوا کہ میری جو طاقت زائل ہو رہی تھی وہ اب مُجھ میں پھر سے آ گئی۔ صُبح کی روشنی میں میں نے ہر طرف دیکھا، جہاں تک نظر جاتی تھی بس وہاں تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔ میری جان بچ تو گئی تھی مگر میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کب تک اور زندہ رہ سکوں گا۔ کیوں کہ صرف اس تختے ہی سے تو میری جان نہیں بچ سکتی تھی۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے روٹی، پانی اور زمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور یہ سب کُچھ اس وقت میرے پاس نہیں تھا۔ بھوک کے مارے میری جان نکلی جا رہی تھی۔

انسان کسی اور طریقے سے مر رہا ہو تو اسے اتنی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ مگر بھوک سے بِلک بِلک کر مرنے کی تکلیف ایسی ہے کہ میں بیان نہیں کر

سکتا۔ کافی دیر تک میں اُس تختے سے چِمٹا ہوا بہتا رہا۔ میری طاقت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ گِدھ اب بھی میرے اوپر منڈلا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ بس اب تو بھگوان ہی مالک ہے۔ ہر لمحہ مُجھے یہ انتظار رہنے لگا کہ اب کسی گِدھ کی چونچ نے میری کمر کی بوٹی نوچی اور اب نوچی۔۔۔

میں بھوک اور کمزوری کی وجہ سے اب تقریباً بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ پانی کی کوئی لہر میرے اوپر سے گزرتی تو مُجھے یہی محسوس ہوتا کہ یا تو یہ گِدھ کی چونچ ہے یا پھر کسی خوفناک مچھلی نے میرے جسم کو اپنے مُونہہ سے چھوا ہے۔ میں کراہ کر ایک چیخ مارتا اور اپنا سر پٹختا مگر افسوس کہ حالات کے ہاتھوں میں اب میں مجبور تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور دِل ہی دِل میں سوچ رہا تھا کہ یہ میرے کون سے کرموں کا پھل ہے۔ میں نے تو آج تک کسی کو دکھ نہیں دیا!

کئی گھنٹے اسی حالت میں گزر گئے۔ اب میرے احساس کا جذبہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ کوئی اگر میرے سوئی بھی چبھو دیتا تو مُجھے پتہ نہ لگتا۔ میری آنکھیں بند تھیں، دماغ سو چکا تھا۔ کبھی کبھار آنکھیں کھولتا تو دماغ جاگ کر اتنا احساس ضرور دلاتا کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ شاید ایسا ہی کوئی لمحہ تھا جب کہ کسی نے میرے جسم کو چھوا، پہلے تو میں سمجھا کہ کسی گِدھ یا مچھلی نے مُجھے لقمہ بنانے کا ارادہ پختہ کر لیا ہے۔ مگر فوراً ہی معلوم ہوا کہ یہ تو کسی کا ہاتھ ہے! کوئی میری ہی طرح تختے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا!

میں سمجھ گیا کہ یقیناً یہ کُچھ آدم خور جنگلی ہیں جو تیرتے ہوئے سمندر میں آ گئے ہیں۔ یہ مُجھے پکڑ کر لے جائیں گے اور پھر میرے گوشت کو بڑے اطمینان سے بھون بھون کر کھائیں گے۔ یہ سوچتے ہی میں نے ایک بھیانک چیخ ماری اور پھر مُجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا؟

جب ہوش آیا تو دیکھا کہ میں ایک جزیرے میں گیلی اور نرم ریت پر لیٹا ہوا

ہوں اور میرے اوپر نیلا آسمان ہے، ذرا نظروں کو نیچا کر کے دیکھا تو مُجھے ناریل کے لمبے لمبے درخت آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آئے جب میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں تو اچانک برابر سے کسی نے کہا۔

"اب تم کیسے ہو دوست؟"

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا تو ایک خوب صورت نوجوان کو اپنے برابر بیٹھے ہوئے پایا۔ اس نے جلدی سے ایک ٹوٹے ہوئے ناریل کا پانی میرے حلق میں ٹپکایا۔ اس سے کُچھ جان مُجھے اپنے جسم میں آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس خوبصورت شخص کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے مُسکرا کر کہنا شروع کیا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ تم نہیں ہوتے تو میں مر گیا ہوتا اور میں نہ ہوتا تو تم سمندر کی مچھلیوں کی خوراک بن

گئے ہوتے۔"

میں نے جب اس شخص سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے تو اس نے مُجھے بتایا کہ اس کا نام امجد ہے۔ وہ بمبئی کے ایک کروڑ پتی شخص کا بیٹا ہے۔ مالک فیروز کی طرح اس کے باپ کے جہاز بھی دور دراز ملکوں میں جاتے ہیں۔ باپ کی ہی طرح بیٹے کو بھی سمندر کے سفر کا بڑا شوق ہے۔ اپنے ذاتی اسٹیمر میں ایک دِن وہ اکیلا ہی سمندر میں گھومنے کے لئے نکل پڑا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ پٹرول کی ٹنکی میں پٹرول بس برائے نام ہی ہے۔ کافی دور آنے کے بعد جب تیل ختم ہو گیا تو وہ بہت گھبرایا۔ رات ہونے والی تھی اور وہ ساحل سے بہت دور تھا۔ اچانک سمندر میں ایک خوفناک طوفان آگیا۔ (اور شاید یہ وہی طوفان تھا جس میں پہلے ہم سب بھی گھِر گئے تھے) اس کا اسٹیمر اِدھر اُدھر ڈولنے لگا۔ اور پھر اُس کا بھی وہی حشر ہوا جو ہمارے اسٹیمر کا ہوا تھا۔

اسٹیمر کے تختے ہوا کے زور سے اکھڑنے لگے۔ اور آخر کار امجد نے ایک ٹوٹے ہوئے تختے کے سہارے اپنی جان بچائی۔ مگر اسے اتّفاق کہہ لیجئے کہ وہ تختہ کمزور تھا۔ ایک رات اور ایک دِن کے بعد اس تختے نے امجد کا وزن سہارنے سے انکار کر دیا اور چرچرا کر ٹوٹ گیا۔ اب بے چارہ امجد تھا اور وہ خوفناک بپھرا ہوا سمندر۔ وہ تو یوں کہیئے کہ خوش قسمتی سے امجد بڑا ماہر تیراک ہے، جوان ہے اور مُجھ بُوڑھے شخص کے مُقابلے میں کافی دیر تک تیر سکتا ہے۔ اس نے اپنی ہمّت کے بل بوتے پر اس بپھرے ہوئے سمندر کا مُقابلہ کیا۔ اس عرصے میں وہ کس طرح تیرتا رہا؟ یہ تو آپ اسی سے پوچھیئے گا۔

میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جب میرا آخری سانس نکلنے والا تھا تو امجد کے ہاتھ نے مُجھے دوبارہ زندگی دے دی۔ اس نے مُجھے تختے پر بہتے دیکھ کر خود بھی اس تختے کو پکڑنے کی کوشش کی اور جب تختے کو پکڑ لیا تو پھر اس پر

چڑھ گیا۔ اپنے اسٹیمر کے ٹوٹنے سے پہلے امجد نے چونکہ کھانے کا تھیلا، پانی کی چھاگل اور اپنے ہتھیار واٹر پروف تھیلے میں رکھ کر تھیلا اپنی کمر سے باندھ لیا تھا اس لئے یہ چیزیں تب میری زندگی بچانے کے کام آئیں۔ اس نے تختے پر آتے ہی سب سے پہلے مُجھے دیکھا۔ میرے جسم میں سانس کی رفتار کو محسوس کر کے اس نے جلدی سے پانی کی چھاگل نکالی اور تھوڑا سا پانی مُجھے سیدھا کر کے میرے حلق میں ٹپکایا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح میرے مُردہ جسم میں پھر سے جان آ گئی ہو۔ میں شاید پھر بے ہوش ہو گیا۔ امجد نے بعد میں مُجھے بتایا کہ ہم دونوں دو دِن تک اسی تختے پر بہتے رہے۔ آخر خُدا خُدا کر کے یہ جزیرہ نظر آیا۔ اپنے ہاتھوں سے چپّوؤں کا کام لے کر امجد نے تختے کو بڑی مشکل کے بعد اس جزیرے کے ساحل تک پہنچایا۔ اور ٹوٹے ہوئے ناریلوں کا پانی پلا کر مُجھے ہوش میں لے آیا۔

کیوں امجد صاحب میں نے ٹھیک کہا ناں؟"

"جی ہاں۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔" امجد نے جواب دیا۔

"خیر تو اس کے بعد ایسا ہوا کہ میں نے اُٹھ کر پورے ساحل کی طرف نظر دوڑائی۔ امجد کا میں نے شکریہ ادا کیا کہ اِن کے طفیل میری جان بچی۔ مگر اس کے ساتھ ہی مُجھے آپ سب کا خیال ستائے جا رہا تھا۔ بے بی اور بابا مُجھے بُری طرح یاد آ رہے تھے۔ مُجھے کُچھ معلوم نہ تھا کہ آپ لوگوں پر کیا بیتی؟ امجد کو جب میں نے یہ سب باتیں بتائیں تو انھوں نے مُجھے تسلّی دی اور مُجھ سے کہا کہ آؤ ہم دونوں مل کر ساحل پر گھومیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی جہاز اس طرف آتا ہوا دِکھائی دے جائے۔ اس طرح اسے اشارہ کر کے ہم مدد حاصل کر سکتے ہیں۔

بات معقول تھی اس لئے ہم دونوں بڑی بے تابی کے ساتھ ساحل کے گیلی ریت پر گھومنے لگے۔ سمندر کی لہریں دور سے اچھلتی کودتی آتیں اور

پھر ساحل کے ریت کو اپنے ساتھ لے کر سمندر میں واپس چلی جاتی۔ میں غور سے لہروں کے اس کام کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک مُجھے ایک رسّی نظر آئی جو گیلی ریت پر لکڑی کی ایک میخ سے بندھی ہوئی سمندر کے اندر جا رہی تھی۔ مُجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس غیر آباد جزیرے پر رسّی کا اس طرح بندھا ہونا دراصل اس بات کا ثبوت تھا کہ جزیرے میں انسان موجود ہیں۔ کیوں کہ بندروں کو اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ ریت میں میخ ٹھونکیں اور پھر رسّی کی گرہ لگائیں۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو مُجھے یہ جستجو ہوئی کہ آخر رسّی میں کیا چیز بندھی ہے؟ میں نے رسّی کو آہستہ آہستہ پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس سے کوئی مچھلی بندھی ہوگی جسے زندہ رکھنے کے لئے کسی نے سمندر میں لٹکا دیا ہوگا۔ مگر یہ دیکھ کر مُجھے اچنبھا ہوا کہ رسّی سے ایک چھوٹا سا ڈبّہ بندھا ہوا ہے۔ بڑے اشتیاق کے عالم میں میں نے اِس ڈبّے کو کھولا۔

اس میں جو چیز تھی اسے دیکھتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس چیز کو میں اپنے پہلے سفر میں دیکھ چکا تھا۔ یہ سوبیا دھات تھی۔ سوبیا دھات کی اِس جگہ موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ یا تو زہرہ کے لمبے لوگ یہاں موجود ہیں یا پھر جان اور جیک صاحبان۔ ہم اِن دونوں کو ڈھونڈنے کے لئے ہی بمبئی سے چلے تھے اور سوبیا ظاہر ہے کہ اِن دونوں ہی کے پاس تھی۔"

"شاباش!۔۔مُجھے تمہاری عقل کی داد دینی پڑتی ہے سوامی۔۔۔" جان نے آہستہ سے کہا۔

"واقعی تُم نے بہت اچھّی بات سوچی۔" بلونت کی آواز آئی۔

"اچھّا پھر کیا ہوا۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں جیسے پاگل ہوگیا۔۔۔"

سوامی نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔۔۔

"امجد کو میں نے جلدی جلدی پچھلی تمام باتیں بتائیں اور اِن سے کہا کہ وہ بھی اس جزیرے میں جان اور جیک صاحب کو تلاش کرنے میں مدد کریں۔ ہم دونوں بڑی دیر تک اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ اور پھر آخر ایک جگہ آ کر رُک گئے۔ حیرت، خوف اور تعجّب کی وجہ سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیوں کہ ریت پر بہت سے لوگوں کے قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ ایک دو جگہ مُجھے بڑے عجیب سے پیروں کے نشان بھی دکھائی دئیے۔ میں حیران تھا کہ یہ کس کے قدموں کے نشان ہیں۔ ان قدموں کے نشانوں کو دیکھ کر ہم دونوں اِن نشانوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چلتے چلتے اچانک میں ٹھٹھک گیا۔ میری نظر ناریل کے ایک درخت کے تنے پر گئی۔ میں نے دیکھا کہ چاقو کی مدد سے کسی نے اس پر سمت کا نشان بنایا ہوا ہے۔ درخت کے تنے کے نیچے

ہی پتھرّوں کی ایک ڈھیری تھی۔ جس کی ایک خاموش زبان تھی۔ بابا اور بے بی کے ساتھ چونکہ میں اسکاؤٹوں کا یہ کھیل بہت کھیل چکا تھا۔ اِس لئے ان نشانوں کو دیکھتے ہی میری باچھیں کِھل گئیں۔ خُوشی کے باعث میں دیوانہ ہوگیا اور اسی دیوانگی کی وجہ سے میں اُچھلنے کودنے لگا۔

پتھرّوں کی وہ ڈھیری دراصل کہہ رہی تھی کہ بے بی اور بابا اس جنگل میں اندر کے طرف گئے ہیں۔ امجد صاحب سے میں نے کہا کہ ہمیں فوراًاِن کی تلاش میں چل دینا چاہیئے۔ میں نے سوبیا کا ڈبّہ اپنے ہاتھ میں لٹکا لیا۔ چاقو میرے پاس تھا ہی، امجد صاحب نے اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا۔ اور پھر ہم دونوں بڑی احتیاط کے ساتھ جنگل میں اندر ہی اندر بڑھنے لگے۔ یہاں پہنچتے ہی مُجھے ایک عجیب سی آواز سُنائی دی جو شاید کسی گھنٹے کی تھی۔ یہ آواز بڑی ڈراؤنی اور خوفناک تھی۔ درختوں کے تنوں پر اور نیچے زمین پر مختلف نشان دیکھتا ہوا میں صحیح راستے پر چلتا رہا۔ قدموں کے نشان مُجھے بتا رہے

تھے کہ اختر اور نجمہ کے ساتھ ہی مالک فیروز بلونت اور تین آدمی اور اِس

طرف گئے ہیں۔

بعد کے تین آدمیوں میں سے ایک کے قدموں کے نشان بڑے عجیب

اور ڈیڑھ فٹ لمبے تھے۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ شاید اس جزیرے میں

رہنے والے جنگلیوں نے آپ سب کو پکڑ لیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں

نے اپنی رفتار تیز کر دی کہیں پر بھی دم نہیں لیا۔ بس آندھی اور طوفان کی

طرح آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ جس وقت میں جنگل کے آخری سِرے پر

پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ گھنٹے کی آواز میرے کانوں میں برابر آ رہی تھی۔

جب میں اس گھنٹے کے قریب والی جھاڑیوں میں پہنچ گیا تو میں نے چاند کی

ہلکی روشنی میں ایک دِل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ جیک صاحب کو ایک

خوفناک قوم قتل کرنے والی تھی۔ امجد صاحب کو یہ دیکھتے ہی میں نے اشارہ

کیا اور پھر ہم دونوں تیزی سے لپکے ہوئے آگے بڑھے۔ اور پھر اچانک

ایک عجیب بات ہوئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ قوم بھیانک چیخیں مارتی ہوئی زمین پر گرنے لگی۔ جیک صاحب کو میں نے اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ وہ چبوترے پر سے کودے اور ایک سمت آپ سب کو لے کر بھاگے۔ میں نے بھی آگے بڑھنا چاہا مگر امجد صاحب نے روک دیا۔ انہوں نے مُجھ سے کہا کہ بھاگنے کے بجائے ہمیں آہستہ آہستہ بغیر کوئی آواز نکالے چلنا چاہیئے۔

میدان کا چکّر کاٹ کر ہم آپ سب تک پہنچ جائیں گے۔ میں نے اِن کا کہا مان لیا۔ ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کہ اچانک سامنے کی جھاڑیاں ہلیں اور ایک بندر ہمارے سامنے آکر پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا بات تھی؟ بندر کہاں سے آیا اور کیوں آیا۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو اس کے گلے میں ایک پرچہ بندھا ہوا تھا۔ مُجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ ہمیں آگے بڑھتے دیکھ کر بندر نے بھاگنا چاہا،

مگر میں نے اسے پکڑلیا اور پھر جلدی سے اس کے گلے سے بندھا ہوا پرچہ نکال کر امجد صاحب کو دیا کہ اِسے پڑھیں۔ انہوں نے فوراً تھیلے میں سے ماچس نکال کر ایک تیلی جلائی اور پرچہ کا مضمون پڑھا۔ مُجھے تعجّب تو بہت ہوا مگر وہ وقت تعجّب کرنے کا نہ تھا۔

میں نے فوراً سوبیا کا ڈبّہ بندر کے گلے سے باندھ دیا اور پھر وہ بندر تیزی کے ساتھ واپس بھاگ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میرے مالک فیروز اور جان صاحب یہاں مُصیبت میں بتلا ہیں۔ ان کی مدد کے خیال سے میں بھی بندر کے پیچھے پیچھے بھاگا اور پھر جو کُچھ ہوا وہ آپ سب جانتے ہی ہیں۔"

اتنا کہہ کر سوامی خاموش ہو گیا۔ ہم سب نے پھر باری باری امجد سے مصافحہ کیا۔ اسے تسلّی دی کہ اگر خُدا نے چاہا تو ہم لوگ کسی نہ کسی طرح بمبئی ضرور پہنچیں گے۔ امجد سے ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں یہ جان کر بہت خوش تھا کہ امجد امتیاز صاحب کا لڑکا ہے جو میری ہی طرح بمبئی میں

ایک جہازی کمپنی کے مالک ہیں۔ جب کافی باتیں ہو چکیں تو امجد نے کہا۔

"صاحب مُجھے تو سب سے زیادہ حیرت بندر پر ہے۔ اِسے اختر اتنی دیر میں سدھالے گا، اس کی تو شاید آپ کو بھی اُمّید نہ ہوگی۔"

"واقعی یہ اچنبھے کی بات ہے۔" سوامی نے کہا۔

"بندر کو تو جنگل میں آ جانے کے بعد پھر واپس اختر کے پاس نہیں جانا چاہیئے تھا۔ بندر جنگلی ہے، بھلا کس طرح وہ قابو میں آ سکتا ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے سوامی چاچا۔" اختر نے آہستہ سے کہا۔

"میں اِس سے بڑی محبّت کرتا ہوں۔ محبّت سے تو لوہا بھی پگھل سکتا ہے یہ تو پھر جانور ہے۔ میں نے بہت سے اشارے اِسے سِکھا دئیے ہیں۔ میں جو کہوں گا اب یہ وہی کرے گا۔ گھر میں بھی میں نے گلہری اور رینا پالی ہوئی ہے۔ وہ دونوں بھی میرے کہنے پر چلتی ہیں۔ اُمّید تو مُجھے بھی نہیں تھی کہ

بندر کو چھوڑ دینے کے بعد واقعی وہ واپس بھی آ جائے گا۔ مگر یہ سب خُدا کی مہربانی ہے، وہ ہم پر مہربان تھا تو یہ بندر بھی ہو گیا۔ اس میں تعجّب کی کوئی بات نہیں۔" اتنا کہہ کر اُس نے شاید بندر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بندر کی خوں خوں کی آوازیں مُجھے ایک دو بار سُنائی دیں اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد ہم سوچنے لگے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ رات ہو چکی تھی اور ہم لوگ تھکے ہوئے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ ہمیں یہیں رات گزارنی چاہیئے، مگر بلونت اور سوامی ہمارے ہم خیال نہ تھے، بلونت نے کہا۔

"اگر ہم رات یہیں گزاریں گے تو جکاری کسی بھی وقت ہمیں پھر پکڑ سکتے ہیں۔"

"ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔" جان نے کہا۔ "جب تک ہمارے پاس سوبیا ہے وہ ہمیں نہیں پکڑ سکتے۔"

"یہ بات میں نہیں مانتا، دُشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیئے۔ سوبیا کی کرنوں سے وہ عارضی طور سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ مگر مُمکن ہے کہ کُچھ عرصے بعد وہ اس کا توڑ تلاش کر لیں اور پھر ہمیں آ دبوچیں۔ نہیں جان صاحب میرے خیال میں یہاں بسر کرنا عقل مندی نہیں ہے۔" بلونت نے جواب دیا۔

"بلونت ٹھیک کہہ رہے ہیں مالک۔" سوامی نے مُجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہیئے۔"

بڑی لمبی چوڑی بحث کے بعد آخر کار یہی طے پایا کہ ہم لوگوں کو رات کے اندھیرے ہی میں اس منحوس مقام سے چل دینا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہی ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ ٹارچ کی روشنی میں ہم اختر اور نجمہ کے لگائے ہوئے نشانوں کو دیکھتے ہوئے آخر کار جنگل کے آخری سِرے پر پہنچ گئے۔

واپسی میں ہمیں نسبتاً کم وقت لگا۔ جاتے وقت جو جھاڑ جھنکاڑ راستے میں پڑے تھے وہ ہم نے صاف کر دیئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہم جلدی واپس آ گئے۔ جنگل پار کرتے ہی چاند کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے ساحل کے پاس آتے ہی ہر طرف نظر دوڑائی۔ ناریل کے وہ درخت جن کے جھنڈ میں ہم نے کشتی چھپائی تھی اب کُچھ زیادہ دور نہیں تھے۔ یہاں آتے ہی بلونت نے مُجھ سے کہا کہ واپسی کا سفر نہ جانے کیسا ہو؟ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم ناریل اور کیلے توڑ کر کشتی میں رکھ لیں۔ کیوں کہ سفر میں ہمیں بھوک اور پیاس ضرور لگے گی۔ بات معقول تھی اس لئے جان سے مشورہ کرنے کے بعد ہم نے یہ سب سامان کشتی میں رکھ لیا۔ اس کے علاوہ اور ضروری چیزیں بھی کشتی میں حفاظت سے رکھ دیں۔ کشتی چھپانے کی پہلی احتیاط بہت کام آئی۔

کیونکہ کشتی ہمیں اسی حالت میں ملی جس میں کہ ہم اسے پہلے چھوڑ گئے

تھے۔ شاید رات کے دو بجے تھے جب کہ ہم آٹھ آدمی کشتی میں بیٹھ رہے تھے۔ بلونت اور امجد نے چپّو چلانے کا کام اپنے ذمّہ لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر لکڑی کی میخ سے بندھی ہوئی کشتی کی رسّی کاٹ دی تاکہ کشتی آسانی سے آگے بڑھ سکے۔ ابھی یہ کام میں کر ہی رہا تھا کہ اچانک جنگل میں سے عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ بلونت نے فوراً چلّا کر کہا۔

"فیروز صاحب۔۔ ہوشیار۔۔۔ جکاری ایک خاص قسم کا لباس پہنے ادھر آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لباس ہی سوبیا کا توڑ ہے۔"

میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو حیرت اور خوف کی وجہ سے جسم لرزنے لگا۔ پندرہ بیس جکاری اپنے ہاتھ بڑھائے جنگل میں سے ساحل کی طرف آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جان نے کہا۔

"جلدی کرو فیروز۔ ہمیں جلد سے جلد یہ ساحل چھوڑ دینا چاہیئے۔ دیر مت کرو، جلدی کرو جلدی۔"

گھبرا کر میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ ایک ایک چپّو کو چلانے کے لئے دو دو آدمی تیّار ہو گئے۔ جکاریوں نے ہمیں ساحل چھوڑتے دیکھا تو وہ تیزی سے ہماری طرف آنے لگے۔ امجد نے غُصّے میں آ کر اپنے پستول سے تین چار فائر بھی کئے، مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، گولیاں جکاریوں کا کُچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ جب وہ خوف ناک قوم ساحل کے پاس پہنچی تو اپنے شکار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ساحل کی ریت اپنے سر پر ڈالنے لگی۔ یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ ہم لوگ اب ساحل سے قریب قریب پچاس گز دور تھے۔ اور جکاری غُصّے اور جلن کی وجہ سے وہاں کھڑے عجیب عجیب حرکتیں کر رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ کشتی ساحل سے دور ہوتی گئی اور پھر آخر وہ وقت آ گیا جب کہ وہ خوفناک جزیرہ ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔

میں نے خُدا کا شُکر ادا کیا کہ ایک بہت بڑی مُصیبت سے نجات ملی۔ قطب نما چونکہ ہمارے پاس پہلے ہی سے نہیں تھی اس لئے ہمیں یہ معلوم ہی نہ

تھا کہ اب ہم دُنیا کے کون سے حصّے میں ہیں؟

آپ سب جو میرے اس سفر نامے کو دِل چسپی سے پڑھ رہے ہیں شاید یہاں تک پہنچ کر سوچیں گے کہ میری کہانی ختم ہونے والی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے، مُجھ پر جو مصیبتیں پڑیں اور جو دہشت ناک واقعات مُجھے پیش آئے، ابھی تو اس کا اتنا سا حصّہ بھی میں نے بیان نہیں کیا ہے۔ کاش مُجھے معلوم ہوتا کہ کالی دنیا کے اس سفر میں میرے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے تو میں کبھی اس سفر کا نام تک نہیں لیتا۔ مگر غیب کا حال سوائے خُدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے میں اس بات سے بالکل لاعلم تھا کہ آگے کیا ہونا ہے!

مگر اس کا جواب فوراً ہی مل گیا۔ رات کے شاید تین بجے تھے، ہماری کشتی ایک نامعلوم سمت میں چلی جا رہی تھی۔ صُبح کو سورج نکلنے کے بعد ہی صحیح سمت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اب تو ہم صرف اندازاً ہی کشتی چلا رہے

تھے۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور سمندر پُر سکون تھا۔ اختر اور نجمہ سو رہے تھے۔ البتّہ باقی سب جاگ رہے تھے۔ اچانک ایک ہلکا سا سراٹا ہوا میں بُلند ہوا۔ اس سراٹے کے ساتھ ہی ایک روشن شکل اس اندھیرے میں نمودار ہونی شروع ہوئی۔ جب یہ شکل مکمل ہو گئی تو ہم سب خوف و دہشت کے باعث ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے۔

یہ جیگا تھا!

شاید یہ پہلا موقع تھا کہ جب کہ وہ ہم سب کے سامنے ایک ہی وقت میں نمودار ہوا تھا۔ اس کی صورت اتنی خوفناک تھی کہ ہمارے دِل کانپ گئے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ہوا میں اٹھایا اور پھر بڑے ڈراؤنے لہجے میں بولا۔

"مسٹر جان! اپنے وفادار جکاریوں کو ختم کرنے کا بدلہ میں ضرور لوں گا۔ جس سوبیا پر آپ اتنا گھمنڈ کرتے ہیں وہ اب آپ کے کسی کام کی نہیں رہے گی۔ میں سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ اگر سمجھتے ہیں کہ مُجھ

سے بچ جائیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے۔۔ یاد رکھئے آپ کبھی بمبئی نہیں پہنچ سکتے۔۔ہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاہا۔۔۔"

اتنا کہہ کر خوفناک قہقہے لگاتا ہوا وہ آہستہ آہستہ ہوا میں غائب ہو گیا۔

ہمارے دِل دھک سے رہ گئے۔ خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظروں سے ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہم میں سے جس کسی نے جیگا کا صرف نام سُنا تھا، اس نے آج اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت تو امجد کو تھی۔ امجد کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا تھا کہ یہ پُراسرار چمکتا ہوا روشن خاکہ کس کا تھا، جیسے ہی یہ خاکہ غائب ہونا شروع ہوا میرے کانوں نے ایک زبردست دھماکے کی آواز سُنی۔ اور یہ دھماکہ امجد کے پستول سے بلند ہوا تھا۔ اس نے جیگا پر گولی چلا دی تھی۔ مگر جیسا کہ ہم پہلے ہی سے جانتے تھے، جیگا کے خوفناک روشن جسم کو گولی نے کُچھ بھی نقصان نہ پہنچایا۔ امجد کے باربار پوچھنے پر ہم نے اسے تمام باتوں سے آگاہ کیا۔ یہ

باتیں سن کر وہ کہنے لگا۔

"بڑی عجیب کہانی ہے۔ بالکل الف لیلہ جیسی باتیں سُنا رہے ہیں آپ!"

اس کے ساتھ ہی اس نے کہا، چونکہ وہ خود بھی خطروں میں کودنے کا شوقین ہے اس لئے اب وہ واپس بمبئی جانے کے لئے نہیں کہے گا۔ خواہ کوئی جہاز ہی نظر کیوں نہ آئے، وہ اس کے کپتان سے مدد کی درخواست نہ کرے گا، کشتی میں سفر کرنے والے لوگوں سے اسے عجیب سی اُنسیت ہو گئی ہے۔ (یہ الفاظ اس نے نجمہ کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا) اس لئے اب وہ اس کشتی ہی میں رہے گا اور جان کے ساتھ کالی دُنیا تک جائے گا۔

میں اُس کی باتیں سُن کر مسکرایا۔ نجمہ میری بیٹی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ کتنی شریف، کتنی خوبصورت اور کتنی بہادر تھی۔ میں دِل ہی دِل میں یہ سوچ کر خوش تھا کہ اب نجمہ کی حفاظت مُجھ اکیلے ہی کو نہیں کرنی پڑے گی بلکہ میرے اس کام میں امجد بھی برابر کا شریک ہو گیا ہے۔ نجمہ کی عُمر اب

ایسی تھی کہ جب کہ لڑکیوں کی شادی ہو جایا کرتی ہے۔ اور باپ کی حیثیت سے میں سوچ کر خوش تھا کہ مُجھے داماد تلاش کرنے کی اب کوئی خاص ضرورت پیش نہ آئے گی۔

میرا خیال ہے کہ میں بلا وجہ اپنی کہانی کو طویل کرنے لگا ہوں۔ مُجھے دراصل اپنے سفر کے بیان کو جاری رکھنا چاہیئے تھا۔ خیر کوئی بات نہیں، میں اب اصل مطلب کی طرف آتا ہوں۔۔۔

جیگا کے غائب ہو جانے کے بعد ہمارے دِل ڈوب سے گئے۔ جان کا خیال تھا کہ اب ہمیں کسی نہ کسی طرح کوئی دوسرا جزیرہ تلاش کرنا چاہیئے۔ جہاں خوراک بھی ہو، پانی بھی اور رہنے کی اچھّی جگہ بھی، اور جہاں آرام سے بیٹھ کر ہم اپنا اگلا پروگرام سوچ سکیں۔ بلونت اور سوامی کی رائے تھی کہ جتنی جلد ہو سکے ہمیں کوئی جہاز تلاش کرنا چاہیئے جو ہم سب کو بمبئی، مدراس، یا کلکتہ پہنچا سکے۔ مگر جان اور امجد کا خیال سب سے الگ تھا۔ اور

یہ خیال وہی تھا جو میں پہلے لکھ آیا ہوں یعنی اگلا پروگرام سوچنا۔

جان چونکہ لیڈر تھا۔ اس لئے ہمیں مجبوراً اُسی کی باتیں ماننی پڑیں اور ہمارا سفر جاری رہا۔ ہم میں سے باری باری دو آدمی ایک ایک گھنٹہ چپّو چلاتے۔ جب وہ تھک جاتے تو ان کی جگہ تازہ دم آدمی آکر یہ کام شروع کر دیتے۔ ہماری کشتی اسی طرح ایک اَن جانی سمت آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر اب سوچتا ہوں تو دِل کانپ جاتا ہے۔ کاش یہ کشتی کسی اور طرف چل دیتی۔ کاش آگے پیش آنے والے وہ ہولناک واقعات ظہور میں نہ آتے جن کی یاد اب بھی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ مگر ایسا تو ہونا تھا۔ نہ ہوتا تو پھر یہ کہانی لکھنے کی نوبت ہی کیوں آتی؟

میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتلا سکتا کہ سمندر کے سینے پر ہم کتنے دِن تک بہتے رہے۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، میں صرف سورج کے چڑھنے اور اُترنے سے یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ شاید ایک ہفتے تک ہم اِسی

چھوٹی سی کشتی میں کسی ایسی سمت کی طرف بہتے رہے جس کا ہمیں پتہ نہیں تھا۔ اتنے بڑے سمندر میں ہماری کشتی کی حقیقت ایک چھوٹے سے تنکے کی تھی اور سمندر کی خوفناک لہریں اس کشتی سے لگاتار چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ اب ہم سب تھکے ہوئے تھے اور چپّو چلانے کی کسی میں ہمّت نہ تھی۔ کشتی لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ جِدھر چاہتیں اسے دھکیل کر لے جاتیں۔ یہ بات نہیں کہ ہم بھوک یا پیاس کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ کھانے کے لئے ہمارے پاس کافی سامان تھا۔ پانی اور ناریل بھی موجود تھے۔ مگر چپّو چلاتے چلاتے۔ ہم سب کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ اس کشتی میں بادبان تو تھے نہیں کہ کشتی ہوا کے رُخ پر ہی بہی چلی جاتی۔ یہ تو معمولی سی چھوٹی کشتی تھی جس نے میرے اپنے خیال میں تو اتنے آدمیوں کا وزن بھی بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا!

یہ حالت دیکھ کر جان نے کہا :

"فیروز! کیا تم بتا سکتے ہو کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں؟" میں نے بڑی ناامیدی کے ساتھ کہا۔

"میرا خیال ہے۔۔" بلونت نے کُچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہم لنکا کے جنوب میں کافی دور تک نکل آئے ہیں۔ اگر ہم کشتی کا رُخ پھیر کر شمال کی طرف کر دیں تو یقیناً ہم واپس بمبئی پہنچ سکتے ہیں۔"

"مشکل تو یہی ہے کہ یہ شمال کس طرح معلوم ہو؟" جان نے کہا۔

"سورج جس طرف ڈوبتا ہے اگر ہم اس طرف مُونہہ کر لیں تو ہمارے دائیں طرف شمال ہوگا۔" جیک نے جواب دیا۔

جان نے کُچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ "میں نے مان لیا کہ یہ ٹھیک ہے، لیکن سورج ڈوبنے کے بعد آپ سِمت کس طرح معلوم کریں گے۔ چاند اور ستارے بھی اِس سِلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ نہیں جیک،

تمہارا خیال غلط ہے۔ میں تو صرف ایک ہی بات سوچ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ ہمیں اپنا معاملہ خُدا کے سپُرد کر دینا چاہیئے کیوں کہ آڑے وقت میں خُدا کی ذات ہی انسان کو صحیح راستہ دکھاتی ہے۔"

آخر کار جان کی رائے پر ہی عمل کیا گیا۔ ہم لوگوں میں طاقت تو بے شک تھی مگر اتنی ہمّت نہ تھی کہ کشتی کے چپّو چلاتے۔ اس لیئے مجبوراً سب خاموشی سے اُچھلتی اور تڑپتی لہروں کو دیکھتے رہے۔ عجیب سی مچھلیاں ہماری کشتی کے چاروں طرف چکّر لگا رہی تھیں۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ یہ آدم خور مچھلیاں ہیں جو اپنی خوراک کی تلاش میں بے چینی کے ساتھ کشتی کا طواف کر رہی ہیں۔ میں نے نجمہ اور اختر کو سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ وہ پانی میں اپنا ہاتھ یا پیر نہ ڈالیں۔ کشتی اسی طرح چلتی رہی۔ ہم سب سفر کرتے رہے، سفر۔۔۔ طویل سفر۔۔۔ ایک نہ ختم ہونے والا سفر!

غالباً صُبح کے آٹھ بجے تھے جب کہ وہ حیرت انگیز اور خوفناک واقعہ پیش

آیا۔ لیکن جیسا کہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہو گا، اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو بعد میں ہم سب تباہی کے گڑھے میں لازمی گر گئے ہوتے۔

یہ در حقیقت خُدا کی طرف سے بروقت امداد تھی۔۔۔ ہماری کشتی دھیرے دھیرے آگے چلی جا رہی تھی۔ سمندر بالکل پر سکون تھا۔ آسمان صاف اور دھوپ چمکیلی تھی۔ میں خاموشی سے بیٹھا ہوا اُفق کو دیکھ رہا تھا جہاں سمندر اور آسمان مل رہے تھے۔ اچانک مُجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا آسمان میں کوئی چیز چمکی۔ پہلے تو میں اسے وہم سمجھا مگر جب مُجھے ایک مدھم سیٹی اور اس کے بعد ہلکا سا سرّاٹا سُنائی دیا تو میں نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک روشن اور پتلی سی لکیر آسمان میں سے نکل کر زمین کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی تارا ٹوٹا ہے۔ مگر جب میں نے اس لکیر کے پیچھے دھوئیں کی باریک سی لکیر دیکھی تو مُجھے بڑا تعجّب ہوا۔ وہ روشن سی چیز آہستہ آہستہ بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ

اس کی رفتار بہت تیز ہے۔

میرے ساتھ ہی اور سب بھی تعجّب اور خوف کے ساتھ اوپر دیکھنے لگے۔ امجد کا مُونہہ تو حیرت کی وجہ سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اختر اور نجمہ سمٹ کر بیٹھ گئے۔ اختر کا بندر زور زور سے چیخنے لگا۔ جیک اور بلونت کے چہروں پر بھی خوف جھلک رہا تھا۔ بلونت شاید زیادہ ڈر رہا تھا اسی لئے اس کا چہرہ خوف کے باعث پیلا پڑا ہوا تھا۔

میں نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ روشن چیز ہماری ہی طرف آرہی تھی۔ میں اب صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ دراصل شہابِ ثاقب جیسی کوئی چیز تھی۔ آگے سے کرکٹ کی گیند کی طرح گول اور پیچھے سے مخروطی۔ دھواں اس میں سے اب بھی برابر نکل رہا تھا۔ جوں جوں وہ قریب آتی جارہی تھی اس کا حجم بھی بڑھتا جارہا تھا۔ جان نے یہ دیکھتے ہی چلا کر کہا۔

"خبردار۔۔۔۔۔سب لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ یہ گولا شاید ہمیں ہی تباہ کرنے کے لئے آرہا ہے۔"

"مگر یہ ہے کیا چیز۔۔۔؟" بلونت نے خوف کی وجہ سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"میں ابھی کُچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"اس میں سے تو آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"مالک یہ تو کوئی بہت خوفناک چیز معلوم ہوتی ہے۔" سوامی نے ڈر کی وجہ سے لرزتے ہوئے کہا۔

"اِس کا رُخ تو ہماری ہی طرف ہے۔" اختر کپکپانے لگا۔

"اب کیا ہو گا ابّا جی۔" نجمہ بھی بہت بے قرار تھی۔

"آپ گھبرائیے مت۔" امجد نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس چیز سے کوئی نقصان نہ پُہنچے گا۔"

مگر دِلوں کو کوئی لاکھ ڈھارس اور تسلّی دے دیتا، اندرونی طور پر بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آگ کا وہ دہکتا ہوا گولا لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے چاروں طرف آگ کے ست رنگے شُعلے ناچ رہے ہیں۔ جوں جوں وہ قریب آتا جا رہا تھا اس کی آواز اور سراٹا بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم سب سے اب وہ صرف تقریباً ایک ہزار گز دور تھا۔ مگر اس کی تیز رفتاری کے آگے یہ فاصلہ کُچھ بھی نہ تھا۔ ہاتھی کے پیٹ جتنا بڑا یہ جہنّمی گولا اب تیر کی طرح ہم سب کی طرف آ رہا تھا۔ سوامی چیخ چیخ کر بھگوان کو یاد کر رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بھی دعائیں کانپ رہی تھیں اور میں نے دونوں بچّوں کو اپنے قریب کر لیا تھا۔ بلونت کشتی کے بالکل پیچھے گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسی کہ شتر مرغ کی دُشمن کو دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر شتر مرغ اپنا

سر ریت میں دبا لیتا ہے۔

امجد اور جیک بھی کشتی میں آہستہ آہستہ جھکتے جا رہے تھے۔ جان کے بھی چھکّے چھوٹے ہوئے تھے اور اس کی سمجھ میں بھی شاید کُچھ نہ آ رہا تھا۔ بڑی بے بسی اور نا اُمّیدی کے عالم میں وہ باری باری ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔

آگ کا وہ گولا ایک ہیبت ناک آواز نکالتا ہوا ہماری کشتی سے کوئی دس گز آگے جا کر گِرا۔ اس کے گِرتے ہی پانی میں ایک گڑھا پیدا ہوا اور اس گڑھے کی وجہ سے ایک زبردست تلاطم بھی، جس نے کشتی کے پچھلے حصّہ کو اس طرح اوپر اچھّال دیا جس طرح گیند جھٹکا کھا کر اوپر اُچھلتی ہے۔ ہم سب پہلے ہی سے کشتی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ مگر شاید بلونت نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس لئے کشتی کے زور میں وہ بھی اوپر کی طرف اچھلا۔ اس کے ہوا میں بُلند ہوتے ہی ہماری کشتی پانی کے زور سے اچانک بائیں طرف مُڑ گئی۔ بلونت کشتی میں واپس گِرنے کی بجائے اب

سیدھا پانی میں گِرا۔ اوپر اُٹھتی ہوئی بھوکی لہریں اس پر اچانک پل پڑیں۔ جیک نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی مگر زیادہ کوشش کرنے کا یہ موقع نہ تھا۔ ویسے بھی ہمیں یہ بات بعد میں معلوم ہوئی کہ بلونت سمندر میں گر گیا ہے۔ اس وقت تو ہم سب کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔ آگ کا وہ گولا سمندر میں گرتے ہی اس طرح بجھ گیا جس طرح کوئلہ بجھ جاتا ہے۔ جیک نے اب چلانا شروع کیا:

"بلونت سمندر میں ڈوب گیا۔ جان صاحب، بلونت ڈوب گیا۔"

اور یہ سُنتے ہی سوامی نے جلدی سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے دیکھا کہ سوامی نے بلونت کو تلاش کرنے کے لئے غوطہ لگایا۔ اچانک گڑگڑاہٹ کی سی آواز آنے لگی۔ میں نے اپنی نظر فوراً اس طرف کی جِدھر سے یہ آواز آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پانی میں سے ہاتھی سے بھی بڑا ایک سنہری گولا اب آہستہ آہستہ اوپر ابھر رہا تھا۔ ہم بلونت کو دیکھتے یا اس

گولے کو جس میں شاید ہم سب کی موت اندر بیٹھی ہوئی قہقہے لگا رہی تھی۔

گولے کے اوپر آتے ہی سمندر کا وہ تلاطم ختم ہو گیا۔ ہم سب سانس روکے ہوئے آسمان سے آئی ہوئی اس عجیب چیز کو دیکھ رہے تھے۔ رنگ اس کا بے شک سنہری تھا مگر اس کے چاروں طرف ہلکے سُرخ رنگ کا کُہرا حرکت کر رہا تھا۔ امجد نے جیسے ہی پستول کا رُخ اس گولے کی طرف کیا جان نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چیخ کر کہا۔

"کیا کرتے ہو، خبردار خاموش کھڑے رہو۔"

میں نے خود بھی امجد کو اس کام سے باز رکھا۔ خُدا معلوم وہ کیا شے تھی؟ ممکن ہے کہ اس پر گولی پڑنے سے کوئی حادثہ پیش آ جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ چیز دراصل ہمیں نقصان پہنچانے نہ آئی ہو۔ لیکن گولی کھانے کے بعد وہ نقصان پہنچائے بغیر ہرگز نہ رہتی۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک کھڑکھڑاہٹ سی ہمیں سُنائی دی۔ اس سنہرے گولے نے

آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ جب وہ ہماری کشتی سے کوئی نو گز دور رہ گیا تو وہ رُک گیا۔

اس کے بعد ایک حیرت ناک بات ہوئی۔ گولا درمیان میں سے خربوزے کی طرح پھٹنے لگا۔ اس عمل کے ساتھ ہی اس میں سے ایسی آواز آنے لگی۔ جیسے اندر کئی مشینیں چل رہی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس میں سے کوئی عجیب سی مخلوق نکلے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ گولے کے دونوں گول کیواڑ دائیں بائیں ہٹ گئے اور پھر ہم نے ایک نرالا تماشا دیکھا۔

گولے کے اندر کی دیواریں اس طرح دہک رہی تھیں جیسے کوئلے دہکتے ہیں۔ دیواروں پر عجیب طرح کی کمانیاں لگی ہوئی تھیں۔ گولے کی سطح پر ایک نرالی میز رکھی تھی اور اس میز پر کوئی ایسی مشین رکھی تھی جسے شاید ہم میں سے کسی نے بھی دُنیا میں نہیں دیکھا تھا۔ اس مشین کے سامنے کا حصّہ بالکل ایسا تھا جیسا کہ سنیما کا پردہ ہوتا ہے۔ یہ پردہ بیضوی تھا۔ اس مشین

کے دائیں بائیں دو بلب لگے ہوئے تھے۔ بالکل اس قسم کے جیسے ہم نے جکاریوں کے جھونپڑی نما قید خانے میں دیکھے تھے۔ ان بلبوں کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ضرور یہ جیگا کی کارستانی ہے۔ اپنی دھمکی کو پورا کرنے کے لئے وہ اب عمل کے میدان میں آگیا ہے۔

میرے ساتھ ہی اور سب نے بھی یہی بات سوچی۔ ہم سمجھ گئے کہ بس اب ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔ یہ مشین ہمیں تباہ کرنے کے لئے آئی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف حسرت سے دیکھا۔ اس طرح جیسے اب اس کے بعد کبھی کسی کو نہ دیکھیں گے۔ اس کے بعد سانس روک کر ہم اس سنہری گولے کو دیکھنے لگے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک تیز اور کرخت سیٹی اس گولے میں سے بُلند ہوئی۔ مشین کے دونوں طرف لگے ہوئے وہ بلب جل اُٹھے۔ ان کی روشنی آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ اور پھر مشین کے دُودھیا پردے پر کُچھ آڑی ترچھی لکیریں ناچنے لگیں۔ یہ لکیریں

کُچھ ہی دیر بعد سِمٹ کر ایک تصویر بن گئیں۔ جب وہ تصویر کُچھ صاف نظر آنے لگی تو میں نے دیکھا جان اچانک دیوانہ وار تھوڑا سا آگے بڑھا اور پھر زور سے چیخا۔ ۔ ۔ "شاگو!"

"جی ہاں، میں شاگو ہوں۔ ۔ ۔ آپ تو اچھّے ہیں مسٹر جان؟" ان دونوں بلبوں سے آواز آئی۔

"کیا خاک اچھّا ہوں۔" جان نے بے زاری کے ساتھ کہا۔ "آپ دیکھ ہی رہے ہیں میری حالت۔"

"مگر یہ حالت زیادہ دیر نہیں رہے گی۔" شاگو نے کہا۔

"میں نے صرف آپ کو خطروں سے بچانے کے لئے چاندی کی تصویر والا یہ پردہ زہرہ سے بھیجا ہے۔ مُجھے آپ سب اچھّی طرح نظر آ رہے ہیں۔ مُجھے افسوس ہے کہ آپ ہم لوگوں کی وجہ سے اِس مُصیبت میں پھنسے۔"

"خیر اسے چھوڑئیے، آپ یہ بتلائیے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"آپ کو جو کُچھ کرنا ہے وہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ یہ تو آپ کو خود سوچنا ہو گا، البتّہ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ ہر آنے والے خطرے سے ہوشیار رہیں۔ میں بار بار آپ کی مدد کرنے نہیں آ سکوں گا۔ بڑی مشکل سے میں نے حساب لگا کر یہ معلوم کیا ہے کہ آپ کی کشتی اس وقت کہاں ہے۔ یہ خول جس میں چاندی کی تصویر والا آلہ بند ہے آپ کی دُنیا کے وقت کے لحاظ سے میں نے آج سے تین دِن پہلے زمین کی طرف چھوڑا تھا۔۔۔ اور آج مقرّرہ وقت پر یہ آپ تک پہنچا ہے۔"

"کمال ہے۔۔۔ اتنا صحیح اندازہ آپ نے کس طرح لگایا۔"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس چاندی کی تصویر والے آلے کی طاقت جلد ہی ختم ہو جائے گی اور پھر یہ سمندر میں ڈوب جائے۔ اس لئے میں مطلب کی بات آپ سے نہیں کہہ سکوں گا۔"

"فرمائیے، فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" جان نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میرا اور آپ کا دُشمن جیگا ہر وقت سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ہے۔ وہ آپ کو چین نہ لینے دے گا۔ ایسی ایسی باتیں اور ایسے ایسے واقعات آپ کو پیش آئیں گے کہ آپ اپنی زندگی سے عاجز آ جائیں گے۔ مگر میں آپ کو اس طاقت کی قسم دیتا ہوں جسے آپ پوجتے ہیں، آپ اس کام کو نہ چھوڑیں، ہم زہروی لوگوں کے لئے یہ موت اور زندگی کا سوال ہے۔"

"مگر شاگو صاحب یہ تو سوچئے کہ جیگا کی پُراسرار طاقتوں کے سامنے ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔"

"اِن طاقتوں سے ٹکرانے اور انہیں کُچلنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ آپ عقل استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں آپ کو ایک اور چیز

بھی دیتا ہوں یہ ایک چھوٹا سا ہار ہے جس کے درمیان میں آفاقی جڑا ہے۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ آفاقی کیا چیز ہے۔ بس آپ اس کا کرشمہ دیکھئے گا۔ یہ ہار آپ ان لوگوں میں سے جو اس وقت کشتی میں کھڑے ہوئے ہیں صرف اس شخص کو پہنا دیجئے جس کے چہرے پر کبھی بال نہیں اُگتے۔ اس شخص کے جسم کے غدود دراصل آفاقی کی طاقت کو بڑھاتے رہیں گے۔ وہ شخص جس کے چہرے پر بال اُگتے ہیں یا کبھی اگیں گے، اس کے جسم میں آفاقی کی طاقت کو بڑھانے والے غدود نہیں ہوتے۔۔۔ کیا آپ سمجھ گئے؟"

"جی ہاں میں سمجھ گیا، مگر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"اب میں کُچھ نہیں بتا سکتا، چاندی کی تصویر والے آلے کی طاقت بس اب ختم ہونے والی ہے۔ آپ جلدی سے کود کر یہاں آئیے اور اس خول کے بائیں طرف بنے ہوئے خانے میں ہاتھ ڈال کر آفاقی والا ہار نکال لیجئے۔۔

جلدی کیجئے جلدی۔۔۔"

اِس سے پہلے کہ جان شاگو کو کوئی جواب دیتا، میں فوراً سمندر میں کود پڑا۔ میں نے سوچا تھا کہ جان بُوڑھا ہے، اس لئے اسے سنہری خول تک پہنچنے میں دیر لگے گی۔ مگر میں جلد پہنچ جاؤں گا۔۔ یہی ہوا بھی، کُچھ ہی منٹ میں آخر کار سنہری خول تک پہنچ گیا۔ جیسا شاگو نے کہا تھا میں نے وہی کیا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ بائیں طرف بڑھایا۔ وہاں ایک عجیب سا خانہ بنا ہوا تھا۔ اس خانے میں ہاتھ ڈال کر میں نے آفاقی ہار نکال لیا۔ ہار نکالنے کے بعد جیسے ہی میں واپس مڑا، سنہری خول کے کیواڑ اپنے آپ ہی بند ہو گئے۔ اور پھر وہ بڑی تیزی کے ساتھ پانی میں ڈوبنے لگا۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ کیا بات تھی؟ مگر یہ حقیقت تھی کہ یکایک مُجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میری ٹانگ پکڑلی ہے اور پھر اندر ہی اندر اس نے مُجھے پانی میں کھینچنا شروع کر دیا۔ پانی میں تو بڑے بڑے تیراک بھی بے بس ہو

جاتے ہیں، میں تو پھر ایک معمولی سا تیراک تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے بچنے کی کوئی اُمّید نہیں ہے تو میں نے گھبرا کر دوسرے ہاتھ سے اپنی کمر میں بندھا ہوا لمبا سا چاقو نکال لیا۔ یکایک کسی چیز نے زور سے پانی میں پلٹا کھایا۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز سے اس چیز کی ایک جھلک دیکھی تو معلوم ہوا شارک مچھلی ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ یہ مچھلی آدم خور ہوتی ہے، اور شاید میری ٹانگ اسی مچھلی کے مُونہہ میں تھی۔ خود کو مُصیبت میں پھنسے دیکھ کر میں نے اپنے بچاؤ کی آخری کوشش کی یعنی خود کو چھڑانے کی ایک آخری جدوجہد۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی صورت سے اپنا لمبا چاقو مچھلی کے پیٹ میں اتار دوں، مگر مُجھے اس میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ بالکل ویسا واقعہ تھا جو مُجھے ایک بار اپنی نوعمری کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب میں مچھلی کے ساتھ ساتھ بہا جا رہا تھا اور اب ایک خوفناک مچھلی

مُجھے اپنا نوالہ بنانے کی فکر میں تھی۔ کشتی میں کھڑے ہوئے سب لوگ بُری طرح چیخ رہے تھے۔ میں چونکہ مچھلی کے ساتھ کبھی اوپر ہو جاتا اور کبھی نیچے، اس لئے امجد بھی اپنے پستول سے مچھلی کو نشانہ بناتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گولی میرے لگ جائے۔ شارک اپنا پورا زور لگا رہی تھی اور میری حالت یہ تھی کہ جسم کی قوّت ختم ہوتی جا رہی تھی اور جب میں نے دیکھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت مُجھے نہیں بچا سکتی تو میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ آفاقی والا ہار کشتی کی طرف پھینک دیا۔

بس پھر میں اتنا ہی دیکھ سکا کہ امجد نے جلدی سے ہار لپک لیا۔ میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ کیا ہوا تھا! مگر اتنا ضرور تھا کہ بعد میں خود بخود ہی میں پانی کی سطح پر آ گیا تھا۔ شاید میں نیم مُردہ سا تھا۔ جیسے کوئی خواب دیکھتا ہے، میں نے بھی اسی طرح اتنا دیکھا کہ کشتی سے بہت سے ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہیں اور پھر ان ہاتھوں نے مُجھے کشتی میں کھینچ لیا۔ جب

مُجھے اچھّی طرح ہوش آگیا اور میں حالات کو سمجھنے کے قابل ہوا تو گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے یاد کرنے لگا۔ چلتی ہوئی فلم کی طرح سب منظر میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔

مجھے یاد آگیا کہ جب مچھلی مُجھے پانی کے اندر کھینچ رہی تھی تو میں نے آفاقی ہار کشتی کی طرف پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد مچھلی مُجھے پانی کے اندر لے گئی۔ میرے پیٹ میں پانی بھر گیا تھا۔ اور پھر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا تھا کہ مچھلی نے آپ ہی آپ میری ٹانگ چھوڑ دی اور میں پانی کی سطح پر آگیا تھا۔ بعد میں میرے ساتھیوں نے مُجھے نکال لیا تھا۔ یہ تھا وہ سب واقعہ۔

مگر یہ بات کیا ہوئی۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتی کہ جیگا نے اپنی پوشیدہ قوّتوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ یا تو اس نے مچھلی کو بھیجا تھا یا پھر خود مچھلی بن کر آیا تھا۔ دونوں میں سے ایک بات ضرور تھی۔

اختر اور نجمہ میرا سر سہلا رہے تھے۔ ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا

رہے تھے۔ اور سوامی بھی مُجھے بڑی محبّت کی نظر دیکھ رہا تھا۔ سوامی اب بلونت کو تلاش کرنے کے بعد کشتی میں واپس آ چکا تھا۔ ہم سب کو اس حقیقت کا علم ہونے کے بعد بڑی مایوسی ہوئی کہ ہماری پارٹی میں سے بلونت اب کم ہو چکا ہے۔ میں اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ بڑا کام کا آدمی تھا۔ کم از کم ایسے وقت میں اس کی بھیانک موت سے مُجھے بڑا رنج ہوا۔ مگر سوائے صبر کے ہم لوگ اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ کون جانے کہ ہم سب کا بھی ایسا ہی انجام ہونے والا ہو۔

کشتی خود بخود چلی جا رہی تھی۔ امجد اور جیک کشتی کے اگلے سِرے پر کھڑے ہوئے تھے۔ جان، میں اور سوامی پچھلے سِرے پر اور اختر اور نجمہ درمیان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سنہری گولا غائب ہو چکا تھا۔ سمندر کے سینے پر ہم کسی نامعلوم منزل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ آفاقی ہار جان نے اختر کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ کیوں کہ اختر کے چہرے پر بال نہیں تھے، وہ نو

عمر تھا اور لڑکوں کی جوانی سے پہلے داڑھی نہیں آیا کرتی۔ میں نے بھی سوچا کہ ٹھیک ہے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی مُجھے اس آفاقی ہار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسی بھی مشکل میں یہ آفاقی ہار کس طرح کام آئے گا!

۔۔۔ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے دِل نے کہا۔

"تم غَلَط سوچتے ہو فیروز! تُم بھول گئے شاید، مچھلی کے مُونہہ کا نوالہ بنتے بنتے تم پھر سے کشتی میں آ گئے۔ کیا یہ آفاقی کا کرشمہ نہیں ہے؟"

واقعی اب مُجھے احساس ہوا کہ یہی بات ہے۔ جب تک آفاقی ہار میرے ہاتھ میں تھا، مچھلی مُجھے نیچے کھینچ رہی تھی اور جب میں نے آفاقی کو کشتی میں پھینک دیا، میں بچ گیا۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ مچھلی دراصل مُجھ سے آفاقی ہار لینا چاہتی تھی۔ جب یہ بات ظاہر ہو گئی تو مُجھے آفاقی کی قوّت پر یقین آ گیا۔ ہماری کشتی سمندر میں بڑی ہلکی رفتار سے بہہ رہی تھی۔ ہر لمحہ مُجھے یہی

خدشہ تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہوگی۔ کُچھ نہ کُچھ پیش آنے والا ہے،
سمندر کا یہ سکون کسی آنے والے حادثے کا پیش خیمہ ہے۔ دوپہر ہورہی
تھی، امجد نے کشتی کے نیچے رکھے ہوئے پھل نکالے اور سب میں تقسیم
کیئے۔ ہم لوگوں نے پھل کھا کر پانی پیا اور تازہ دم ہو گیئے۔ جب جسم میں
قوّت آ گیئ تو ہم نے چپّو پھر سے سنبھال لیئے اور آہستہ آہستہ شمال کی
سمت بڑھنے لگے۔ کافی دیر تک ہم اسی طرح چلتے رہے۔

چلتے چلتے سہ پہر ہو گیئ۔ سمندری پرندے اب آسمان پر اڑنے لگے تھے۔
ہوا ٹھنڈی ہو گیئ تھی۔ ہر طرف ایک سنّاٹا سا طاری تھا۔ بس کبھی کبھار
لہروں کے آپس میں ملنے سے جو شور پیدا ہوتا تھا وہ سُنائی دے جاتا تھا۔ ہم
لوگ بمبئ سے بہت دور تھے۔ حالانکہ ہم سمجھتے تھے کہ سورج کی سمت کا
اندازہ لگا کر جوں جوں ہم شمال کی طرف بڑھتے جائیں گے یقیناً ایک نہ ایک
دِن ہندوستان تک پہنچ جائیں گے۔ مگر میرا یہ اندازہ غلط تھا۔ جکاریوں

والے جزیرے کے بعد سے ہمیں اب تک زمین کا اتنا سا کونہ بھی نظر نہ آیا تھا۔ ہم سب پریشان تھے اور بار بار ٹھنڈا سانس لے کر اسمان کی طرف دیکھتے تھے کہ شاید اب خُدا کو ہم پر ترس آ جائے۔

امجد نجمہ کے پاس بیٹھا ہوا اسے تسلّی دے رہا تھا اور اختر اپنے بندر کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ بندر کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ایک زور کی قلابازی کھائی اور پھر کشتی سے باہر پانی میں گِر گیا۔ پانی میں گِرتے ہی اس نے بڑی بھیانک چیخ ماری۔ اس کی چیخ سن کر اختر نے جلدی سے اس کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی کو کھینچا اور سہارا دینے کے لئے اپنا ایک ہاتھ پانی میں ڈالا۔ پانی میں ہاتھ ڈالتے ہی اختر نے بھی گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور مُجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے اختر۔۔۔ پانی میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابّا جی۔۔۔ نہ جانے کیا بات ہے، یہ پانی تو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا

ہے۔" اختر نے جواب دیا۔

"ٹھنڈا ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا اور اٹھ کر اختر کے پاس آگیا۔ جان، جیک اور سوامی بھی حیرت سے اختر کو اور مُجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں اختر کی بات کا یقین نہیں آیا تھا، میں نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا تو مُجھے بھی یہی محسوس ہوا گویا برف کے پگھلے ہوئے پانی میں میرا ہاتھ ڈوب گیا ہو!

یہ بڑی عجیب بات تھی اور کم از کم میری سمجھ میں آنے والی نہیں تھی، میں نے جب جان کو یہ بات بتائی تو اسے بڑا اچنبھا ہوا اور پھر باری باری سب نے پانی میں انگلی ڈال کر دیکھی۔ پانی بہت سرد تھا۔ جس جگہ ہماری کشتی تھی، اب اس کے آس پاس لہریں بھی پیدا نہیں ہو رہی تھیں۔ سائنس کا ایک اصول ہے کہ پانی زیادہ ٹھنڈا ہو جانے پر بھاری ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کشتی کی رفتار بھی اب پہلے کے مقابلے میں بہت ہلکی ہو گئی تھی۔

ہم میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہم پانی میں انگلی ڈال کر دیکھتے اور پانی کو پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈا پاتے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس ٹھنڈ کا اثر ہوا پر بالکل نہیں ہوا تھا۔ جہاں پانی ٹھنڈا ہو، اصولاً وہاں کی ہوا بھی ہلکی سرد ہو جانی چاہیئے۔ مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ہوا زیادہ ٹھنڈی نہیں تھی بلکہ اس قسم کی تھی جیسی کہ موسم بہار میں ہوا کرتی ہے۔

جان نے یہ دیکھ کر کہا۔ "فیروز میرے خیال میں اب کُچھ نہ کُچھ ضرور ہونے والا ہے۔"

امجد نے پوچھا: "یہ آپ نے کیسے جانا؟"

"غور سے دیکھو۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "ہماری کشتی سے ایک فرلانگ کے دائرے میں لہریں بالکل خاموش ہیں۔ اور اس دائرے سے دور سمندر میں دیکھو کتنے زور کی لہریں اٹھ رہی ہیں! یقیناً کوئی خاص بات

ہونے والی ہے۔"

ہماری جان اس وقت سخت عذاب میں تھی، ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے، مگر کب اور کتنی دیر میں؟ یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ بلکہ ایک طرح سے تو ہم اس حادثے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسی حالت انسان کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ دِل چاہتا تھا کہ جو کُچھ بھی ہونا ہے فوراً ہو جائے۔ میں نے سمندر میں دیکھا، اب پانی کی سطح پر ہلکی سی چمک نمودار ہونے لگی تھی، میں نے اپنا ہاتھ دوبارہ پانی میں ڈالا۔ اور پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (کیا کہوں یہ بات کہتے ہوئے میرا دِل لرز رہا ہے) پھر میں نے محسوس کیا کہ میرا ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرایا ہے۔ میں نے جلدی سے یہ بات جان کو بتائی تو اس نے کہا:

"میں جانتا ہوں، میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں، فیروز، تمہیں سُن کر حیرت ہو گی ہمارے آس پاس کا پانی بڑی تیزی کے ساتھ برف بنتا جا رہا ہے۔

اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہے؟"

"برف۔۔۔۔" ہم سب ایک ساتھ چیخے، ہمارے چہروں پر خوف جھلک رہا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جو جان نے کہا تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر ایک فرلانگ دائرے کا پانی برف بن گیا۔ ہماری کشتی چلتے چلتے رُک گئی ہم سب بوکھلائے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جان کے کہنے پر اختر نے اپنے بندر کو آہستہ سے اس برف پر چھوڑ دیا اور بندر برف پر تھوڑی دیر ٹک کر پھر جلدی سے کشتی پر چڑھ آیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ برف ٹھوس ہے اور اس پر اترا جا سکتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے لئے عارضی طور پر کسی پُراسرار طاقت نے اس حصّے کو برف کی زمین بنا دیا تھا۔ سب سے پہلے سوامی ڈرتے ڈرتے اس برف پر اترا، اور اترنے کے بعد اس پر ایک دو قدم چلا بھی۔ یہ دیکھ کر ہمیں خوف کے ساتھ ساتھ خُوشی بھی

ہوئی۔ ہم لوگ زمین کی تلاش میں تھے اور اب زمین ہمیں مل چکی تھی۔۔ کیا ہوا جو یہ زمین برف کی تھی۔

ایک ایک کر کے ہم سب کشتی میں سے نیچے اُتر گئے۔ امجد نے نجمہ کو سہارا دے کر اس نرالی اور عجیب و غریب زمین پر اتارا، کیوں کہ وہ اور اختر دونوں نیچے اترتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ حیرت کے مارے میری زبان گنگ تھی۔ ہم لوگوں کی حالت اس وقت عجیب تھی۔ خُوشی کے مارے کُچھ تو برف پر اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے اور میں جان کے پاس کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ آفاقی ہار کا کرشمہ ہے، خُدا کی مہربانی ہے یا پھر ظالم جیکا کی کوئی نئی چال ہے؟

برف آہستہ آہستہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ میں حیران و پریشان کشتی کے پاس کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟

"گھبراؤ مت فیروز، جان نے کہا، ہمّت سے کام لو اور سب سے کہہ دو کہ

کشتی سے زیادہ دور نہ جائیں۔ کیوں کہ یہ برف کسی بھی وقت پگھل سکتی ہے۔"

"ہاں میرے خیال میں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ میں ابھی سب کو بلاتا ہوں۔"

میں نے اتنا کہہ کر سب کو آواز دی کہ وہ لوگ کشتی کے قریب آ جائیں۔ میرا کہنا مان کر اختر، نجمہ، سوامی، جیک اور امجد کشتی کی طرف آ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک زور دار تڑاخا سُنائی دیا۔ ہم سب سہم کر اس سمت دیکھنے لگے۔ جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ کشتی سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر برف کی وہ زمین خود بخود چیخ رہی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی شیشہ ٹوٹتا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک تڑاخا پھر ہوا اور برف کا وہ حصّہ جہاں سے وہ ٹوٹنا شروع ہوئی تھی اپنے آپ ہی اوپر اٹھنے لگا۔

اف! وہ منظر اس وقت بھی میری نگاہوں کے سامنے پھر گیا ہے اور میرا

دِل یہ سطریں لکھتے وقت کانپنے لگا ہے، میرے خدا! میں کس طرح بیان کروں کہ کوئی خوفناک چیز۔ ۔ ۔ ایسی چیز جس کے بارے میں ہم میں سے کسی کو بھی کُچھ پتہ نہ تھا، برف کے اندر سے اب آہستہ آہستہ اپنا سر اُبھار رہی تھی!

ایک بھیانک چیخ مار کر اختر اور نجمہ تیزی سے کشتی کی طرف دوڑے وہ دونوں اس وقت بڑے بدحواس تھے اور اسی بدحواسی کی وجہ سے نجمہ لڑکھڑا کر برف پر گر پڑی۔ امجد نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ سوامی اور جیک نے اختر کو اپنے بیچ میں لے لیا اور پھر وہ سب دوڑتے ہوئے کشتی کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے نجمہ کو امجد کے ہاتھوں پر سے اٹھا کر کشتی میں لِٹا دیا۔

شاید وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مگر یہ وقت اسے ہوش میں لانے کا نہیں تھا۔ اس وقت تو خود ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ ہماری نگاہیں اس

طرف تھیں جہاں سے برف اوپر اُٹھ رہی تھی اور ہاتھ اپنے اپنے ہتھیاروں پر رکھے ہوئے تھے۔ سورج چوں کہ ہمارے سروں پر تھا اس لئے اس کی نورانی کرنیں جب ٹوٹتی ہوئی برف پر پڑتیں تو ہماری آنکھیں ایک تکلیف دہ روشنی کے باعث بند ہو جاتیں۔ ہمارے چہرے زرد پڑے ہوئے تھے اور جسم بری طرح لرز رہے تھے۔ وہ خوفناک چیز آہستہ آہستہ اوپر آ رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک سفید سا گنبد اوپر ابھرنا شروع ہوا اور جب یہ گنبد پوری طرح اوپر آگیا تو جیسے ہم سب کا دم سا نکل گیا۔

ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ جی ہاں چہرے کو، میں کس طرح وہ واقعہ بیان کروں؟ خوف کی کپکپی کے باعث میرا قلم لرز رہا ہے۔ معاف کیجئے گا میں چند منٹ کے لئے لکھنا بند کرتا ہوں۔۔ مُجھے اپنے حواس پر قابو پانے دیجئے۔

-----------ایک لمبا وقفہ---------

ہاں! اب میری حالت کُچھ بہتر ہوئی ہے۔ اب چند لمحوں کے آرام نے میرے دِل کا خوف ایک حد تک دور کر دیا ہے۔ داستان کی دِلچسپی اور تسلسل کو توڑنے کی معافی چاہتے ہوئے میں پھر یہ آپ بیتی شروع کرتا ہوں۔

وہ چہرہ اب ہم سب کے سامنے تھا۔ وہ ایک بہت بڑا چہرہ تھا۔ بے حد خوفناک اور ڈراؤنا۔

وہ چہرہ اب ہم سب کے سامنے تھا۔ وہ ایک بہت بڑا چہرہ تھا۔ بے حد خوفناک اور ڈراؤنا۔ گنبد سے بھی بڑے اس بھیانک چہرے کی سب چیزیں انسانوں جیسی تھیں مگر ایسی کہ جن کو دیکھ کر انسان کا پِتّہ پانی ہو جائے۔ سر بہت بڑا تھا۔ کان لمبے اور اوپر سے نوکیلے تھے۔ ناک بھی بہت لمبی اور آگے سے سوئی جیسی نوکیلی اور تیز تھی، مُونہہ اس وقت بند تھا۔ مگر ہمیں دیکھ کر جب وہ چہرہ بھیانک طریقے پر ہنسا تو میں نے دیکھا کہ اس کے مُونہہ

میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ البتّہ زبان بہت لمبی تھی۔ آنکھیں خوفناک تھیں اور ان میں پُتلی سِرے سے تھی ہی نہیں۔ ٹھوڑی کے نیچے سفید ڈاڑھی تھی جو ہمالیہ کے برفانی علاقوں کے گلیشیرز سے ملتی جلتی تھی۔ سب سے حیرت انگیز اور دِل کو لرزا دینے والی بات یہ تھی کہ یہ چہرہ گوشت پوست یا پتھرّ کا نہیں بلکہ سفید اور ٹھوس برف کا تھا!

اس کے آس پاس کی برف برابر ٹوٹ رہی تھی۔ کُچھ ہی دیر بعد اس نے اپنے ہاتھ باہر نکال لئے اور پھر برف کا سہارا لے کر وہ دیویا جو کُچھ بھی آپ اسے کہئے اوپر اٹھنے لگا۔ ہم یہ دیکھ کر جلدی سے کشتی میں دُبک گئے۔ جان نے سب سے کہا کہ کوئی بھی کشتی سے باہر نہ رہے اور اس کے حُکم کے بغیر اپنے ہتھیاروں سے کوئی بھی کام نہ لے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ اس وقت ہماری کیا حالت تھی؟ ہم میں سے کوئی بھی بُزدل نہ تھا مگر مُجھے اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اب کوئی شرم

محسوس نہیں ہو رہی کہ اس وقت ہم اتنے ڈر گئے تھے کہ خوف کی وجہ سے ہم نے اپنے سانس تک روک لئے تھے۔ ہتھیار ہمارے ہاتھوں میں کانپ رہے تھے۔ اور ہمارے جسم پسینے میں نہا گئے تھے۔ اختر سوامی کے سینے میں مُونہہ چھپائے ہوئے تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس نے اس خوفناک چیز کو نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ مُجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی شاید نجمہ ہی کی طرح بے ہوش ہو گیا ہوتا۔ برف کا وہ آدمی سمندر میں سے آہستہ آہستہ اوپر آ رہا تھا۔ آخر کار جب وہ گھٹنوں تک اوپر آ گیا تو اپنا سینہ تان کر رُک گیا۔ میرے خیال میں اس کی اونچائی سطح سمندر سے پانچ سو فٹ تو ضرور ہوگی۔ اس کے چہرے کو دیکھنے کے لئے ہمیں کمر کے بل لیٹنا پڑتا، تب شاید اسے دیکھ سکتے تھے۔

اوپر آتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بُلند کر کے زور کی چنگھاڑ ماری جس کے باعث برف کی اِس زمین پر دراڑیں پڑ گئیں۔ اس کا پورا جسم

ٹھوس اور شفّاف برف کا تھا اور اِس برف کے آر پار ہر چیز صاف نظر آتی تھی۔ اس کے جسم میں سے وہ مقام جہاں سمندر آسمان سے مل رہا تھا، بالکل صاف نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور جسم سے پانی ٹپکتے ٹپکتے ہی برف بن جاتا تھا، اور اس طرح اس کے پورے برفانی جسم پر لمبی لمبی اور موٹی سوئیاں سی بن گئیں تھیں۔

اگر کوئی اِن سوئیوں کو چھُولیتا تو یقیناً اِن کی نوکیں چھونے والے کے ضرور چُبھ جاتیں۔ برف کا یہ لمبا آدمی پہلے تو آسمان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی بے پُتلی کی سفید اور بھیانک آنکھوں سے نیچے دیکھا۔ اس کے مُقابلے میں ہماری چھوٹی سی کشتی ایک تنکے کی حیثیت رکھتی تھی اور ہم لوگ اس تنکے سے چمٹی ہوئی ننّھی سی چیونٹیاں!

اسی سے آپ کو برف کے اس دیو کی اونچائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہماری کشتی کو دیکھ کر اس نے اتنا زبردست قہقہہ لگایا کہ آواز کے دھکے سے

ہماری کشتی ہلنے لگی۔ اس کے بعد وہ اپنا برف کا ایک ہاتھ کشتی کے اوپر لایا۔ ہم نے بھنچی بھنچی آنکھوں سے اس ہاتھ کو دیکھا۔ وہ ہاتھ ہماری کشتی سے تقریباً تین سو فٹ اونچا ضرور ہوگا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان پر برف کا ایک لمبا سا پہاڑ بادل کی طرح لہرا رہا ہو۔ اس پہاڑ میں سے ننّھی ننّھی ٹھنڈی بوندیں ہمارے اوپر گر رہی تھیں۔ شاید آپ یہ سمجھیں گے کہ میں شاعری کرنے لگا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں نے اب دِل پر قابو پا لیا ہے۔ یہ داستان لکھتے وقت تو بے شک میں شاعری کر رہا ہوں، مگر اس وقت تو درحقیقت موت مُجھے اپنے اوپر منڈلاتی ہوئی نظر آتی تھی!

ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کیا کریں؟ آخر اس کشتی میں دبے ہوئے ہم کب تک بیٹھے رہتے میں نے بڑی مدھم آواز میں جان سے پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور اب ہمارا اگلا قدم کیا ہو؟

"بڑی عجیب حالت ہے فیروز، میرا دماغ اس وقت بے کار ہوگیا ہے۔"

جان نے کہا۔

"ایسا تو نہیں کہ یہ سب مہربانی آپ کے شاگو صاحب کی ہو؟" امجد نے پوچھا۔

"نہیں بھئی نہیں ہو سکتا۔" جان نے کہا۔ "شاگو تو ہماری مدد کر رہا ہے۔ برف کا یہ خوفناک دیو اس نے نہیں بھیجا۔ بلکہ یہ مُجھے جیگا کی شرارت نظر آتی ہے۔"

"نہیں، میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ برف کا یہ آدمی دراصل ہماری مدد کے لئے آیا ہو؟" امجد نے پوچھا۔

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم اس کے تیور دیکھو۔ مُجھے یقین ہے کہ اس کے ارادے خطرناک ہیں۔"

"اس بلا سے چھٹکارا کس طرح پایا جا سکتا ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں؟" میں

نے جان سے دریافت کیا۔

"صرف ایک طریقہ ہے۔ ہم کشتی کو دھکیل کر بڑی تیزی کے ساتھ برف کی اِس زمین پر پھسلاتے ہوئے وہاں تک لے جائیں جہاں برف کا آخری کنارہ ہے اور پھر کشتی کو پانی میں پہنچا کر جتنی جلد ہو سکے، چپّو چلا کر اُس جگہ سے دور چلے جائیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟" امجد نے کہا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم بچ جائیں گے۔ جی نہیں، برف کا یہ دیو ہو سکتا ہے کہ ہمارا پیچھا کرے اور جہاں جہاں ہم جائیں، وہاں کا پانی بھی برف بنتا جائے۔ نہیں جناب یہ تو خود کو موت کے مُونہہ میں دھکیلنا ہوا۔ میں آپ سے مُتّفق نہیں ہوں۔"

"پھر۔۔۔ پھر کیا کیا جائے، تم ہی بتاؤ۔" جان نے بیزاری کے ساتھ کہا۔

"اپنی زندگیوں کو بچانے کے لئے کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ جیگا کے راستے سے ہٹ جائیں۔"

امجد کے یہ کہتے ہی ہم چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ جان اُسے بُری طرح گھور رہا تھا۔ امجد کے اس جواب سے جو شُبہ جان کو ہوا تھا تقریباً وہی مُجھے بھی ہوا۔ کہیں یہ امجد جیگا کے ساتھیوں میں سے تو نہیں ہے، یا پھر کہیں یہ خود ہی تو جیگا نہیں ہے۔۔ حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میں نے امجد کو دیکھا۔ شاید وہ ہمیں ان نظروں سے دیکھتے پا کر گھبرا گیا اور پریشان ہو کر بولا۔

"آپ سب مُجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں!"

"امجد تُم سے ایسی باتوں کی توقّع نہیں تھی۔ تُم نے بڑی بُزدلی کا ثبوت دیا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ۔۔۔ میں سمجھ گیا آپ لوگوں نے کیا سوچا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ شاید میں خود ہی جیگا ہوں۔ فیروز صاحب خُدا کے لئے ایسا مت سوچیئے، میں ہرگز وہ نہیں ہوں جو آپ سوچ رہے ہیں۔ رہی میری بُزدلی والی بات تو معاف کیجئے گا یہ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے نہیں کہی۔۔۔ آپ شاید نہیں جانتے۔۔"

اس نے اپنا سر جھُکا لیا۔

"کیا نہیں جانتا؟"

"یہی۔۔۔ کہ۔۔۔ کہ۔۔ میں نے صرف نجمہ کی خاطر ایسا کہا تھا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں نے ایسی بات کہی مگر میں نجمہ کا جیتے جاگتے موت کے مُونہہ میں گِرنا پسند نہیں کرتا۔ میں نے ان جذبات کو چھپایا تھا مگر افسوس میری باتوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔"

امجد کی یہ باتیں سُن کر میرا شُبہ فوراً دور ہو گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ دبا دیا۔ ساتھ ہی کہا۔

"امجد مُجھے معلوم ہے، میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا، تمہیں نجمہ کی حفاظت کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ اور میری طرف سے اس کی اجازت ہے۔"

امجد کے چہرے پر اچانک سُرخی دوڑ گئی اور وہ مُجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جس میں ممنونیت پوشیدہ تھی، مسکراتے ہوئے اس نے اپنا پستول نکال لیا اور پھر جان سے بولا۔

"برف کے اس آدمی کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آتا جا رہا ہے، جان صاحب آپ فرمائیں تو ایک گولی ضائع کر کے دیکھ لوں؟"

"دیکھ لو۔۔۔ مگر تمہارے ہی الفاظ میں گولی ضائع ہی ہو گی۔" جان نے مُونہہ بنا کر جواب دیا۔

دھائیں۔ ۔ ۔ زور سے ایک آواز بُلند ہوئی اور گولی اس خوف ناک منجمد ہاتھ سے ٹکرا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ مگر اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ برف کے آدمی نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اوپر کھینچ لیا اور اُس کے بھیانک چہرے پر ناراضی صاف جھلکنے لگی۔ یہ دیکھ کر جان نے جلدی سے امجد سے کہا۔

"میرا خیال پلٹ گیا ہے امجد۔ گولی نے اِس برفانی آدمی کو تکلیف نہیں پہنچائی، بلکہ گولی کی گرمی نے پہنچائی ہے۔ برف آگ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی، فوراً پگھل جاتی ہے، تمہارے گولی چلانے سے ایک طریقہ اپنے بچاؤ کا نظر آتا ہے۔ اگر کسی طرح سے اس جگہ کافی سے زیادہ آگ جلادی جائے تو ہم لوگ اس برفانی آدمی کو پانی بنا سکتے ہیں اور پھر یہ ہمارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

بات بڑی معقول تھی اور ہم سب کی سمجھ میں بھی آ گئی تھی۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوا کہ برف پر آگ کس طرح جلائی جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ آگ اور

پانی کا میل کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ زمین عام زمین ہوتی تو اس پر آگ جلانا کُچھ مشکل کام نہ تھا۔ مگر برف پر آگ جلانا تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے جیسا کام تھا، اگر فرض کرلیا جائے کہ آگ جل بھی جاتی، تو پھر اس کے شعلے تین چار سو فٹ کی اونچائی تک پہنچانا ایک ایسا کام تھا جو ہم انسانوں کے بس میں بالکل نہ تھا۔

گولی کی گرمی پا کر برف کا وہ آدمی تلملا گیا اور اس نے امجد کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ نیچے بڑھایا۔ اس وقت ہم نے ایک خاص بات نوٹ کی، برف کا وہ آدمی اکڑا ہوا کھڑا تھا اور صرف اس کا ہاتھ ہی نیچے جھُک رہا تھا۔ وہ خود اپنی کمر کو نہیں جھکا سکتا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ ٹھوس برف کا ہونے کی وجہ سے اس کے جسم میں پھرُتی اور لچک نہیں ہے۔ ان ہی دو خصوصیّتوں کی بدولت انسان ہر سِمت مُڑ سکتا ہے اور چاہے تو نیچے جھُک سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر ہمیں کم از کم اتنا اطمینان ضرور ہوگیا کہ برف کا آدمی نیچے جھُک کر

ہمیں پکڑ نہیں سکتا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے فوراً ایک ترکیب سوچ لی۔ اور ساتھ ہی امجد سے کہا کہ وہ برفانی آدمی کے ہاتھ کو دور رکھنے کے لئے ایک گولی اور چلائے۔ امجد نے میرا کہنا مانتے ہوئے برف کے اس ہاتھ پر ایک فائر اور کر دیا۔

ایک زبردست اور بھیانک چیخ سُنائی دی اور برفانی آدمی نے جلدی سے اپنے دوسرے ہاتھ سے اس ہاتھ کو پکڑ لیا۔ جیسے کہ اسے بڑی تکلیف ہوئی ہو۔ اس سے ہماری ڈھارس بندھی اور پھر میں نے جان سے کہا کہ وہ سب کشتی سے باہر آجائیں۔ دیو کا ہاتھ اگر نیچے آنے لگے تو برف کی زمین پر اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیں۔ تاکہ دیو کے ہاتھ نہ لگیں۔

میری یہ بات سُن کر جان، سوامی، جیک، امجد اور اختر جلدی سے کشتی سے باہر آ گئے۔ پہلے تو خوف یہ تھا کہ کہیں دیو کے ہاتھوں مارے نہ جائیں، مگر اب زندگی بچانے کی خاطر ہم سب میں اچانک ہمّت پیدا ہو گئی۔ اختر

اور سوامی کو میں نے اپنے پاس ہی رہنے کی تاکید کی اور باقی لوگوں سے کہا وہ اِدھر اُدھر دوڑتے رہیں تاکہ برفانی دیو کا دھیان بٹ جائے۔

جان کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اس لئے اس نے بھی میرا حُکم مان لیا۔ اس کے بعد میں نے سوامی سے کہا کہ پینے کا پانی لکڑی کے ایک پیپے میں سے نکال کر برف پر بہا دے۔ میری یہ بات سن کر سوامی حیرت سے مُجھے دیکھنے لگا۔ اس طرح جیسے کہ میں بے وقوف ہوں۔ ہر شخص شاید یہی سوچتا۔ آپ حضرات جو اس داستان کو دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی سوچیں۔ میں جانتا ہوں کہ پانی اس وقت ہماری زندگی تھا۔ پانی کو یوں بہا دینا عقل مندی ہر گز نہ تھی مگر آپ کو آگے چل کر پتہ لگ جائے گا کہ یہ بے وقوفی تھی یا عقل مندی؟

سوامی شاید کُچھ حیل و حجت سے کام لیتا مگر مُجھے سنجیدہ دیکھ کر اس نے پینے کا پانی پیپے کو ٹیڑھا کر کے برف پر بہا دیا۔ اور پھر مُجھے یوں دیکھنے لگا جیسے

اب اگلے حُکم کا منتظر ہو۔ میں نے پھر فوراً ہی خود آگے بڑھ کر پٹرول کا ایک بڑا ڈبہ اٹھا لیا۔ یہ ڈبہ جست کا بنا ہوا تھا، ڈبّے کا ڈھکنا کھول کر میں نے وہ تمام پٹرول لکڑی کے پیپے میں بھر دیا۔ اب اس طرح ایک تو پٹرول ضائع نہیں ہوا دوسرے جست کا ایک بڑا ڈبّہ بھی خالی ہو گیا۔ میں نے سوامی سے کہا کہ وہ ہتھوڑی یا چاقو کی مدد سے اس ڈبّے کو پورا کھول دے۔ سوامی شاید اب میرے ارادے کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ڈبّے کو کھولنا شروع کر دیا اور اس کے اس کام میں میں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ ایسا کرتے ہوئے میں بار بار اوپر دیکھ رہا تھا کہ کہیں برفانی آدمی کا ہاتھ تو مُجھے پکڑنے کے لئے نہیں آ رہا۔۔۔ مگر خُدا کا شکر ہے کہ اس خوف ناک دیو کی پوری توجّہ اس وقت بھاگتے ہوئے جان، جیک اور امجد پر تھی۔ وہ لوگ اسے بار بار جُل دے کر اِدھر اُدھر نکل جاتے تھے۔

سوامی نے اس عرصے میں جست کا وہ ڈبّہ بالکل کھول لیا تھا اور اب

ہمارے پاس تین فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی جست کی ایک چادر تھی۔ سوامی کو اپنے ساتھ لے کر اور اختر کو نجمہ کے پاس چھوڑ کر میں برفانی دیو کے گھٹنوں کے پاس جانے کے لئے تیّار ہو گیا۔ احتیاطاً میں نے پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سوامی سے میں نے کہا کہ وہ سوکھی لکڑیوں کا ایک بنڈل اور ماچس بھی لے لے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر جلد ہی ہم دونوں اس سامان کے ساتھ برفانی آدمی کے گھٹنوں کے قریب پہنچ گئے۔ مگر مصیبت یہاں یہ پیش آئی کہ برفانی آدمی نے ہمیں دیکھ لیا۔ اور شاید اس نے ہمارا ارادہ بھی بھانپ لیا۔ اس کے خوفناک چہرے پر حقارت جھلکنے لگی اور پھر اس نے اپنا برف کا ہاتھ ہماری طرف بڑھایا ہاتھ کو اپنے طرف آتے دیکھ کر میں نے بھی وہی کیا جو امجد نے کیا تھا۔ اپنے پستول سے میں نے ایک فائر کیا اور پھر فوراً ہی سوامی نے بھی دوسرا فائر کر دیا۔ برفانی آدمی نے ایک بھیانک چیخ مار کر بڑی بے قراری سے اپنا ہاتھ

نیچے جھٹکا۔ اب اسے اتّفاق کہہ لیجئے یا بد قسمتی کے اس کے ہاتھ میں جان کی ٹانگ آ گئی۔ اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے جان کو بڑی بے دردی سے پکڑ کر اس نے اوپر اٹھا لیا۔ جان بری طرح چیخ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں یوں لٹک رہا تھا جیسے چوہیا!

۔۔۔۔ برفانی آدمی نے خُوشی کی ایک چیخ مار کر جان کو اپنے مُونہہ میں رکھ لیا اور پھر ہم نے ایک عجیب دِل دہلا دینے والا نظّارہ دیکھا۔ جان برف کے اندر ہمیں صاف صاف جاتا ہوا نظر آیا۔ پہلے وہ برفانی آدمی کے حلق میں پہنچا پھر قلا بازیاں کھاتا ہوا سینے میں آیا اور سب سے آخر میں پیٹ کے اندر پہنچ گیا۔

وہ بالکل زندہ تھا اور بڑی بے بسی کے عالم میں ہم سب کو دیکھ دیکھ کر چیخ رہا تھا، مگر اس کی آواز ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی، میرا یہ دیکھتے ہی خون کھولنے لگا، میرا بزرگ اور مُجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز

شخص اس وقت برف کے قید خانے میں بند تھا!

شاید میرے ساتھ ہی اور سب بھی حیرت اور خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ امجد کو اتنا منہمک تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب برف کے آدمی کا ہاتھ نیچے آیا اور کب اسے پکڑ کر اوپر مُونہہ تک لے گیا۔ شاید وہ تو اس وقت چونکا ہو گا جب اس نے خود کو برفانی آدمی کے پیٹ میں جان کے پاس پایا ہو گا۔

یہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے اور میں نے سوامی سے کہا کہ وہ جلدی سے کشتی میں جا کر لکڑی کا پیپا اٹھا لائے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے، لکڑی کے اس پیپے میں اب پانی کی جگہ پٹرول بھرا ہوا تھا۔ سوامی موقع کی نزاکت کو بھانپ گیا اور پھر اندھا دُھند ایک دو فائر کرتا ہوا تیزی سے کشتی کی طرف بھاگا، وہاں جا کر اس نے پہلے تو اختر کو وہیں کشتی میں چھُپ جانے کو کہا اور پھر پیپا اٹھا کر واپس میری طرف دوڑنے لگا۔ اس کو مصیبت سے بچانے

کی خاطر میں نے بھی برف کے آدمی کے ہاتھ کو نشانہ بنا بنا کر چند فائر کر ڈالے اور ایسا کرنا غنیمت ہی ہوا۔ ورنہ سوامی ایک دو بار اس کے ہاتھوں میں آتے آتے بچا تھا۔ سوامی سے پیپا لے کر میں نے جلدی سے پہلے جست کی چادر برف پر بچھا دی۔ اس کے اوپر لکڑیاں رکھیں اور پیپے کا سب پٹرول ان لکڑیوں پر چھڑک دیا۔ اس کے ساتھ ہی پیپا بھی الٹا کر کے لکڑیوں پر رکھ دیا۔ ایسا کرتے وقت میں اتنا مصروف ہوا کہ مُجھے آس پاس کی کُچھ خبر نہ رہی۔ چونکا تو اس وقت جب کہ دو خوفناک چیخیں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ یہ چیخیں جیک اور سوامی کی تھیں۔ وہ دونوں برفانی آدمی کے دونوں ہاتھوں میں لٹکتے اور تڑپتے ہوئے ہوا میں اوپر اٹھ رہے تھے۔ میں نے پستول سے فائر کرنا بھی چاہا مگر معلوم ہوا کہ کارتوس ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے جلدی سے پیٹی میں سے کارتوس نکالے اور انہیں پستول میں بھرنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے میں جیک اور سوامی کو بھی دیکھتا جاتا

تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہی وہ دونوں بھی برفانی دیو کے پیٹ میں قید ہو گئے۔ کارتوس ابھی پوری طرح بھرے نہیں گئے تھے۔

حالانکہ میرا ذہن ہر لمحہ برفانی آدمی کی طرف لگا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی میں چوک گیا اور میری اس غفلت کا نتیجہ وہی ہوا جو اصولاً ہونا چاہئے تھا۔ یعنی میں بھی برف کے شکنجے میں آگیا۔ برف کے ہاتھ نے مُجھے دبوچ کر اوپر اٹھا لیا اور پھر یہ ہاتھ اوپر اٹھنے لگا۔ مُجھے یوں لگا جیسے میں کسی ہنڈولے یا کرین میں بیٹھا ہوا ہوں، برف کی زمین مُجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی اور اتنی بلندی سے یہ زمین یوں لگ رہی تھی جیسے کسی نے سمندر کے ماتھے پر سفید بندی لگا دی ہو! میرا خون خشک ہوئے جا رہا تھا۔ ہر لمحہ مُجھے یہی ڈر تھا کہ اگر اس برف کے ہاتھ میں سے پھسل گیا تو بس پھر تو اللہ ہی حافظ ہے!

عجیب وقت تھا وہ!

میرے دونوں بچّے کشتی میں دبکے ہوئے تھے۔ نجمہ تو شاید ابھی تک بے

ہوش تھی اور اختر مُجھے موت کے مُونہہ میں پھنستے دیکھ کر احتیاط کو بھول گیا تھا، وہ لپک کر کشتی سے باہر آگیا تھا اور مُجھے دیکھ دیکھ کر رونے لگا۔ کتنی بڑی بے وقوفی ہوئی تھی مُجھ سے۔ میں اب اپنے آپ کو کوس رہا تھا، کتنا بڑا احمق تھا میں؟

بجائے لکڑیوں میں ماچس دکھانے کے، میں نے پستول میں کارتوس بھرنے شروع کر دئیے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو اب تک تو آگ بُری طرح بھڑک رہی ہوتی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پچھتانا بے کار تھا اور چڑیاں کھیت چُگ گئی تھیں۔

برفانی دیو نے ایک زبردست قہقہہ لگا کر مُجھے بھی اپنے پیٹ میں اتار لیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ٹھوس برف کے اندر ہونے کے باوجود بھی وہاں سردی مطلق نہ تھی۔ حلق سے لے کر پیٹ تک ایک پھسلن تھی جس کے ذریعے پھسلتا ہوا میں فوراً ہی اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سب کے

سب زندہ اور میری ہی طرح پریشان تھے۔ پیٹ ایک بہت بڑا سفید کمرہ معلوم ہوتا تھا اور اس میں ہوا بھی آ رہی تھی۔ اس بلندی سے ہمیں اپنی کشتی صاف نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ ہم کمرے کی کھڑکیوں میں سے جھانک رہے ہوں۔ اختر بڑی بے چینی کے عالم میں کشتی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کی یہی بے چینی گھبراہٹ اور چیخیں اس کے لئے مضر ثابت ہوئیں۔ برفانی دیو کی نظر اچانک اس پر پڑ گئی اور پھر برف کا ہاتھ اختر کی طرف بڑھا، اختر نے بھاگنے کی کوشش کی مگر دھڑام سے کشتی کے پاس ہی گر گیا میرے دِل میں ایک دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ میری نظروں کے سامنے میرا پیارا بیٹا اس خوفناک برفانی انسان کی گرفت میں آنے والا تھا اور میں بے بس و مجبور برف کے قید خانے میں بند تھا اور اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے کُچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیسی بے کسی کی حالت تھی اور کتنی پریشانی کا وقت تھا!

برفانی آدمی نے اختر کی ٹانگ پکڑ کر اسے اُٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اختر کا بندر بھی آیا۔ خود کو پھنستے دیکھ کر اختر نے ہاتھ پاؤں مارے، چوں کہ اس کا سر اس وقت نیچے تھا اس لئے اس کے گلے میں سے آفاقی ہار نکل کر کشتی میں جا پڑا۔

اور اب جو میں نے ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ہار سیدھا نجمہ کے گلے میں جا کر گِرا تھا۔ یہ دیکھ کر مُجھے بہت افسوس ہوا۔ آفاقی ہار میں اگر کُچھ کرامت تھی تو اختر کے گلے میں پڑے رہنے ہی سے ظاہر ہو سکتی تھی۔ مگر اب یہ ہار اختر کے گلے میں نہیں تھا اور زہروی سائنس داں شاگو کے کہنے کے مطابق اسے اختر ہی کے گلے میں ہونا چاہیئے تھا۔ آفاقی ہار ہماری آخری اُمّید تھی اور اب وہ بھی جاتی رہی۔

نجمہ ایک تو لڑکی تھی دوسرے بے ہوش، وہ ہمارے لئے کیا کر سکتی تھی؟ اختر میں پھر بھی ہمّت تھی، وہ ہمیں اس قید سے چھڑا سکتا تھا۔ مگر

اس وقت تو وہ بھی بے بس تھا کُچھ ہی لمحوں بعد اختر بھی برفانی انسان کے مُونہہ میں سے ہوتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر نا اُمّیدی کے آنسو میرے گالوں پر بہنے لگے۔ سبھی ساتھیوں نے مُجھے تسلّی دینی چاہی لیکن ایسی حالت میں تسلّی اور ہمدردی سے بھی انسان کو تکلیف پہنچتی ہے لہٰذا میں اور بے تاب ہو کر رونے لگا۔ برفانی آدمی نے جب یہ دیکھا کہ اب اس سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی بھی سامنے نہیں ہے تو اس نے آسمان کی طرف مُونہہ اٹھا کر زور زور سے خُوشی کی کئی چیخیں ماریں۔ ہاتھوں سے کُچھ اشارے کئے اور ہم سب کو اپنے پیٹ میں بد حواس دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ جان نے پریشانی کے عالم میں مُجھ سے کہا۔

"فیروز۔۔۔ یہ حالت بڑی خطرناک ہے۔ نجمہ کا نہ جانے اب کیا ہوگا اور خُدا ہی بہتر جانے کہ اب ہمارا حشر کیا ہونے والا ہے؟"

"اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوئی ترکیب نہیں ہے؟" امجد نے پوچھا۔

"افسوس غفلت میں ماچس کی ڈبیا میں وہیں لکڑیوں کے پاس بھول آیا۔" میں نے آہستہ سے کہا، اگر ماچس کی ڈبیا ہمارے پاس ہوتی تو شاید ہم اس دیو کے پیٹ کو پگھلا سکتے تھے!"

"اور اب ایسا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔" سوامی نے نااُمّیدی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابھی اُمّید تو ہے۔" امجد نے کشتی کی طرف نظریں جما کر کہا۔ "نجمہ کو اگر ہوش آجائے تو شاید وہ ہمارے لئے کُچھ کر سکتی ہیں۔"

امجد کے یہ کہتے ہی ہماری نگاہ کشتی پر پڑی۔ اور پھر یہ دیکھ کر مُجھے بڑی خُوشی ہوئی کہ نجمہ کو ہوش آچکا تھا۔ آفاقی ہار جب اس کے گلے میں گرا ہو گا

تو اس کے گرنے سے ہی نجمہ کو ہوش آیا ہو گا۔ نجمہ لڑکی تھی اور ہم سب اسے کمزور سمجھتے تھے مگر یہ دیکھ کر میرے تعجّب کی انتہا نہ رہی کہ نجمہ جلدی سے کشتی میں کھڑی ہو گئی۔ پہلے تو اس نے حیرت سے آفاقی ہار کو اپنے گلے میں دیکھا اور پھر اس نے برف کے اس خوفناک دیو کو دیکھا جو اب خود بھی نجمہ کو گھور رہا تھا۔ نجمہ اس دیو کو دیکھ کر بُری طرح چونکی اور قدرتی طور پر جلدی سے کشتی کی آڑ میں ہو گئی۔ اِدھر ہم سب نے برف کے قید خانے میں سے چیخنا اور ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ نجمہ نے اب ہمیں دیکھ لیا تھا اور بڑی بے چینی اور خوف کے انداز میں وہ ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے چلّا چلّا کر اور ہاتھ سے ماچس جلانے کا اشارہ کر کے نجمہ کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ماچس برفانی انسان کے گھٹنوں کے پاس پڑا ہے اور وہ جلدی سے آ کر ان لکڑیوں میں آگ لگا دے۔

مگر نجمہ ان اشاروں سے کُچھ بھی نہ سمجھی۔ گونگے بہروں کی یہ زبان بھلا

اس کی سمجھ میں کیسے آتی، ان سب باتوں کے باوجود نجمہ میں اب میں ایک تبدیلی پا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے خوف دور ہوتا جا رہا تھا اور برفانی انسان کو دیکھ کر اسے اب ذرا بھی ڈر نہ لگ رہا تھا۔۔۔ کشتی میں سے آہستہ سے وہ نیچے اتری اور پھر دیو کے قریب آنے لگی۔ میری بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب نجمہ کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو اب سے کُچھ عرصہ پہلے ہم سب کا ہو چکا تھا۔ میں پریشانی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا اور امجد بار بار ہاتھ ہلا کر اسے اشاروں سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لکڑیوں کو آگ لگا دے۔

اور پھر یہ دیکھ کر مُجھے ناقابل بیان حیرت ہوئی کہ نجمہ کسی حد تک امجد کی بات سمجھ گئی۔ اس نے پہلے لکڑیوں کو دیکھا اور پھر خود ہاتھ سے ماچس جلانے کا اشارہ کر کے پوچھا کہ کیا امجد یہی چاہتا ہے؟

امجد نے جلدی جلدی گردن ہلائی اور نجمہ دیو کو دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ

لکڑیوں کی طرف آنے لگی۔ اس کے اس اطمینان کو دیکھ کر برفانی انسان
نے ایک زبردست قہقہہ لگایا، جس کی گونج کے باعث نجمہ برف پر گر پڑی
مگر پھر فوراً ہی کھڑی ہو گئی اور دیو کے نیچے گرتے ہوئے ہاتھوں سے بچنے
کی کوشش کرتی ہوئی وہ لکڑیوں کی طرف قدم بڑھانے لگی۔۔۔ لکڑیوں
سے نجمہ کا فاصلہ اب مشکل سے کوئی پندرہ گز رہ گیا ہو گا۔ اسے صرف بیس
قدم بڑھانے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ شاید پانچ قدم بھی نہیں بڑھا سکے
گی کیونکہ برفانی ہاتھ اب اسے دبوچنے ہی والے تھے۔ نجمہ ڈرتی اور سہمتی
ہوئی نیچے جھکنے لگی۔ وہ ان ہاتھوں کی گرفت سے بچنا چاہتی تھی اور پھر
قریب ہی تھا وہ وقت کہ وہ ان ہاتھوں کے شکنجے میں ہوتی کہ اچانک۔۔۔

اچانک آفاقی ہار میں سے نگاہوں کو چندھیا دینے والی ہزاروں کرنیں نکلیں
اور فضا میں بجلی کی طرح تڑپنے لگیں۔ ان کرنوں کو دیکھتے ہی برف کے اس
خوفناک انسان نے ایسی بھیانک چیخیں ماریں کہ سمندر کا پانی بھی ان چیخوں

کے زور سے اوپر اچھلنے لگا۔ برفانی انسان نے گھبرا کر اپنے ہاتھ اوپر کر لیے، نجمہ اتنا موقع پاتے ہی لکڑیوں کے پاس پہنچ چکی تھی اور ماچس برف کی زمین پر تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی، برفانی دیو نے ایک بار پھر نجمہ کو پکڑنے کی کوشش کی مگر آفاقی ہار کی قاتل شعاؤں نے ایسے ایسا نہ کرنے دیا۔

نجمہ ہار سے نکلنے والی کرنوں کو دیکھ کر خود بھی ڈر سی گئی تھی۔ مگر شاید کوئی طاقت ایسی تھی جس نے نجمہ کو حیران ہونے کا موقع ہی نہ دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے نجمہ کو سب کُچھ معلوم ہے اور آفاقی ہار کے اس کرشمے کا اسے پہلے ہی سے پتہ تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے اس بات کے سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر ماچس کو اور تیزی سے تلاش کرنا شروع کر دیا اور آخر کار ماچس اسے مل گیا۔ ماچس ہاتھ میں لے کر اس نے ہمیں ایک بار پھر دیکھا گویا پوچھ رہی ہو کہ اب وہ کیا کرے ؟

اس پر ہم سب نے اپنے ہاتھوں سے ماچس جلانے کے اشارے کرنے شروع کر دئیے۔ اس وقت ہم میں جوش بھرا ہوا تھا اور ہمیں ہر وہ لمحہ جو نجمہ ضائع کر رہی تھی بُری طرح کھِل رہا تھا۔ ہمارا بس نہ چلتا تھا کہ خود نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر ماچس جلا دیں۔ برفانی انسان نے جب ایک بار ہم لوگوں کو اپنے پیٹ میں اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تو اس کے سفید چہرے پر ظلم اور غصہ جھلنے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے جان سے کہا۔

"اس ملعون کو شاید بہت غصّہ آ رہا ہے، مگر جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں وہ نجمہ کا کُچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ آخر یہ کیا بات ہے؟"

"ہم لوگوں نے بڑی بے وقوفی کی بات سوچی تھی فیروز۔" جان نے کہا۔ "شاگو نے آفاقی ہار دراصل نجمہ کے لئے ہی دیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ نجمہ لڑکی ہے اور کمزور ہے اس لئے شاید ہار اس کے لئے نہیں ہے، مگر اب احساس ہوتا ہے کہ صرف نجمہ کی بدولت ہی ہماری جان بچ سکتی ہے۔"

"بلونت اس بات کا مخالف تھا کہ نجمہ کو سفر میں ساتھ لے جایا جائے، مگر اب یوں لگتا ہے کہ اگر نجمہ اس سفر میں نہ ہوتی تو شاید ہمیں اپنی زندگی کی اُمّید ہی نہ ہوتی۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر نجمہ آگ جلانے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی ہے؟" سوامی نے گھبرا کر پوچھا۔

"میرے خیال میں شاید اُن سے ماچس نہیں جل رہا ہے، برف پر پڑے پڑے وہ گیلا ہو گیا ہے۔" امجد نے بے تابی سے کہا۔

"پھر اب کیا ہو گا؟" جیک نے پریشانی سے پوچھا۔

"خُدا جو چاہے گا وہ ہو گا۔" جان نے جواب دیا۔ "اگر اُسے ہمیں زندہ رکھنا ہے کہ تو پھر ہم ضرور بچ جائیں گے۔"

"دیکھئے، دیکھئے برفانی ہاتھ پھر اُن کی طرف بڑھنے لگا ہے۔" امجد کا بس نہ چلتا

تھا کہ خود وہاں پہنچ جائے۔

جسم کے ملنے سے برفانی انسان کا پیٹ بھی ملنے لگا اور ہم نے اس ملتے ہوئے قید خانے میں سے دیکھا کہ جوں ہی وہ بھیانک ہاتھ نجمہ کی طرف بڑھے، اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہار میں سے وہی نورانی مگر قاتل شعاعیں نکلیں اور دیو نے زبردست چیخوں کے ساتھ اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔

نجمہ کے چہرے پر کیا مجال ہے کہ ذرا سا بھی ڈر نظر آیا ہو۔ نجمہ کو اس روپ میں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اور مُجھے اس کے رویّے کی تبدیلی پر ذرا سی بھی حیرت یوں نہیں تھی کہ میں اب اچھّی طرح جان چکا تھا کہ یہ سب آفاقی ہار کا نرالا کرشمہ ہے۔ شاگو نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ یہ ہار اسے پہنا دیا جائے جس کے چہرے پر کبھی بال نہیں اُگتے۔ بس پھر آپ اس کا کرشمہ دیکھئے گا۔ اور وہ کرشمہ ہم اس وقت دیکھ رہے تھے۔ اس نے نجمہ جیسی ڈرپوک لڑکی کو اتنا نڈر بنا دیا تھا کہ وہ اب بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ٹکرانے کا

حوصلہ رکھتی تھی!

اُس کی حالت اس وقت عجیب تھی۔ شاید امجد کا کہنا ٹھیک تھا کہ ماچس برف پر پڑے پڑے گیلا ہو گیا ہے۔ نجمہ بار بار ماچس کو کھول کر دیا سلائی نکالتی اور پھر اُسے رگڑتی مگر پھر فوراً ہی جھنجھلا کر نیچے پھینک دیتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جوں جوں نجمہ اپنے اس کام کو تیزی سے کرتی توں توں برفانی انسان کا غصّہ بڑھتا جاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب وہ بھی نجمہ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ڈرنے لگا تھا۔ کئی بار اس نے کوشش کی کہ ہاتھوں کو نیچے لے جائے مگر پھر فوراً ہی گھبرا کر اس نے ہاتھ کھینچ لئے۔ ہم لوگ اپنے برف کے قید خانے میں سے نجمہ کو اشارے کر رہے تھے کہ وہ جتنی جلد ہو سکے دیا سلائی جلا لے۔ مگر بے چاری نجمہ ہمارے اشاروں کا جواب اپنی گردن نفی میں ہلا کر دیتی۔ گویا کہہ رہی ہو کہ یہ کام مُجھ سے نہیں ہوتا!

برفانی انسان کی بے بسی اور بے تابی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ پتہ

نہیں کیا بات تھی کہ وہ سمندر سے نکل کر اوپر نہیں آ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے قدم سمندر کی تہہ سے لگے ہوئے ہوں اور کوئی خاص طاقت اسے قدم اٹھانے سے روکتی ہو! کُچھ ایسی ہی بات ضرور تھی۔ اس کے سفید چہرے پر غم و غصّہ چھایا ہوا تھا۔

ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ تیزی سے نجمہ کی طرف بڑھائے اور جیسے ہی یہ ہاتھ نجمہ کے قریب پُہنچے تو میں نے دیکھا آفاقی ہار میں سے کرنیں نکلیں اور دیو کے ہاتھوں کو جھلسا گئیں۔ مگر میں نے صرف یہی نہیں دیکھا ایک اور بات بھی میں نے دیکھی جس کی وجہ سے میرا دِل خُوشی کے باعث بلیوں اچھلنے لگا۔ ان کرنوں کی نظر نہ آنے والی گرمی سے نجمہ کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں جو ماچس تھا، اب اس میں اچانک آگ لگ گئی تھی۔۔۔!

یہ عجیب واقعہ تھا۔ ماچس میں اتنی زبردست آگ لگی تھی کہ مُجھے ڈر ہوا کہ یہ

آگ کہیں نجمہ کے ہاتھوں کو جھلسا نہ دے، نورانی کرنوں اور ماچس کے دھوئیں کی بدولت نجمہ مُجھے بالکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ برفانی انسان کا پیٹ زور زور سے ہِل رہا تھا اور ہمیں اچھّی طرح نظر بھی نہیں آ رہا تھا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے؟

برف کے اس دیو کے ہاتھ شاید کافی جل گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تکلیف کے باعث وہ بار بار اپنے ہاتھ جھٹک رہا تھا اور اس کی بلبلاہٹ کی وجہ سے اس کا پیٹ اور زیادہ ہلنے لگا تھا۔ ہم لوگ اس وقت اس کے پیٹ میں جامنوں کی طرح گھُل رہے تھے اور ہمیں یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ نجمہ نے جلتا ہوا ماچس لکڑیوں پر ڈالا یا نہیں؟

اچانک جیسے زلزلہ آ گیا۔ برفانی انسان بُری طرح لرزنے لگا۔ اُس کے پیٹ کے باہر ہمیں ست رنگے شُعلے ناچتے ہوئے نظر آئے۔ شعلوں کی لمبی لمبی زبانیں شاید برفانی انسان کے مُونھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ دیکھتے

ہی ہم نے خُوشی کا نعرہ مارا۔ نجمہ نے ماچس لکڑیوں پر یقیناً پھینک دیا اور ان میں اب آگ لگ چکی تھی۔ برف کی کھڑکی سے جھانکنے پر مُجھے نجمہ نظر آئی جو تیزی سے بھاگتی ہوئی کشتی کی طرف جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ہمیں بڑی خوفناک چیخیں سُنائی دینے لگیں۔ دیو کا پیٹ پگھل رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب ہمیں باہر کی آوازیں سُنائی دینے لگی تھیں۔ ہم لوگوں کے لئے یہ بڑی مُصیبت کا وقت تھا ہمیں یقین تھا کہ جیسے ہی دیو کا پیٹ پگھلے گا ہم تیزی سے نیچے کی طرف گریں گے اور نیچے آگ جل رہی تھی۔ وہی بات ہو جاتی کہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا!

ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں کہ اچانک پیٹ پگھل گیا اور ہمارے سامنے آگ کی لپٹیں لہرانے لگیں۔ اتنی بلندی سے ہم کسی طرح بھی نیچے نہیں کود سکتے تھے اور دوسرا کوئی ذریعہ ہمیں اپنے چھٹکارا پانے کا نظر نہیں آتا تھا۔

ہم نے کُچھ ہی دیر بعد محسوس کیا کہ دیو لڑکھڑانے لگا ہے۔ شاید اس کی رانیں اور گھٹنے بھی اب پگھلنے لگے تھے۔ یہ محسوس کرتے ہی خوف کی وجہ سے ہمارے دِل لرز گئے۔ دیو اگر مُونہہ کے بل برف پر گرتا تو ہم کسی طرح بھی نہیں بچ سکتے تھے۔ حیرت اور ڈر کے ساتھ ہم ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ دیو کے پیٹ میں جو برف کی دیواریں تھیں ہم ان سے چمٹ گئے۔ سطح سمندر سے اس وقت ہم اندازاً ڈھائی سو فٹ بلند تھے۔ لپکتے ہوئے شعلوں کے درمیان ہم نے نجمہ کو دیکھا جو کشتی کے پاس کھڑی ہوئی بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ برف کا انسان چیخیں مارتا ہوا اب بُری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ کبھی وہ آگے کی طرف جھک جاتا اور کبھی پیچھے کی طرف۔ اس کی رانیں اب پانی بن رہی تھیں اور کسی بھی وقت وہ نیچے گِر سکتا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ برفانی انسان مُونہہ کے بل زمین پر

گرنے لگا۔ میں نے اختر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے انجام کا تصوّر کرتے ہوئے کانپنے لگا۔ امجد، جیک اور سوامی نے بڑی بھیانک چیخیں ماریں اور جان کراہ کر برف کی دیوار سے چمٹ گیا۔ ہم نے سمجھ لیا کہ بس اب ہمارا خاتمہ ہے۔ سب نے اپنی آنکھیں بھینچ لیں تاکہ اپنے عبرتناک انجام کو ہم اپنی ہی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ برف کی زمین تیزی سے ہماری طرف آتی جارہی تھی۔

اچانک ایک زور کا چھپاکا ہوا۔ پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا ہوا؟ لیکن جب میں نے اپنے حواس قابو میں کیئے اور میرا دماغ کُچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے دیکھا کہ سمندر کے اندر پڑا ہوں اور اگر جلد ہی میں نے اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں نہ چلائے تو ڈوب جاؤں گا۔ خود کو زندہ پا کر مُجھ میں اچانک ہمّت پیدا ہو گئی۔ سب سے پہلے تو میں نے اختر کو سینے سے الگ کر کے اپنے کندھوں پر چڑھا لیا اور پھر دیکھا کہ کُچھ ہی فاصلے پر امجد،

جیک اور سوامی جان کو اپنے درمیان میں لئے ہوئے تیر رہے ہیں۔ جان یقیناً بے ہوش ہو گیا تھا۔ آدمی بے شک وہ بہادر تھا مگر بڑھاپے کے باعث اب اس کے حواس بھی جواب دے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے ایک محسن کے ڈوب جانے کا اختر کے ساتھ ساتھ مُجھے بھی افسوس ہوا۔ یہ اختر کا بندر تھا جس نے ایک موقع پر ہم سب کی جان بچائی تھی۔ اب یہی بندر اختر کے کندھے پر سے کود کر شاید پانی میں غرق ہو چکا تھا!

ہم نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور پھر جلدی جلدی ہاتھ ہلائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہم زندہ ہیں۔ اس کے بعد میں نے ہر طرف نظر دوڑائی، کوئی دو سو فٹ کے فاصلے پر مُجھے اپنی کشتی نظر آئی جس میں نجمہ کھڑی ہوئی خُوشی سے چلّا رہی تھی اور جواب میں بار بار اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جس جگہ ہم تیر رہے تھے وہاں سے لے کر کشتی تک ہمیں ایک سفید سی دیوار نظر آئی جو یقیناً اس برفانی انسان کا جسم تھا۔ اب مُجھ پر پوری حقیقت کھلی۔ کشتی کو

اگر مرکز مان لیا جائے تو اس سے نصف فرلانگ کے دائرے کا پانی برف بنا تھا۔ مطلب یہ کہ برفانی انسان جب برف کی اس زمین پر گرا تو اس کے پیٹ سے نیچے کا حصّہ ہی برف کی زمین سے ٹکرایا۔ ہم لوگ چونکہ پیٹ میں تھے اور پیٹ سمندر میں گرا تھا اس لئے ہمارے چوٹ نہیں لگی اور ہم بچ گئے۔ اپنی جان بچ جانے پر میں نے خُدا کا شکر ادا کیا اور پھر کشتی کی طرف تیرنے لگا۔ میرے ساتھ ہی باقی سب بھی جان کو سنبھالے ہوئے تیرنے لگے۔

کشتی میں آنے کے بعد جب ہم اچھّی طرح سستا چکے تو گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرنے لگے اور ساتھ ہی نجمہ کو حیرت اور تعجّب سے دیکھنے لگے۔ اس میں تو اب کسی طرح کا شُبہ ہی نہ تھا کہ آفاقی ہار دراصل نجمہ ہی کے لئے تھا۔ شاگو نے کہا تھا کہ یہ ہار اسے پہنایا جائے جس کے گالوں پر کبھی بال نہ آئے ہوں اور نہ کبھی آئیں۔ لڑکیوں کے بال کبھی نہیں

آتے۔ اس لحاظ سے نجمہ ہی اس ہار کی مستحق تھی اور اس سفر میں اگر نجمہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو شاید یہ سطریں لکھنے کے لئے میں زندہ ہی نہ ہوتا۔

خُدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ نجمہ جس وقت چوری چھپے میرے اسٹیمر میں آئی تھی، اس وقت بھلا مُجھے کیا معلوم تھا کہ خُدا ایک دِن اسی لڑکی کو ہم سب کی جانیں بچانے کا ذریعہ بنائے گا!

میں اپنی داستان کی طوالت کی وجہ سے مجبور ہوں کہ اس وقت کی آپس میں کی ہوئی باتوں کو چھوڑ دوں۔ مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ مختلف پھل اور ناریلوں کا پانی پینے کے بعد ہم لوگ تازہ دم ہو گئے اور ہمارا وہ سفر پھر شروع ہو گیا۔ جو ہماری قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ اب یہ بات ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہو چکی تھی کہ برفانی انسان دراصل جیگا کا ہی بھیجا ہوا تھا۔ اگر آفاقی ہار ہمارے پاس نہ ہوتا تو جیگا سے ٹکر لینا آسان کام ہرگز نہ تھا۔ برفانی دیو پانی میں گھل کر اب پانی بن چکا تھا اور فی الحال ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نجمہ کو

ہم نے یہ رائے دی کہ آفاقی ہار کو اپنے گلے میں گلوبند کی طرح کس کر پہن لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہار کی طرح ڈھیلا ہونے پر وہ کسی آنے والے حادثے میں اس کے گلے سے نکل جائے اور خواہ مخواہ ہمیں شاگو سے شرمندہ ہونا پڑے۔ نجمہ نے ہماری بات مان کر ایسا ہی کیا۔ اور تب ہمیں ایک حد تک اطمینان ہو گیا۔

شام ہو رہی تھی۔ آبی پرندے آسمان میں اڑنے لگے تھے اور سورج آہستہ آہستہ سمندر کی طرف جھُک رہا تھا۔ شام کے وقت سمندر کی اچھلتی اور تڑپتی لہریں بھی خاموش ہو جایا کرتی ہیں۔ اس وقت بھی ایسی ہی حالت تھی۔ سمندر میں بہت کم لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور ہماری کشتی ایک نامعلوم منزل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر جان نے، جواب پوری طرح ہوش میں آچکا تھا مُجھ سے کہا۔

"فیروز۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔"

"فرمائیے۔"

"میں بہت دیر سے ان پرندوں کو دیکھ رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے خیال نہیں کیا تھا۔ مگر اب جو غور کیا ہے تو ایک بہت ہی کارآمد بات مجھے سوجھی ہے۔"

"وہ کون سی؟" امجد نے اشتیاق سے پوچھا۔

"پرندے زیادہ تر ایک ہی سِمت پرواز کر رہے ہیں۔ اگر سورج کی طرف ہم اپنا مُونہہ کر لیں تو ہمارے دائیں طرف شمال ہے۔ اور بائیں طرف جنوب۔ اس لحاظ سے یہ پرندے جنوب کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ شام ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ اب یوں سوچو کہ یہ پرندے شام ہونے سے پہلے پہلے اپنے آشیانوں میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ابھی چند منٹ پہلے ہی سے جنوب کی طرف پرواز کرنا شروع کیا ہے۔ ورنہ پہلے یہ سمندری مچھلیاں پکڑنے میں منہمک تھے۔ میرے خیال میں آس

پاس ہی جنوب کی سمت میں کوئی جزیرہ ہے جہاں ان پرندوں کے گھونسلے ہیں۔"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "ہو سکتا ہے کہ جزیرہ میلوں دور ہو!"

"یہ بات نہیں ہے۔ ایک ماہی گیر جب سمندر میں جال ڈالنے کے لئے اپنے گھر سے کافی دور سمندر میں پہنچ جاتا ہے اور دِن بھر شکار کھیلتا رہتا ہے تو پھر واپس آنے کے لئے ایک خاص وقت میں ہی چلتا ہے۔ مثلاً وہ یہ جانتا ہے کہ اگر میں شام کے چار بجے واپس لوٹوں گا تو شام کے چھ بجے دِن ہی دِن میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ یہی حال ان پرندوں کا ہے۔ رات ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے، ابھی کُچھ دیر پہلے پرندے شکار کھیلنے میں مصروف تھے۔ مگر اچانک چند منٹ پہلے ہی وہ جنوب کی طرف پرواز کرنے لگے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ ان کا گھر یا پھر جزیرہ اس

مقام سے جہاں ہماری کشتی ہے، صرف ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے، بشرطیکہ ہماری رفتار بھی پرندوں جتنی ہو۔"

"واہ واہ۔۔۔ واہ واہ۔۔" اختر نے خُوشی سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

"واقعی یہ تو آپ نے بڑی کارآمد بات نوٹ کی۔" میں نے خُوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں چپّو دوبارہ سنبھال لینے چاہئیں؟" امجد نے جیک اور سوامی سے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ اس طرح اگر ہم ایک گھنٹے میں نہیں تو چار گھنٹے میں تو ضرور کسی زمین تک پہنچ جائیں گے۔" سوامی نے چپّو چلاتے ہوئے کہا۔

درحقیقت جان نے یہ بہت ہی عمدہ بات سوچی تھی۔ ایک ایک چپّو پر ہم دو

دو آدمی لگ گئے اور ہم نے کشتی اپنی پوری قوّت سے چلانی شروع کر دی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ صرف اُفق پر ہلکی سی نارنجی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہم کُچھ دیر تک تو اس روشنی کو مغرب سمجھ کر کشتی چلاتے رہے اور جب یہ روشنی بھی غائب ہو گئی تو کشتی کو اندازے سے چلانا پڑا۔ اب ہر طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ آسمان صاف تھا اور اس میں ننّھے منے ستارے جھلملانے لگے تھے۔ کسی قسم کی کوئی آواز نہ تھی۔

چپ چپ چپ چپ، بس صرف چپّوؤں کی یہی آواز ہمیں رہ رہ کر سُنائی دے رہی تھی۔ دونوں بچّے، جان اور میں خاموش بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ سوامی، جیک اور امجد چپّو چلا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ پے در پے ہم پر کئی مُصیبتیں نازل ہو چکی ہیں۔ آخر یہ مُصیبتیں کبھی ختم بھی ہوں گی یا ہم اس طرح بلاؤں میں گھِرے رہیں گے۔ رات کے وقت کشتی کسی اَن جانی سِمت میں چلانا اب دشوار تھا۔ کیوں کہ کشتی کا رُخ جنوب

کی طرف اب کسی بھی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ دِل یہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ہم کسی زمین تک پہنچ جائیں۔ در حقیقت اسی اُمّید پر ہم لوگوں میں کشتی چلانے کی ہمّت پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ اگر کوئی مُجھے نرم نرم گدّوں پر سونے کے لیے کہتا تو شاید میں لگاتار ایک مہینے تک سوتا رہتا!

میری آگے کی داستان کو سُننے کے لئے اب پتھرّ کے دِل گردے والے آدمی کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میں سے وہ لوگ جو کمزور دِل و دماغ کے ہیں، اس کتاب کو گھبرا کر بیچ میں ہی بند کر کے رکھ دیں۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ مُصیبت کی جو کہانی اب میں آپ کو سُنانے والا ہوں وہ ایسی ہے کہ جسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو آفتیں اور مصیبتیں اس رات کے بعد مُجھ پر نازل ہوئیں۔۔۔ اف میرے خُدا۔۔۔ میں کس طرح بیان کروں!

مختصراً اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ شاید ایسی مُصیبت دنیا میں آج تک کسی انسان نے نہ اٹھائی ہوگی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ چار گھنٹے گزرنے کے بعد ہمیں جزیرہ مل گیا ہوگا۔ جی نہیں، بلکہ وہ پوری رات لگاتار جاگتے اور اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے میں گزر گئی، مگر زمین تو کیا ایک چھوٹا سا کنکر بھی ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ سورج زمین کا نصف چکر لگا کر مشرق سے طلوع ہو گیا تھا۔ پرندے آسمان پر اُڑ کر چہچہانے لگے تھے مگر جزیرہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ جب میں نے ذرا غور سے پرندوں کی پرواز کا رُخ دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب وہ مشرق سے مغرب کی طرف اڑ رہے ہیں۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے، کل تو اِن کا رُخ شمال سے جنوب کی سمت تھا! کہیں راتوں رات ہماری کشتی نے اپنا مُونہہ تو نہیں پھیر لیا، کُچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

آگے کی باتیں لکھتے ہوئے میرا دِل لرزتا ہے۔ میں کس طرح کہوں کہ ہم

اس سنسان سمندر میں پورے ایک مہینے تک بہتے رہے، کیسے لکھوں کہ ہم مُردوں سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ کس طریقے سے اس حقیقت کو بتلاؤں کہ اتنے عرصے تک ہمیں کوئی جزیرہ نہیں ملا!

یہ باتیں لکھتے ہوئے میرا کلیجہ مُونہہ کو آتا ہے۔ موت کے وقت سسکتے ہوئے آدمی کی حالت پھر بھی بہتر ہو سکتی ہے، مگر ہماری نہ تھی۔ کشتی میں کھانے پینے کا جو سامان تھا وہ سب ختم ہو چکا تھا۔ ناریلوں کا پانی ہی نہیں بلکہ ہم اس کا گودا اور اس کی چھال بھی کھا گئے تھے۔ بھوک میں تو کواڑ بھی پاپڑ معلوم ہوتے ہیں اور آپ کو یہ سن کر ہماری بے بسی پر رونا آئے گا کہ ہم نے چمڑے کی سب چیزیں مثلاً پیٹیاں، پستول کے خول اور انتہا تو یہ ہے کہ جوتے تک کھا لئے۔

اپنی نو عمری کے زمانے میں ایک بار میں نے مشہور مزاحیہ اداکار چارلی چپلن کی ایک فلم دیکھی تھی جس کا نام "گولڈ رش" تھا۔ اس فلم میں ایک جگہ

چارلی بھوک سے بے تاب ہو کر اپنا جوتا اُبال کر کھاتا ہے۔ تب اِس منظر کو دیکھ کر میں بہت ہنسا تھا اور مُجھے کُچھ کراہت بھی آئی تھی۔ کشتی کے اندر جوتے کھاتے وقت مُجھے وہی منظر یاد آگیا۔ غم کی وجہ سے میں پاگل سا ہو گیا اور بُری طرح قہقہے لگانے لگا۔ میرے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے۔ بغیر اُبلے ہوئے جوتے کا ایک ٹکڑا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس کا ایک کنارا کُتر لیتا تھا۔ اور جب اُسے چبانے میں تکلیف ہوتی تھی تو بُری طرح ہنستا تھا۔ مُجھے کیا معلوم تھا کہ بچپن میں جس فلم کے منظر کو دیکھ رہا ہوں اور زور زور سے قہقہے لگا رہا ہوں۔ یہی قہقہے مُجھے ایک بار پھر لگانے پڑیں گے مگر ان کی دوسری نوعیت ہوگی!

میرے اللہ! یہ کیسا عذاب تھا، کیسی مُصیبت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ ہم جہنّم میں کہیں بھٹکتے پھر رہے ہوں۔ ایک دوسرے کی حالت دیکھ کر اب ہم غم بھرے قہقہے لگاتے تھے۔ میں آپ سے کیا بیان کروں کہ ہماری

حالتیں کیا تھیں! جان کی حالت تو ایسی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مر چُکا ہے۔ سوامی اور جیک چپّوؤں سے چمٹے ہوئے بالکل بے ہوش تھے۔ اختر کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس وہ ایک ہی سِمت دیکھے جا رہا تھا۔ امجد ناز و نعم میں پلا ہوا نوجوان تھا۔ حالت اس کی بے حد خراب تھی مگر نجمہ کی موجودگی میں وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نجمہ خاموش بیٹھی ہوئی اُچھلتی اور تڑپتی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ ہم سب کے کپڑے اب تار تار ہو چکے تھے۔ پتلونیں سب کی پھٹ کر اب جانگیے بن گئی تھیں۔ قمیصیں تو کافی عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھیں، کُچھ پھٹی پرانی اگر رہ بھی گئی تھیں تو وہ ہم نے نجمہ کو پہنا دی تھیں۔

جس دِن کا میں ذکر کر رہا ہوں اس دِن تو یہ حالت تھی کہ سوائے پیوند لگے ہوئے جانگیوں کے کسی کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ نجمہ کی شرمندگی کے مارے بُری حالت تھی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے سیاہ بالوں سے اپ نے

جسم کو ڈھک رکھا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ ان بالوں کو آگے سے پکڑے رہتی تھی اور کسی وقت بھی ہم سے آنکھیں ملا کر بات نہ کرتی تھی بلکہ کوشش کرتی تھی کہ صرف اس کی کمر ہی ہمارے سامنے رہے۔ یہ حالت ایسی تکلیف دہ تھی کہ جس نے مُجھے اور غمزدہ کر دیا تھا۔ ہمارے حلق خشک تھے، زبانیں سوکھ گئی تھیں، اور گال پچک کر ہڈّیوں سے جا لگے تھے۔ متواتر تیز دھوپ اپنے ننگے جسموں پر برداشت کرتے کرتے یہ جسم اب سیاہ ہو گئے تھے۔ افریقی جیک میں اور ہم میں اب کوئی تمیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔ دھوپ کی وجہ سے ہماری کھالیں جل گئی تھیں اور کئی جگہ سے تو ان میں سے خون بہنے لگا تھا۔ کھانے پینے اور پہننے کے لئے اب ہمارے پاس کوئی چیز نہ تھی اور ہم اب خُدا سے اپنی موت کی دعائیں مانگ رہے تھے!

سمندر کے پانی کو میں نے کئی بار پینا چاہا مگر اس کے کھاری پن سے طبیعت

متلانے لگی۔ جان نے بڑی مجبوری کی حالت میں یہ پانی پیا یہی وجہ تھی کہ وہ سخت بیمار پڑ گیا اور اب ہمیں اُمّید تھی کہ ہم سب میں سے پہلے وہی مرے گا۔ یہ عجیب وقت تھا اور مُجھے یقین ہے کہ ایسا وقت کسی انسان پر شاید کبھی نہ گذرا ہو گا۔۔۔!

سوبیا کا ڈبّہ رسّی سے بندھا ہوا بدستور پانی میں بہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں حالانکہ یہ بات بالکل نہ آئی تھی کہ آگے جا کر یہ سوبیا جان کو کیا فائدہ پہنچائے گی، مگر اس ڈبّے کو میں خواہ مخواہ رسّی سے علاحدہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہمیں اپنے بارے میں اب پکّا یقین ہو چکا تھا، کہ ہم شاید ایک دو دِن کے اور مہمان ہیں۔ میں نے نجمہ کی طرف دیکھا تو میرا دِل کانپ اٹھا۔ میری پھول سی بچّی پر کتنی مُصیبتیں ٹوٹ پڑی تھیں اور اس وقت وہ کتنی اداسی کے ساتھ سمندر کی بہتی ہوئی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی اداسی دور کرنے کی خاطر کہا۔

"نجمہ بیٹی کیا دیکھ رہی ہو۔ ۔ ۔ ؟"

"میں۔ ۔ ۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں ابّا جی کہ سمندر کی ہر لہر ایک دوسرے سے جُدا ہو کر پھر مل جاتی ہے۔ کیا میں بھی اپنی بچھڑی ہوئی امّی سے دوبارہ مل سکوں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے پیٹھ پھیرے پھیرے یہ جواب دیا تھا اور مُجھے اس کی کمر سسکیوں کی وجہ سے ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میرا دِل بے قرار ہو گیا اور میں نے کہا:

"ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں بیٹی۔ کُچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں اب تو صرف خُدا ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"آپ لوگ دِل چھوٹا مت کیجئے۔" امجد نے کہا۔ "خُدا ہمیں ضرور بچائے گا۔"

"خُدا کو اگر ہمیں بچانا منظور ہوا تو ضرور بچائے گا۔" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اپنے بچّوں کے ساتھ ہی مُجھے تمہارا بھی خیال ستاتا ہے امجد۔ تم ناحق ہمارے ساتھ پھنس کراِن مصیبتوں میں گھر گئے۔"

"ایسی بات مت سوچیئے فیروز صاحب۔" امجد کا گلا رندھ گیا۔ "اگر میں آپ کو مُصیبت میں چھوڑ کر واپس بمبئی چلا بھی جاتا تو مُجھے آپ لوگوں کا خیال ستاتا رہتا۔ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے اسے بھلا کون مٹا سکتا ہے۔"

باتیں کرنے سے جسم کی طاقت ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس لئے میں نے باتیں بند کر دیں اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے افق کو دیکھنے لگا۔ سمندر آگے جا کر دُھندلا سا ہو جاتا تھا، اور بہت دور آسمان سمندر سے ملتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اُفق پر نظریں جماتے ہی میں ایک دم چونک گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید یہ میرا وہم ہے مگر جب ذرا غور سے میں نے اِدھر دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے نجمہ،

اختر اور امجد سے کہا کہ وہ بھی اس طرف دیکھیں۔ بہت ہی توجّہ سے دیکھنے کے بعد میرا دِل اچانک زور سے دھڑکنے لگا۔ دِل کو قابو میں کر کے میں نے جلدی سے دوربین کو آنکھوں سے لگایا۔ زبردست خُوشی کے باعث میرا دِل لرزنے لگا اور ہاتھ کپکپانے لگے۔ بہت دور مُجھے سمندر کے کونے پر ایک دھبّہ سا نظر آ رہا تھا اور اس بات کی تصدیق امجد نے بھی فوراً کر دی۔

"کوئی جزیرہ معلوم ہوتا ہے فیروز صاحب۔" خوشی کے باعث اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

"ابّا جی۔۔ ہماری کشتی کا رُخ بھی اُسی طرف ہے۔" نجمہ نے کہا۔ "مگر یہ کتنی دور ہو گا؟"

"میرے خیال میں بیس پچیس میل ضرور ہے۔" میرے بجائے امجد نے جواب دیا۔

"ابّا جی وہاں جلدی چلیئے۔" اختر نے کہا اور بے چارہ خُوشی کے باعث فوراً بے ہوش ہوگیا۔

اپنی رہی سہی ہمّت کو جمع کر کے میں اور امجد یکایک کھڑے ہو گئے۔ شاید یہ خُوشی کا حد سے بڑھ جانا تھا کہ ہم نے بے ہوش اختر کی بھی پروا نہ کی۔ سوامی اور جیک کو چپّوؤں سے اِس طرح علاحدہ کر دیا جیسے وہ دونوں بالکل ناکارہ انسان ہوں۔ یہ سوچے بغیر کہ ان کے کہیں چوٹ نہ لگ جائے ہم نے انہیں دھکّا دے کر ایک طرف پھینک دیا اور پھر چپّوؤں کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئے۔ طاقت تو اب ہم میں تھی ہی نہیں مگر کوشش کر کے تھوڑی بہت طاقت اور ہمّت پیدا کی اور چپّو زور زور سے چلانے لگے۔

"اور زور سے، خوب زور سے، ابّا جی اور زور سے۔" نجمہ ہمیں جوش دلانے لگی۔

زور بھلا ہم سے کیا لگ رہا تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ پانی کے اوپر چپّو چلا رہے

تھے۔ کوئی چپّو کبھی اتّفاق سے پانی کے اندر چلا جاتا تو کشتی ایک جھٹکا لے کر آگے بڑھ جاتی ورنہ ایک ایک دو انچ آگے کھسک رہی تھی۔ ہماری آوازیں سُن کر سوامی نے ہلکی سی آنکھیں کھولیں اور پوچھا۔ "کیا ہم جنّت میں ہیں مالک۔۔؟"

"ارے احمق جلدی اٹھو، سامنے ایک جزیرہ نظر آرہا ہے۔"

"جل جیرہ۔۔۔ نہیں مالک میں جل جیرہ نہیں پیا کرتا۔ مُجھے تو صرف ایک قطرہ پانی کا پلادو۔" سوامی کسی اور ہی دُنیا میں تھا۔

"کلو سوامی جلدی سے چپّو چلاؤ، ہوشیار ہو جاؤ، زمین نظر آرہی ہے۔" نجمہ نے چلّا کر کہا۔

"زمین۔۔۔" سوامی کے بھیجے میں تھوڑی سی بات بیٹھی۔

"ہاں ہاں زمین۔۔۔۔۔۔۔۔ سوامی ہماری مدد کرو۔۔۔" میں نے غُصّے

سے ڈانٹ کر کہا۔

"مالک۔۔۔ میں۔۔۔ میں مرا نہیں زندہ ہوں، بھگوان تیرا شکر ہے۔ مگر آپ نے کہا تھا زمین نظر آ رہی ہے۔ کہاں ہے؟ کِدھر ہے؟" سوامی نے اُٹھ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چونکہ وہ مُجھ سے زیادہ سمندر سے واقف تھا، اس لئے اسے فوراً ہی وہ دھبہ نظر آ گیا جسے ہم جزیرہ سمجھ رہے تھے۔ سوامی نے خُوشی کا ایک نعرہ لگا کر کہا:

"ہاں مالک وہ زمین ہی ہے۔ بھگوان تیرا شکر ہے۔"

"تم بڑے احمق ہو سوامی، ارے بے وقوف چپّو چلانے میں ہماری مدد کرو۔" میں نے اسے پھر ڈانٹا۔

سوامی کی سمجھ میں اب بات آئی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے جلدی سے

آگے بڑھا اور پھر میرے ساتھ مل کر چپّو چلانے لگا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی محنت اور مشقت کے بعد ہم جزیرے تک پُہنچے ہیں۔ اگر میں اس وقت کی پریشانی لکھنے بیٹھ جاؤں تو فائدہ کُچھ بھی نہ ہو گا۔ البتّہ کئی ہزار صفحے سیاہ ہو جائیں گے۔

آپ ہماری اُس وقت کی غم میں ڈوبی ہوئی مسرّت کا اندازہ کیجئے جب کہ جزیرہ ہم سے صرف چند گز دور رہ گیا تھا۔ خُوشی کی وجہ سے ہم سب رو رہے تھے اور چیخوں کے ساتھ رو رہے تھے۔ ہماری زبانیں کُتّوں کی طرح باہر نکلی ہوئی تھیں اور ہم کُتّوں ہی کی طرح ہانپ رہے تھے۔ جب ہماری کشتی جزیرے کی نرم اور گیلی ریت میں دھنسنے لگی تو میں نے نجمہ اور اختر کو اشارہ کیا کہ وہ پہلے اتر جائیں۔ بلکہ اگر میں یوں کہوں تو بہتر ہو گا کہ مجُھے اشارہ کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی، کیوں کہ اشارے سے پہلے ہی وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بھاگتے ہوئے اس ریت پر جا کر اوندھے مُنہ گِر گئے۔

جان اور جیک کی ہم نے کوئی پروانہ کی اور ہم بھی اسی طرح دوڑتے ہوئے پانی میں چھپا کے اڑاتے ریت پر جا کر گر گئے، اور پھر گتے ہی ہمیں ہوش نہ رہا کہ ہم کہاں ہیں؟

شاید صُبح ہو رہی تھی۔ میں کُچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کب تک وہاں بے ہوش پڑے رہے تھے۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ پرندے چہچہا رہے ہیں اور بڑی بڑی گول آنکھوں والے جنگلی اُلّو کا جوڑا ایک چھوٹے سے پیڑ پر بیٹھا ہمیں گھور رہا ہے۔ میں گھبرا کر ایک دم کھڑا ہوا اور پھر میں نے اس جزیرے کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ جزیرہ ویسا ہی تھا جیسا ہر جزیرہ ہوتا ہے۔ درخت اس میں کثرت سے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ کُچھ دور ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی جس کا پانی سمندر میں آ کر گِر رہا تھا۔

یہ سوچ کر کہ اختر اور نجمہ پیاسے ہوں گے میں نے اس طرف دیکھا جہاں وہ

دونوں پڑے ہوئے تھے۔ اچانک خوف کی ایک چیخ میرے مُونہہ سے نکل گئی۔ نجمہ وہاں موجود نہ تھی۔ میری اس وقت کی بے قراری کوئی دیکھتا۔ میں نے جلدی سے اختر، امجد اور سوامی کو جھنجھوڑا۔ وہ سب بھی کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اور جب انہوں نے ایک ندی کو پاس ہی بہتے ہوئے دیکھا تو تینوں تیزی کے ساتھ گرتے پڑتے اس طرف چلے اور پھر ندی میں جا کر گر گئے۔ میں بھی پانی کو دیکھ کر نجمہ کو ایک لمحہ کے لئے بھول گیا اور پھر میں نے بھی وہی حرکت کی جو ان تینوں نے کی تھی۔ پانی میں سر بھگونے اور سیر ہو کر پانی پینے کے بعد اچانک مُجھے اپنے جسم میں طاقت آتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر میں ان کو اپنے ساتھ لے کر اس جگہ آیا جہاں کُچھ دیر پہلے نجمہ لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ نجمہ کے قدموں کے نشانات آگے درختوں کی طرف جا رہے ہیں۔ میرے دِل میں بُرے بُرے خیال آنے لگے۔ اس لئے میں نے

گھبرا کر سوامی سے کہا۔

"سوامی تم جیک اور جان کو ہوش میں لاؤ۔ اتنے ہم تینوں نجمہ کو ڈھونڈنے ان درختوں کی طرف جاتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر میں نے جلدی سے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ نجمہ کے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے ہم آگے ہی آگے بڑھتے گئے، اور جب ہم درختوں تک پہنچ گئے تو اچانک آواز آئی۔

"ادھر مت آئیے ابّا جی۔۔۔ ذرا ٹھہر جائیے۔"

میں فوراً رُک گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں سمجھا کہ شاید نجمہ ندی میں نہا رہی ہے۔ ابھی میں نے امجد سے کُچھ کہنے کے لئے اپنا مُونہہ کھولا ہی تھا کہ جھاڑیوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور نجمہ اس میں سے نمودار ہوئی۔۔۔ مگر

کس حلیے میں؟ اس نے اپنا پورا جسم پتوں کے لباس سے ڈھک رکھا تھا۔ شاید درختوں کی چھال کو اس نے کپڑے کی جگہ استعمال کیا تھا اور پھر اس چھال پر بڑے بڑے پتے بڑی خوبی سے لگا لئے تھے۔ دور سے دیکھنے پر وہ بالکل جنگلیوں کی ملکہ نظر آتی تھی۔ اس کے گورے رنگ پر ہلکے زرد اور سبز رنگ کے پتے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ ہلکے ہلکے قدم بڑھاتی ہوئی جب وہ میرے قریب آ گئی تو میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"سچ نجمہ، میں تو یہ سمجھا کہ شاید اس جزیرے میں جنگلی آباد ہیں اور ان کی مَلِکہ ندی کو پار کر کے اِدھر آ گئی ہے۔"

"یہ لباس آپ پر خوب جچ رہا ہے۔" امجد نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نجمہ پہلے تو شرما گئی اور اس کے بعد کہنے لگی، اس کے لہجے میں اب تھوڑی سی حیرت تھی۔

"ابّا جی، میں کہہ نہیں سکتی کہ کیا بات ہے؟ ہو سکتا ہے کہ میرا وہم ہو، مگر میں نے نہاتے وقت گھنی جھاڑیوں میں ایک سایہ دیکھا تھا۔"

"کیا کہتی ہو؟؟" میں یکایک چونک گیا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے اُس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ مگر میں ٹھیک طرح اندازہ نہیں لگا سکتی کہ وہ کیا چیز تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی جانور ہو!"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، کوئی جانور ہی ہو گا۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ یہاں انسان موجود ہیں تو پھر یقیناً وہ بے ضرر ہوں گے۔" امجد نے کہنا شروع کیا۔ "سمندر کے کناروں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس جزیرے میں تہذیب کا ذرا سا بھی گزر نہیں ہوا۔ اگر یہاں کُچھ لوگ رہتے ہوتے تو سمندر کے آس پاس کشتیوں کو باندھنے کے لئے کھونٹے یا پھر اِکّا دُکّا جھونپڑیاں ضرور ہوتیں۔"

"ہاں یہ بات تو ضرور ہے۔" نجمہ نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا چلو باتیں تو پھر ہوں گی، پہلے جان اور جیک کی خبر لیں اور بھوک مٹانے کا بھی کچھ انتظام کریں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ہاں چلیے۔" امجد نے کہا۔

جب میں ذرا آگے بڑھ گیا تو میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، امجد اور نجمہ چُپکے چُپکے باتیں کرتے ہوئے آگے آ رہے تھے۔ میں نے مُسکرا کر جلدی سے سامنے دیکھنا شروع کر دیا اور تیزی کے ساتھ ساحل کی طرف چلنے لگا۔

ساحل پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سوامی، اختر، جان اور جیک کو ہوش میں لے آیا ہے۔ اس نے ندی میں سے پانی بھر بھر کر اِن تینوں پر ڈالا تھا اور یوں انہیں ہوش آ گیا تھا۔ پانی پینے کے بعد وہ تازہ دم ہو گئے تھے مگر چہروں پر سب کے مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ نجمہ بھی حالانکہ ندی میں نہا کر

اپنی طبیعت میں فرحت محسوس کرنے لگی تھی مگر رنگ اُس کا بھی زرد پڑا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جان آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے رو رہا ہے اور بار بار کہہ رہا ہے۔

"خُدا بڑا عظیم ہے۔۔۔۔۔۔ خُدا بڑا کریم ہے۔"

جیک بھی چاروں طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی چھپے ہوئے خطرے کی بُو سونگھ رہا ہو۔ پانی سے کسی بھوکے انسان کا پیٹ کبھی نہیں بھرا کرتا۔ اس لئے جیک بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ پیاس کے بعد اب اسے بھوک ستانے لگی ہے۔ نجمہ نے بھی اتّفاق سے اس کی اس حالت کو سمجھا اور وہ پھر کہنے لگی۔

"ابّا جی وہیں ندی کے کنارے مُجھے پپیتے جیسا ایک پھل اُگا ہوا نظر آیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُسے چکھا تو وہ بہت میٹھا معلوم ہوا۔ جلدی جلدی میں نے سارا پھل کھا لیا اور اب مُجھے بھوک بھی نہیں لگ رہی اور طاقت

بھی محسوس ہو رہی ہے کیوں نہ آپ سب بھی وہی پھل کھائیں۔ ایسے پھل تو وہاں بے شمار ہیں۔"

نجمہ کی یہ بات سُن کر میں نے سوامی سے کہا کہ وہ ایسے تمام پھل توڑ کر لے آئے۔ سوامی بے چارہ حالانکہ بھوک سے خود بے تاب ہو رہا تھا مگر حُکم کے آگے مجبور تھا، اس لئے ایک تیز دھار والا چاقو اپنے ہاتھ میں لے کر وہ نجمہ کے بتائے ہوئے مقام کی طرف چلا گیا۔ اس عرصے میں امجد اور میں ساحل کے کنارے کنارے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ تاکہ اگر آس پاس ہی آبادی کا کوئی نشان ہو تو ہم اس طرف جانے کی کوشش کریں۔ جان چونکہ بہت کمزور تھا اس لئے اس کے پاس ہم نے جیک کو چھوڑا اور نجمہ و اختر سے کہا کہ وہ اپنے جان پاپا کو خوش کرنے کی کوشش کریں۔ سمندر کی لہریں دُور سے چیختی چلّاتی آتی تھیں اور پھر ساحل پر آکر دم توڑ دیتی تھیں۔ ہم دونوں ٹھنڈے ریت پر پاؤں رکھتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے

جا رہے تھے۔ میں بار بار اُچک کر جزیرے کے دوسرے کونے کو دیکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر اُونچے نیچے درخت ہمیشہ میرے سامنے آجاتے تھے۔

اچانک امجد نے ایک سِسکاری سی بھری۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ امجد کی نظریں ساحل کے ایک خاص مقام پر لگی ہوئی تھیں۔ جب میں نے اس طرف دیکھا تو حیرت اور تعجّب کی ایک ہلکی سی چیخ میرے مُونہہ سے بھی نکل گئی اور پھر ہم دونوں جلدی جلدی اس چیز کے پاس پُہنچے جسے دیکھتے ہی ہماری یہ حالت ہوئی تھی۔ پاس جا کر دیکھا تو وہ ایک ڈھانچہ تھا!

کسی مُردہ انسان کا ڈھانچہ!

پتہ نہیں وہ غریب اس جزیرے میں خود آیا تھا یا پھر اس کی لاش بہتی ہوئی اس جزیرے پر آکر رُک گئی تھی۔ اس جزیرے میں کسی انسانی ڈھانچہ کا ملنا

ایک بُری فال تھی۔ خُدا معلوم وہ اپنی موت مرا تھا یا کسی نے اسے موت کے مُونہہ میں پہنچایا تھا۔ بات بہرحال کُچھ بھی ہو، مگر یہ بات یقینی تھی کہ ہم سے پہلے اس جزیرے میں کسی انسان کا گزر ہوا ضرور تھا۔

ہم دونوں نیچے جھُک کر اِس ڈھانچے کو غور سے دیکھنے لگے اور پھر اچانک میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کیوں کہ اگر میں اِس ڈھانچے کو نہیں تو اس شخص کو ضرور جانتا تھا جس کا یہ ڈھانچہ تھا۔ ڈھانچے کی کمر سے چمڑے کی ایک پیٹی بندھی تھی جو اب سوکھ گئی تھی۔ اس پیٹی میں ایک زنگ لگا ہوا پستول بھی رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ڈھانچے کی اُنگلی میں ایک بہت بڑی ہیرے کی انگوٹھی بھی تھی جسے میں اچھّی طرح پہچانتا تھا۔ کیوں کہ وہ انگوٹھی میری ہی تھی اور میں نے بہت عرصے پہلے یہ انگوٹھی ایک شخص کو تحفتاً دی تھی۔

ان تین نشانیوں نے مُجھے بتا دیا تھا کہ یہ ڈھانچہ کس کا ہے؟ شاید آپ بھی اس شخص کا نام جاننے کو بے تاب ہوں گے۔ لیجئے میں بتاتا ہوں یہ

ڈھانچہ دراصل میرے پرانے ساتھی بلونت کا تھا!

بلونت کا یہ حشر دیکھ کر مُجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے اس کی کمر سے پیٹی اور ہاتھ میں سے انگوٹھی اتارلی اور پھر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ مُجھے یہ اُمّید ہرگز نہ تھی کہ بلونت سے اِس طرح ملاقات ہوگی۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ بلونت جیسا ہی حشر کہیں ہم سب کا بھی تو نہیں ہونا ہے! یہ خیال آتے ہی میں لرز گیا۔ امجد کو جب میں نے یہ بتایا کہ یہ ڈھانچہ کس کا ہے تو اسے بھی بہت رنج ہوا۔ ابھی ہم دونوں کھڑے ہوئے باتیں ہی کر رہے تھے کہ یکایک وہ جزیرہ اس طرح ہلا جیسے زلزلہ آیا ہو۔۔۔ اور پھر ایک چیخ۔۔۔۔ بڑی خطرناک اور تیز چیخ مُجھے جزیرے کے اندر سے سُنائی دی۔ یہ چیخ سنتے ہی ہم دونوں جلدی سے کشتی کی طرف بھاگے اور پھر بھاگتے ہوئے میں نے کسی کی ایک جھلک دیکھی۔ شاید اسی چیز کی جھلک جسے نجمہ نے نہاتے وقت دیکھا تھا۔!

ایک بھیانک سایہ درختوں کے بیچ میں نظر آ کے فوراً غائب ہو گیا!

میں اور امجد اتنی تیزی سے بھاگے کہ شاید عُمر میں کبھی نہ بھاگے ہوں گے۔
اختر، نجمہ جان اور جیک خوفزدہ چہروں کے ساتھ اپنی گردنیں اٹھائے جنگل
کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ سب بھی اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ
ہماری آہٹ پاتے ہی چونک گئے اور گھبرا کر اس طرح پلٹے جیسے
ہمارے کسی وار کو روکنا چاہتے ہوں۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا
سانس لیا اور جان نے ذرا آگے بڑھ کر مُجھ سے پوچھا کہ آخر یہ چیخ کیسی تھی
اور یہ جزیرہ کیوں ہلا تھا۔ بھلا اس بات کا میں کیا جواب دیتا! مُجھے خود بھی
معلوم نہ تھا۔ بہر حال یہ ضرور ہے کہ اب میں نے خطرے کی بُو سونگھ لی
تھی اور مُجھے یقین تھا کہ جلد ہی ہمیں کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے بڑی تیزی کے ساتھ سب کو احکام
دینے شروع کر دیے۔ جان جو ہم سب کا لیڈر تھا، اب وہ بھی میری

باتوں کو بلا چون وچرا مان رہا تھا۔ پہلے تو میں سب کی مدد سے اپنی کشتی کو ساحل پر گھسیٹ کر لے آیا اور پھر اس میں ریت بھر دی۔ کُچھ ہی دیر بعد ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ کشتی نہیں ریت کا کوئی ٹیلہ ہو۔ یہ کام میں نے اس لئے کیا تھا کہ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ دُشمن ہماری کشتی کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد میں نے یہ ہدایت کی کہ اپنے اپنے ہتھیار نکال کر ہاتھ میں لے لیں، ہتھیاروں میں اگر زنگ لگ گیا ہے تو اسے فوراً صاف کریں، اس کے علاوہ جنگلی پھل اور ضرورت کی چیزیں کارتوس اور بیٹریاں (چونکہ کارتوس اور بیٹریاں پلاسٹک کی تھیلیوں میں بند کرنے کے بعد ہم نے لکڑی کے ڈبوں میں ڈال دی تھیں، اس لئے وہ ابھی تک محفوظ تھیں) اپنے ساتھ لے لیں۔

کون جانے آگے جا کر ہمیں اب ان ہی چیزوں سے واسطہ پڑے؟ ایسا کرنے کے بعد اب ہم لوگ جنگل میں داخل ہونے کے لئے بالکل تیّار ہو

گئے۔ سوامی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اِسی طرف تو جا
رہے ہیں آگے چل کر سوامی بھی ہمیں مل جائے گا۔ زیادہ دیر تک کھُلے
ساحل پر کھڑے رہنا ہمارے لئے بہت خطرناک تھا اس لئے ہم جلدی
جلدی ندی کو پھلانگتے ہوئے جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔ مگراب خیال آتا
ہے تو خوف کی ایک جھرجھری سی مُجھے اپنے جسم میں محسوس ہوتی ہے۔
کاش کسی طرح خُدا ہمارے دِل میں یہ بات ڈال دیتا کہ ہم آگے نہ بڑھیں
اور کشتی میں واپس سمندر کے اندر چلے جائیں، سمندر کی موت ان تکلیفوں
سے پھر بھی آسان ہوتی جو ہم نے اس جزیرے میں برداشت کیں۔

ایک قطار میں اِدھر اُدھر دیکھتے اور پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے ہوئے
ہم لوگ بڑے عجیب لگ رہے تھے۔ ہمارے بیچ میں نجمہ تھی جو پتّوں
کے لباس میں کسی دوسری دُنیا سے آئی ہوئی مخلوق لگتی تھی۔ ہم سب
جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کافی حد تک ننگے تھے۔ کوئی اگر ہمیں اس

وقت دیکھتا تو ہم سے ڈر کر یقیناً دور بھاگ جاتا۔ کیونکہ اس وقت ہم خونخوار اور وحشی جنگلی نظر آتے تھے۔ ہمارا حُلیہ ہی ایسا تھا کہ ہر کوئی ہمیں غیر مہذّب سمجھتا۔ ندی عبور کرنے کے بعد ہم خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس جگہ پہنچ گئے جہاں نجمہ نے ہمیں پہلے آواز دی تھی کہ ہم آگے نہ آئیں۔ یہاں پہنچ کر نجمہ نے مُجھے بتایا کہ اس نے اِن جھاڑیوں کے پیچھے وہ سایہ دیکھا تھا اور وہ پپیتے جیسا پھل وہاں سے توڑا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ سوامی وہیں کہیں آس پاس ہوگا میں نے اور امجد نے کئی آوازیں لگائیں مگر سوامی کا کوئی جواب نہ آیا۔ مُجھے بڑی حیرت ہوئی۔ یہ جھاڑیاں کُچھ ایسی گھنی بھی نہیں تھیں جن میں سوامی کھو جاتا!

پھر آخر وہ کہاں گیا؟

جنگل میں اور آگے بڑھ کر میں نے ایک دو آوازیں اور دیں مگر جنگل کے ٹڈّوں اور ایسے ہی دوسرے جانوروں نے مُجھے جواب دیا۔ سوامی کی کوئی

آواز نہیں آئی۔

میرے ساتھ ہی سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کُچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سوامی کہاں گیا۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہیں وہ پھل تلاش کرتے کرتے جنگل میں آگے تو نہیں بڑھ گیا۔ یہ سوچ کر میں نے خود بھی ذرا آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر پھر فوراً ٹھٹھک گیا۔ ٹھٹھک کہاں گیا، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ کسی نے میرے جسم کا تمام خون اچانک نچوڑ لیا۔ مُجھے یوں لگا جیسے میرے قدموں میں جان نہ رہی ہو۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنا زبردست خوف اور ایسا بھیانک ڈر مُجھے لگا کہ میرے مُونہہ سے بے حد دہشت ناک چیخیں نکل گئیں۔ میرے کانوں نے تو اتنا سنا کہ میرے ساتھ ہی میرے ساتھیوں نے بھی چیخیں ماریں مگر اپنی نگاہیں میں ان کی طرف نہیں پھیر سکا کیوں کہ یہ نگاہیں تو ان تین انسان نما درندوں کی طرف لگی ہوئی تھیں جو اس وقت میرے

سامنے کھڑے مُجھے بھوکی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

عزیز دوستو! اور میرے بزرگو! میں اپنے قلم میں وہ طاقت کہاں سے لاؤں جو میری اس وقت کی حالت بیان کر سکے۔ خوف نے اس وقت میری زبان تو بند کر ہی دی ہے مگر میرے قلم کو بھی لرزا دیا ہے۔ اف خُدا وہ کیسی ہیبت ناک شکلیں تھیں۔ کیسے بھیانک چہرے تھے اور کیسی خونخوار سُرخ انگارے جیسی آنکھیں تھیں۔ اُن کے قد سات سات فٹ لمبے تھے۔ جسم پر ایک بھی کپڑا نہ تھا۔ مٹیالے رنگ کی کھال تھی جس پر گوریلے جیسے لمبے لمبے بال تھے۔ گردن اور کندھوں کا فاصلہ تقریباً تھا ہی نہیں۔ اُن کے بھورے بال سر سے لہراتے ہوئے کمر تک لٹک رہے تھے اور ڈاڑھیاں ایسے بڑھی ہوئی تھیں کہ مُونہہ اور ناک مشکل ہی سے نظر آتی تھی۔ یہ صورتیں اتنی خوفناک تھیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ دُنیا کا ہر بد صورت سے بد صورت انسان بھی اِن تینوں سے زیادہ خوبصورت ہو گا۔

آنکھیں ایسی سُرخ جیسے لال بلب جل رہے ہوں۔ اِن آنکھوں پر اَبرو اتنے گھنے تھے کہ آنکھوں کے آگے تک اُن کے بال لٹکے ہوئے تھے۔ ناک کے نتھنے بالکل بن مانس جیسے تھے اور سب سے زیادہ بھیانک تھا۔ اُن کا مُونہہ، ہمیں دیکھ کر جب وہ ہنسے تو۔ یہ مُونہہ اور اس کے اندر کے دانت نظر آئے۔ ان کے دانت بھیڑیے جیسے تھے۔ کچلیاں لمبی تھیں اور ہونٹوں کے دونوں کناروں سے آگے لٹکی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر خُدا جانے وہ کون سی زبان میں چلّائے اور پھر ایک نعرہ لگا کر ہماری طرف جھپٹے۔ حالانکہ اُن کے ہاتھوں میں سوائے لمبی لمبی ہڈّیوں کے اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ مگر ان کی شکلیں دیکھ کر ہم اتنے سہم گئے تھے کہ اپنے بچاؤ کے لئے کُچھ بھی نہ کر سکے۔ شاید ان کی آنکھوں میں کوئی ایسی قوّت تھی جس نے ہمارے جسموں کو سُن کر کے رکھ دیا تھا۔ ہمارے قریب آ کر انہوں نے ہمیں سونگھنا شروع کر دیا۔ جیک اور امجد کو اپنی گھناؤنی انگلیوں

سے چھُو کر دیکھا اور پھر خوش ہو کر ناچنے لگے۔ ان کے جسموں سے ایسی سڑاند آرہی تھی جیسے کسی مُردہ لاش سے آتی ہے۔

ہمیں دیکھ کر اُن کے ہونٹوں سے رال ٹپکنے لگی اور اُن کے بے ہنگم ناچ کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ جیک ہماری اِس قطار میں سب سے پیچھے تھا۔ اُن میں سے ایک نے اُس کے پاس جا کر اپنے ہاتھ کی لمبی ہڈّی اُس کی کمر پر ماری اور ہاتھ سے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسرا میرے قریب آیا مگر میں چونکہ اس کا مطلب سمجھ چکا تھا اس لئے میں نے خود آگے چلنا شروع کر دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوا اور میرے آگے آگے ناچتا ہوا چلنے لگا۔

خُدا جانے یہ کون سی نئی مُصیبت تھی؟ یہ قوم اتنی عجیب تھی کہ آج تک ہم نے اس کا نام نہیں سُنا تھا اور نہ اس کے بارے میں کُچھ پڑھا تھا۔ دیکھنے میں یہ بالکل درندے نظر آتے تھے اور مُجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ہمیں نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ سوچ کر میں نے چلّا کر سب سے کہا۔

"خبردار، کوئی بھی اپنے اوسان ہاتھ سے نہ جانے دے اور اپنے اپنے ہتھیاروں کو مضبوط پکڑ لیں۔"

مجھے بولتے دیکھ کر تیسرا درندہ پہلے تو میرے قریب آیا اور پھر مُجھے دیکھ کر خُوشی سے ناچنے لگا۔ اس کے خیال میں میں کوئی ایسا کھلونا تھا جو بول بھی سکتا تھا۔

ہمیں اسی طرح اپنے نرغے میں لئے ہوئے وہ وحشی آگے ہی آگے چلتے رہے۔ اُونچے اُونچے گڑھوں اور ناہموار راستوں کو پھلانگتے ہوئے ہم لوگ لگاتار ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ ہمیں کُچھ معلوم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے؟ اتنا تو ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ قوم وحشی ہے اور اگر ہم نے اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش نہ کی تو بے موت مارے جائیں گے۔ مگر بچاؤ کی کوشش کرنے کے لئے وقت درکار تھا جو اس وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔

جنگل اب آگے جا کر ختم ہو گیا تھا اور اونچی نیچی چٹّانیں نظر آنے لگی تھیں۔ اِن چٹّانوں کے دامن میں ہمیں کُچھ جھونپڑیاں نظر آئیں۔ یہ درندے ہمیں ان جھونپڑیوں ہی کی طرف لے جا رہے تھے۔ جھونپڑیوں کو دیکھتے ہی انھوں نے کسی عجیب سی زبان میں نعرے لگائے اور پھر ناچنے لگے۔ میں نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے خوف کی وجہ سے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ ایک تو ہم پہلے ہی کے تھکے ہوئے تھے۔ اوپر سے یہ ایک گھنٹے کا مزید سفر بس یوں سمجھئے کہ پاؤں رکھتے کہیں تھے اور پڑتا کہیں اور تھا۔

بڑی مُشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے ہم لوگ ان وحشیوں کے ساتھ جھونپڑیوں تک آئے۔ کل پانچ جھونپڑیاں تھیں۔ وحشیوں کی چیخیں سُن کر اب اُن میں سے دو عورتیں اور تین مرد اور نکل آئے۔ یہ پانچوں بھی بالکل ننگے تھے۔ بس عورتوں کے چہروں پر ڈاڑھی نہیں تھی، ورنہ حلیہ

ان کا بھی مردوں جیسا تھا۔ ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر ان پانچوں نے بھی چلّانا اور ناچنا شروع کر دیا۔ جھونپڑیوں کے پاس پہنچ کر میں نے جو کُچھ بھی دیکھا اس سے میرا دِل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں تین چار انسانی پنجر پڑے ہوئے ہیں اور جھونپڑیوں میں لکڑیوں کی جگہ انسانوں کی ہڈّیاں استعمال کی گئی ہیں۔ آدمی کی رانوں اور ٹانگوں کی ہڈّیاں بلیوں کی جگہ اور پسلیاں چھت میں لگائی گئی ہیں۔ جو وحشی ہمیں اپنے ساتھ یہاں تک لائے تھے ان کے ہاتھوں میں بھی لمبی لمبی ہڈّیاں کسی بد نصیب انسان ہی کی تھیں۔

حقیقت سمجھنے میں اب مُجھے کُچھ دیر نہیں لگی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ درندے دراصل آدم خور ہیں اور انسانوں کا گوشت اُن کی خوراک ہے۔ ہم لوگوں کو جو یہ گھیر کر یہاں لائے ہیں تو ہمیں مُصیبت سے بچانے کی خاطر نہیں بلکہ اپنی خوراک بنانے کے لئے لائے ہیں۔ اور اب شاید قدرت کو یہی منظور

ہے کہ ہمارا گوشت اِن درندوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آئے۔

اس احساس نے میری رگ رگ میں بجلی دوڑا دی۔ میرا خُون کھولنے لگا اور مُجھے یکایک خیال آیا کہ جدید ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود بھی میں کیوں ان درندوں سے ڈر رہا ہوں۔ مُجھے تو یہ چاہیئے کہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانے کے لئے اپنی رائفل اٹھاؤں اور کارتوسوں کی پیٹی کے پورے کارتوس اِن آدم خوروں پر جھونک دوں۔ میں اپنے اِس خیال کو پورا کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ لوگ ناچتے کودتے ہمارے پاس آئے اور باری باری ہمیں چھو کر دیکھنے لگے۔

اِن کے ناخن اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ میرے گوشت میں چُبھنے لگے۔ وہ ہمیں اِس طرح ٹٹول کر دیکھ رہے تھے جیسے قصائی کسی بکرے کو دیکھتا ہے۔ جان بے چارہ کافی دبلا پتلا تھا اس لئے اسے تو اِن وحشیوں نے اس

طرح ایک طرف دھکّا دے دیا جیسے وہ مال تگڑا نہ ہو۔ اس کے بعد وہ ہم سب کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اختر کو بھی ایک طرف دھکیل دیا گیا اور باقی جو بچے انہیں پسند کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک ٹانگ پر اچھلتے ہوئے واپس جانے لگے۔ یہی وقت تھا جب کہ مُجھے اپنی کارروائی کرنی تھی۔

مگر افسوس اب ہماری قسمت کی دیوی ہم سے روٹھ چکی تھی۔ نہ جانے انہیں کیا خیال آیا کہ وہ فوراً ہی واپس پلٹ آئے اور ہمارے قریب آ کر ہمیں غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے آہستہ سے اپنی رائفل اٹھائی اور اس کا ہیمر کھینچ لیا۔ بس اب ایک سیکنڈ میں رائفل چل سکتی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ میں رائفل سے نشانہ باندھ کر اسے چلاتا، ایک آدم خور نے جھٹکے کے ساتھ وہ رائفل مُجھ سے چھین لی اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اپنا اطمینان کرنے کے لئے اس نے رائفل کی نال کو اپنے مُونہہ میں لے کر چبانا چاہا مگر پھر فوراً ہی گھبرا کر

رائفل مُونہہ سے نکالی۔ اتنی دیر میں اس کی دیکھا دیکھی بقیہ آدم خوروں نے بھی جان، جیک اور امجد کے ہاتھوں سے بندوقیں چھین لی تھیں اور وہ بھی اپنے ساتھی کی نقل کرتے ہوئے انہیں کھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب رائفلیں ان سے نہیں کھائی گئیں تو انہوں نے جھنجھلا کر بندوقوں کو کئی جھٹکے دئیے۔ بالکل اس طرح جیسے وہ لوہے کی بندوقیں نہیں بلکہ گوشت کی رانیں ہوں۔ بندوقوں کے ساتھ ہی انہوں نے جھُک کر ہمارا باقی سامان بھی اُٹھا لیا جس میں کارتوسوں کے کئی ڈبّے، سوبیا، بیٹریاں اور ٹارچیں اور چاقو وغیرہ تھے۔ اس سامان کو بندوقوں کے ساتھ ہی وہ اپنے ساتھ لے گئے اور اور صرف ایک ہمارے سامنے بیٹھ کر ہمیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

پورا دِن اسی طرح گزر گیا۔ شام ہو رہی تھی اور سورج کے ساتھ ہی ہم سب کے دِل بھی بیٹھے جا رہے تھے۔ سوامی کا بھی کُچھ پتہ نہیں تھا۔ دِل کہتا تھا کہ

کہیں وہ ان آدم خوروں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا، مگر نہیں ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی لاش بھی ہمیں یہیں کہیں دکھائی دیتی۔ بلونت کے بارے میں اب کسی شک و شُبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس غریب کو بھی ان ہی آدم خوروں نے ختم کیا تھا۔ ابھی ہم سب خاموش بیٹھے اپنے انجام کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ جھونپڑی میں سے تین آدم خور باہر آئے اور انہوں نے اپنے ساتھی سے کُچھ کہا، اس کے بعد وہ چاروں ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور ہمیں جھونپڑیوں کی طرف چلنے کا اشارہ کرنے لگے۔

اختر اور نجمہ یہ اشارہ سمجھ کر رونے لگے۔ میں نے انہیں تسلّی دینے کے لئے ان کی طرف بڑھنا چاہا کہ ایک آدم خور نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انسانی ہڈّی زور سے میری کمر پر ماری اور اس کی ضرب سے چکرا کر میں زمین پر گر پڑا اور پھر مُجھے ہوش نہ رہا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔

جب مُجھے ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں نرم نرم گھاس پر لیٹا ہوا ہوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں مگر دکھائی کُچھ نہ دیا۔ البتّہ کسی سڑی ہوئی چیز کی اتنی زبردست بدبُو مُجھے محسوس ہوئی کہ مُجھے متلی ہونے لگی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی میں نے بہتیری کوشش کی مگر وہاں روشنی ہوتی تو کُچھ دکھائی بھی دیتا۔ یکایک مُجھے کسی کی سرگوشی سُنائی دی۔ کوئی مُجھ سے کہہ رہا تھا۔

"کیا یہ تم ہو فیروز۔۔۔ تمہیں ہوش آگیا؟"

اس آواز کو میں فوراً پہچان گیا۔ یہ جان کی آواز تھی۔ میرے جواب دینے پر اس نے آہستہ سے کہا۔

"شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا ہے۔ مگر فیروز! مُجھے آثار اچھّے نظر نہیں آتے۔ جن خوفناک انسانوں کی قید میں ہم سب ہیں ان کے ارادے بڑے بھیانک ہیں۔ یہ لوگ آدم خور ہیں۔ اسی جھونپڑی میں کسی انسان کی ایک

ٹانگ بھی موجود ہے اور یہ ٹانگ سڑ گئی ہے۔ شاید تمھیں اس کی بد بُو آ رہی ہوگی۔"

"جی ہاں، اِس بد بُو سے تو میرا سانس لینا بھی دشوار ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم پورے دس گھنٹے بے ہوش رہے ہو، اِن آدم خوروں نے ہمیں ایک ہی جھونپڑی میں قید کر دیا ہے۔ اس وقت سب سو رہے ہیں مگر میں جاگ رہا ہوں۔ فیروز! میرے بیٹے، اس خوفناک جگہ سے چھٹکارا پانے کا کوئی طریقہ سوچو۔"

"طریقہ تو بہت آسان ہے۔" میں نے ہمّت کر کے کہا۔ "آخر یہ ہماری بندوقیں کب کام آئیں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں پہلے پہل ان درندوں کو دیکھ کر ڈر گیا تھا اور اپنی رائفل کو کام میں نہیں لا سکا تھا۔ میری رائفل تو خیر اِن آدم خوروں میں سے ایک کے قبضے میں چلی گئی مگر باقی بندوقیں اور

ریوالور تو موجود ہیں، کل صُبح ہوتے ہی ہم لگاتار فائر کرنے شروع کر دیں گے اور ان سب کو آسانی سے مار ڈالیں گے، اس کے بعد ہم آزاد ہوں گے۔"

جان نے تقریباً ناامیدی کے عالم میں کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکیں گے۔ یہ سب ترکیبیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

"کیوں۔۔۔؟" میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"اس لئے کہ بندوقیں، ریوالور اور کارتوس کی پیٹیاں سب کی سب غائب ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں آپ!"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں، رات کے دس بجے کے قریب شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے سب کو پہلے ہی سلا دیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی

نہیں ہوئی اور کوئی بدمعاش چُپکے سے آ کر یہ سب سامان چرا کر لے گیا اب تو ہمارے پاس سوائے چند چاقوؤں کے اور کوئی ہتھیار نہیں ہے!"

جان کی زبانی یہ سن کر مجھے جتنا رنج ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ یوں سمجھئے جیسے کہ میری کمر ٹوٹ گئی۔ ہتھیار ایسے نازک وقت میں ہمارے لئے سب سے بڑا سہارا تھے اور ان ہتھیاروں کو کوئی چُرا کر لے گیا تھا۔

"مگر کون؟ کیا سوامی؟ ۔ ۔ ۔ مگر سوامی کو ہتھیار چُرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ جھونپڑی تک آ بھی گیا تھا تو ہماری مدد کرنے کی بجائے ہمارا سامان چُرا کر لے جانے میں کیا تک تھی!"

لیکن پھر اچانک میرے دِل میں یہ خیال آیا کہ سوامی ہی تو کہیں جیگا نہیں ہے۔ یقیناً یہی بات ہے۔ سوامی ہی در حقیقت جیگا ہے۔ وہ ظالم اور کمینہ انسان عرصے سے میرے ساتھ ہے اور مُجھے پتہ بھی نہیں چلا! اس کی جاں نثاری اور وفاداری اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ میں اس کو پہچان ہی نہ سکا۔ کس

موقع پر آکر کم بخت نے دغا دی ہے۔ ہمیں اِن آدم خوروں کی قید میں ڈال کر اور ہمارے ہتھیار غائب کر کے اب وہ ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اُف! میری آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے جب ہی میں دوست اور دُشمن میں تمیز نہیں کر سکا!

وہ پوری رات میں نے دانتوں سے اپنی بوٹیاں نوچنے ہی میں گزاری۔ رہ رہ کر مُجھے سوامی پر طیش آتا تھا مگر غُصّے کی وجہ سے میں اپنے ہونٹ چبا کر رہ جاتا۔ اس کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ہاں بار بار میں دِل میں سوچتا تھا کہ کوئی طریقہ ایسا معلوم ہو جائے جس کی مدد سے میں سوامی سے انتقام لے سکوں۔ کاش اگر میں کسی طرح اِن آدم خوروں کی قید سے رہائی حاصل کر سکوں، تب جیگا سے گِن گِن کر بدلے لوں، مگر جیسا کہ آپ دیکھیں گے، تقدیر میرے ان خیالات پر کھڑی ہنس رہی تھی۔

سورج آہستہ آہستہ مشرق سے طلوع ہو رہا تھا، ہلکی سی روشنی جھونپڑی

کے دروازے میں سے اندر داخل ہونے لگی اور اس روشنی میں مُجھے وہ جھونپڑی اب صاف صاف نظر آنے لگی۔ جھونپڑی کی چھت پر انسانوں اور مختلف جانوروں کی کھوپڑیاں ٹنگی ہوئی تھیں اور ایک کونے میں انسانی پنجر پڑے ہوئے تھے۔ یہ پنجر تعداد میں کئی تھے اور انہیں دیکھ دیکھ کر میرا اور جان کا خُون خُشک ہوا جا رہا تھا۔ جھونپڑی کے دوسرے کونے میں واقعی ایک آدمی کی کٹی ہوئی ٹانگ پڑی تھی اور اس ٹانگ میں سے بدبوؤں کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اس ٹانگ کے پاس ہی ایک چیز اور تھی جس نے مُجھے بُری طرح سہما دیا۔ یہ دراصل کسی جکاری کی کھال تھی جو دیوار سے ٹنگی ہوئی تھی۔ جکاری کی کھال کو اِس جگہ لٹکے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس جزیرے میں جکاری کی کھال کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ہم بالکل صحیح جگہ پر آ گئے تھے۔

جیگا (یعنی سوامی) اِسی جزیرے میں غائب ہوا تھا۔ اِسی جزیرے میں جکاری

کی موجودگی ظاہر ہوئی تھی۔ لہٰذا یہی جزیرہ جیگا کا ٹھکانہ ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ میں نے جو کُچھ سوچا تھا وہ ٹھیک تھا۔ آدم خور اِس جزیرے کے دراصل پرانے باسی تھے۔ جیگا نے یہاں آ کر انہیں اپنے قابو میں کر لیا ہوگا اور اِن کی عادت جانتے ہوئے اپنے خادم جکاریوں میں سے کُچھ انہیں کھانے کے لئے دے دیے ہوں گے۔ آدم خوروں کو کوئی تکلیف اور پریشانی اُٹھائے بغیر جب اپنا مَن بھاتا کھانا، یعنی انسان کا گوشت گھر بیٹھے مل گیا ہوگا تو وہ جیگا کے غُلام بن گئے ہوں گے۔ جکاری اور انسانوں میں بس تھوڑا ہی سا فرق تو تھا۔ آدم خوروں کو بھلا کیا معلوم کہ کون جکاری ہے اور کون انسان۔ یہی وجہ ہے کہ جیگا آدم خوروں کے پاس رات کو آیا ہوگا اور ہتھیار چُرا کر لے گیا ہوگا۔ ورنہ آدم خوروں کی جھونپڑی میں بغیر ان کی مرضی کے کون آ سکتا ہے، کس کی شامت آئی ہے جو یوں چوری چھُپے وہاں آئے گا؟؟

یہی خیالات تھے جو رہ رہ کر میرے دِل میں آ رہے تھے۔ میں نے عقل مندی یہ کی کہ ان خیالات کو فوراً ہی جان پر ظاہر نہیں کیا اتنی دیر میں اور سب بھی باری باری اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیند کی حالت میں تو بد بُو نے کسی کو نہیں ستایا تھا مگر اب جاگتے ہی سب نے اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھ لیئے۔ سب کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر نجمہ اور اختر کے سروں پر محبّت اور شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے میری آنکھیں بھر آئیں۔ کیوں کہ میرے خیال میں ان کے سروں پر اب یہ ہاتھ میں آخری بار پھیر رہا تھا۔ نجمہ اور اختر سِسکیوں کے ساتھ رونے لگے اور ہم سب مل کر انہیں تسلّی دینے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد مُجھے بہت سے آدم خوروں کے چلّانے اور شور مچانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ موت اپنا بھیانک مُونہہ کھولے ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ میں نے دروازے میں سے جھانک

کر دیکھا، وہی تھے۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں بہت لمبی لمبی ہڈّیاں تھیں جن کے سروں پر کافی وزنی پتھرّ بندھے ہوئے تھے میں جانتا تھا کہ یہ پتھرّ ہماری کھوپڑیوں کو توڑنے کے لئے باندھے گئے ہیں۔ جھونپڑی کے دروازے کے پاس آکر وہ ہمیں باہر آنے کے اشارے کرنے لگے۔ عورتیں اپنے مکروہ اور بھیانک دانت نکال کر ہنسنے لگیں اور ہڈّیاں ہلاہلا کر ہمیں اس طرح دیکھنے لگیں گویا کہہ رہی ہوں :

"آؤ۔۔۔ کب تک وہاں چھُپے رہوگے۔ ہمارے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

یہ اشارہ سمجھ کر تو میری روح فنا ہوگئی۔ نجمہ دوڑ کر مجُھ سے لپٹ گئی اور امجد نے غُصّے کی وجہ سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

میں نے دروازے سے باہر نکلتے وقت اپنے ساتھیوں سے بلند آواز میں کہا۔ "خبردار گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جن کے پاس چاقو ہیں وہ اُن سے

ضرور کام لیں، بغیر جد و جہد کے مرنا بہت بڑی بُزدلی ہے۔ مرنا ہے تو ایک دو کو مار کر مرنا چاہیئے۔"

آدم خور ہمیں اپنے گھیرے میں لئے ہوئے جھونپڑیوں کے سامنے والے میدان میں آ گئے۔ اس میدان کے چاروں طرف اونچی اونچی چٹّانیں تھیں جن پر کہیں کہیں چھوٹی موٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، ان چٹانوں کی اونچائی تقریباً سو سو فٹ ضرور تھی۔ ہم اگر بھاگنا بھی چاہتے تو کسی طرح بھی نہیں بھاگ سکتے تھے۔ یہ قید خانہ دراصل ایک پیالے جیسا تھا جس کے چاروں طرف چٹّانوں کی دیواریں اُٹھی ہوئی تھیں اور بیچ میں ہم لوگ تھے۔

آدم خور بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ اور ہمیں خوفناک نظروں سے گھور رہے تھے۔ کبھی کبھی اپنی زبان میں وہ ایک زور کا نعرہ بھی لگاتے تھے جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا۔ یہ نعرہ ایک لمبی اور خوفناک چیخ تھی۔ اور یہی نعرہ دراصل ہم نے جزیرے میں آنے کے بعد

کئی بار سُنا تھا۔ کئی آدم خور تو ایسے بے صبر اور ندیدے تھے کہ اپنے ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود بھی ہم میں سے کسی نہ کسی کو اس طرح چھُو کر دیکھتے تھے جیسے ہمیں کھانے کے لئے بے تاب ہوں اور اتنے عمدہ کھانے کو سامنے دیکھ کر اب ان سے صبر نہ ہوتا ہو۔

جب اُن کا شور حد سے زیادہ بڑھ گیا تو شاید ان کے سردار نے زور سے ایک نعرہ لگا کر انہیں خاموش رہنے کے لئے کہا اور وہ سب سہم کر چُپ ہو گئے۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک میری رائفل تھی۔ اس کا ہیمر بھی تک چڑھا ہوا تھا۔ ٹریگر دبانے کی دیر تھی اور گولی چل جاتی۔ میں رائفل کی نال سے خود کو اور دوسروں کو پرے رکھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور آدم خوروں کے ہونے والے حملے سے بچنے کی تدبیریں بھی۔ آدم خور سردار کُچھ دیر تک اپنے ساتھیوں سے نہ جانے کیا کہتا رہا اور پھر یکایک ان سب کی بھوکی نظریں جیک کی طرف اٹھیں کیوں کہ وہی ہم میں سب سے موٹا

تازہ اور طاقتور تھا۔ جیک کے چہرے پر اچانک زردی چھا گئی اور اتنا بہادر ہونے کے باوجود بھی وہ خوف کی وجہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔

آدم خوروں نے جلدی سے آگے بڑھ کر جیک کو دبوچ لیا اور اسے ایک طرف کھڑا کر کے سب نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ہڈّیاں اوپر اُٹھا لیں۔ سردار کا حُکم پاتے ہی وہ سب اِن ہڈّیوں کے سروں سے بندھے ہوئے پتھرّ زور سے بار باری جیک کے سر پر مارتے اور یوں جیک بے چارہ ختم ہو جاتا۔ اُن کے اِس ارادے کو سمجھ کر میں نے دِل ہی دِل میں اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ یا رب العالمین اگر ہمیں مارنا ہی ہے تو ایسی بے کسی اور ایسی بھیانک موت مت دے۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ تو ہمیں سمندر ہی میں غرق کر دیتا مگر ان آدم خوروں کا نوالہ نہیں بناتا۔

جیک نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور دانت بھینچے ہوئے کھڑا تھا۔ سردار نے اچانک ایک زور کا نعرہ لگا کر رائفل کے کندے کو لکڑی کی

طرح زمین پر مارا۔ شاید اس کی انگلی ٹریگر پر تھی یا پھر جھٹکے کی وجہ تھی کہ رائفل کی گولی ایک زبردست آواز کے ساتھ چل گئی اور آدم خور بُری طرح چیخے۔ اس کے ساتھ ہی سہم کر وہ جھونپڑی کی طرف تیزی سے بھاگے۔ جھونپڑیوں کے پاس جا کر وہ خوفزدہ نظروں سے ہمیں گھورنے لگے۔ لوہے کی لکڑی میں سے دھماکہ ہوتے ہوئے انہوں نے شاید آج پہلی بار دیکھا تھا۔ سردار نے گھبرا کر رائفل زمین پر پھینک دی تھی اور اب اسے خوف زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ آدم خور ہمیں بھول تو گئے اور اس رائفل کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے قریب آرہے تھے۔ میں دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

رائفل میرے سامنے پڑی ہوئی تھی مگر اب سوامی کی مہربانی کی وجہ سے ہم میں سے کسی کے پاس ایک کارتوس بھی نہیں تھا۔ بغیر کارتوس کے رائفل ہمارے لئے بے کار تھی۔ پھر بھی میں نے یہ سوچا کہ رائفل تو

اپنے قبضے میں کر لینی چاہیئے۔ میں نے فوراً جیک سے کہا کہ وہ رائفل اٹھا لے۔ جیک ابھی تک آنکھیں بند کیئے کھڑا تھا۔ میری آواز سن کر اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور لپک کر رائفل اٹھالی۔ آدم خور یہ دیکھ کر بُری طرح چیخے اور پھر نہ جانے ان کے دِل میں کیا سمائی کہ وہ تیزی سے جیک کی طرف جھپٹے۔ میں نے سمجھ لیا کہ بس اب جیک کا خُدا ہی حافظ ہے۔

جیک کے ہاتھ میں اب رائفل آ چکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے مضبوط پکڑ لیا اور آدم خوروں سے ٹکر لینے کے لئے تیّار ہو گیا۔ ادھر میں نے نجمہ اور اختر کو ایک طرف کر کے امجد اور جان سے کہا کہ وہ بھی اپنے چاقوؤں کو کام میں لائیں۔ اِدھر سے آدم خور جیک کی طرف بڑھ رہے تھے اور اُدھر سے ہم اس کی مدد کو پہنچ گئے تھے۔ آدم خوروں نے جیک کے پاس پہنچتے ہی اسے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ جیک نے رائفل کو اِدھر اُدھر گھمایا۔ ایک دو بار کسی نہ کسی کے یہ

رائفل لگ بھی گئی، مگر اسے شاید ذرا سا بھی احساس نہ ہوا۔ یہ حالت دیکھ کر ہم نے ایک دو آدم خوروں سے ہاتھا پائی کرنے کی کوشش کی مگر اب آپ کو کیا بتاؤں۔ ان کم بختوں میں اتنی طاقت تھی کہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے انہوں نے ہم کو دس دس فٹ دور پھینک دیا۔ چاقوؤں سے مدد لینا تو الگ رہا۔ ہم ان کی نوکیں آدم خوروں کے جسموں سے چھُوا بھی نہ سکے۔

آدم خور یہ دیکھ کر کہ ہم نے ان پر حملہ کر دیا ہے، غُصّے سے بے قابو ہو گئے تھے۔ اور ان میں سے کُچھ اب چیختے چِلّاتے ہماری طرف بڑھے۔ جیک کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اور وہ خود کو بچانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ ایک آدم خور دور سے بھاگتا ہوا آیا۔ وہ اپنے ہی زور میں چھلانگ لگا کر جیک کے اوپر گرنا چاہتا تھا، مگر میں نے دیکھا کہ جیک نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ اس نے فوراً اپنا چاقو نکالا اور زور سے گھما

کراس آدم خور کی طرف پھینکا۔ چاقو دستے تک اس کے سینے میں گھُس گیا۔ اور وہ ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ جیک کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی اپنے اپنے چاقو نکال لئے اور آدم خور جیسے ہی ہماری طرف جھپٹے، ہم نے یہ چاقو پوری قوّت سے ان کی طرف پھینکے۔ لیکن ایک تو ہماری قسمت ہی خراب تھی اور دوسرے ہمیں جیک کی طرح چاقو پھینکنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے یہ چاقو آدم خوروں کو کوئی خراش پہنچائے بغیر اِدھر اُدھر گر گئے۔

آدم خوروں کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اور ان کے مُونہہ سے رال بہہ رہی تھی۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح اپنے ہاتھوں کی ہڈّیاں اٹھائے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ اب جیک بھی ایک آدم خور سے گتھم گتھا تھا۔ آدم خور اپنے لمبے ناخنوں سے اس کے جسم کو نوچ رہا تھا۔ جس آدم خور کے سینے میں جیک کا چاقو پیوست تھا۔ وہ اب دم توڑ رہا تھا۔ جلد ہی ان درندوں نے ہمیں اپنے نرغے میں

لے لیا، ایک نے پوری قوّت سے اپنی ہڈّی میرے سر پر مارنے کی کوشش کی مگر میں نے جلدی سے اس وار کو اپنے ہاتھوں پر روکا۔ لیکن پھر فوراً ہی کراہ کر میں نے اپنا ہاتھ پکڑلیا۔ شاید میرے ہاتھ میں کافی چوٹ آئی تھی۔ دو آدم خور عورتیں اب نجمہ اور اختر کی طرف بڑھ رہی تھیں اور وہ دونوں انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر بُری طرح چیخ رہے تھے۔ آدم خور نے اپنے وار کو خالی جاتے دیکھ کر دوبارہ مُجھ پر حملہ کیا۔ مگر میں نے اس وار کو بھی روکنے کی کوشش کی۔ اس بار میں نے ہمّت کر کے وہ ہڈّی ہی چھین لی جس سے وہ درندہ مُجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ ہڈّی چھین کر میں نے دور پھینک دی اور پھر تیزی کے ساتھ اختر اور نجمہ کی طرف بھاگا۔

آدم خور عورتیں نجمہ کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھیں کہ میں نے اُن کو دھکّا دیا اور وہ زمین پر ِگر پڑیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتیں، وہی آدم خور جس کے ہاتھ سے میں نے ہڈّی چھینی تھی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے اپنے دانت

میری کمر پر گاڑ دیئے۔ تکلیف کی وجہ سے میں بلبلا گیا۔ میں نے ایک زور دار کوشش کر کے خود کو اس آدم خور کے پنجے سے چھڑایا اور پھر پلٹ کر اس کے مُونہہ پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ مگر اس نے مُجھے کُچھ نہیں کہا۔ وہ تو اس وقت میری کمر کی بوٹی کھانے میں مصروف تھا۔ جو اس نے کُچھ دیر پہلے میری کمر سے نوچی تھی۔ اس کے مُونہہ سے خون ٹپک رہا تھا اور وہ میرے گوشت کو اس طرح کھا رہا تھا جیسے اس سے زیادہ لذیذ چیز اس نے زندگی میں کبھی نہ کھائی ہو۔

جیک نے کوشش اور ہمّت سے کام لے کر خود کو آدم خوروں کے پنجے سے چھڑا لیا تھا اور اب لڑکھڑاتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس طرح تو ہم آدم خوروں سے نہیں نپٹ سکتے۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیئے۔

مگر ایسی حالت میں جب کہ انسان کی اپنی زندگی خطرے میں ہو، کوئی کیا

تدبیر سوچ سکتا ہے۔ ہم لوگ بس ایک قطار میں کھڑے ہو گئے تھے اور ہماری سمجھ میں کُچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں؟ آدم خور ہم پر دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اور ادھر میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں، اتنی دیر تک تو میں نے زندگی بچانے کی جدوجہد کر لی تھی، مگر اب کیا ہو گا؟

تھکن سے پہلے ہی سب کا بُرا حال ہے، اور پھر اب یہ بغیر ہتھیاروں کی لڑائی! میری نظر اچانک اس طرف چلی گئی جہاں وہ آدم خور مُردہ پڑا تھا۔ جسے جیک نے مارا تھا۔ اُدھر دیکھتے ہی میرے بدن میں خوف کی تھرتھری پیدا ہو گئی اور میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تین آدم خور اس وقت اپنے ہی ساتھی کا بدن دانتوں سے کاٹنے میں مصروف تھے۔ وہ مرے ہوئے شخص پر اس طرح جُتے ہوئے تھے جیسے کُتّے کسی لاش کو بھنبھوڑتے ہیں۔۔۔ اُف خُدایا۔ یہ ہم کہاں پھنس گئے تھے؟ کس قدر گھناؤنا منظر تھا وہ۔۔۔!

اب صرف چار آدم خور ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں دو عورتیں تھیں اور دو مرد۔ مردوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے باقی ساتھی اپنا دِل پسند کھانا کھانے میں مصروف ہیں تو انھوں نے چلّا کر کُچھ کہا۔ اس پر وہ تینوں بھی جلدی سے اُٹھے اور اپنے ساتھیوں سے آملے۔ ان کے مُونہہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس حملے میں اب وہ ہماری تِکّا بوٹی کر ڈالیں گے۔ میں نے اِلتجا بھری نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر نجمہ واختر کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

دِل میں سوچ لیا تھا کہ پہلے خود مروں گا اس کے بعد ان دونوں پر آنچ آنے دوں گا۔ آدم خور پہلے تو چند گز دور کھڑے رہ کر ہمیں دیکھتے رہے اور پھر اچانک پہلے کی طرح ایک نعرہ لگا کر جھپٹے۔ میں نے چلّا کر اپنے ساتھیوں اور بچّوں سے کہا۔

"اچھّا بھئی خُدا حافظ۔۔ اب زندگی کی کوئی اُمّید نہیں ہے۔"

اور پھر خوف کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ دِل میں سوچ رہا تھا کہ اب کسی کے دانت آکر میرے جسم میں گڑ جائیں گے اور کُچھ ہی لمحوں میں اپنے ساتھیوں کی چیخیں مُجھے سُنائی دیں گی، لیکن اچانک 'دھائیں' کی ایک آواز آئی اور اس کے بعد ہی دوسری آواز۔۔۔!

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دو آدم خور تیورا کر زمین پر گر رہے تھے۔ ابھی میرا دماغ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ کیا ہوا کہ اچانک دھائیں کی ایک آواز اور آئی اور اب کے تیسرا آدم خور ہیبت ناک آوازیں نکالتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔۔۔

اب میں سمجھا کسی نے گولیاں چلائی تھیں اور پھر اچانک مُجھے ایک خیال آیا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی گولی سے ہم میں سے کوئی زخمی ہو جائے، اس لئے ہم سب کو چٹّانوں کے بالکل نیچے پہنچ جانا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہی میں نے بُلند آواز سے یہ خیال اپنے ساتھیوں پر ظاہر کر دیا۔ کُچھ ہی دیر بعد ہم

سب چٹّانوں کے نیچے کھڑے ہوئے آدم خوروں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ایک گولی اور چلی اور اب کے چوتھا آدم خور زمین پر آرہا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہمارا یہ محسن کون ہے. جس نے بروقت ہماری جانیں بچائی ہیں۔ "کہیں یہ سوامی تو نہیں ہے؟"

مگر سوامی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ہمارا دُشمن ہوتے ہوئے بھی وہ ہماری مدد کرے۔۔۔۔ پھر یہ کون شخص ہے جو ہمارے لئے فرشتۂ رحمت بن کر آیا ہے؟ میں نے اس مقام کی طرف دیکھا جدھر سے گولیاں آرہی تھیں۔ سامنے والی چٹّان پر ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی اور کوئی شخص اِسی جھاڑی کے پیچھے بیٹھا ہوا گولیاں چلا رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک فائر پھر ہوا اور ایک آدم خور عورت چیختی چلاتی زمین پر گر پڑی۔ اب صرف ایک مرد اور ایک عورت باقی رہ گئے تھے۔ وہ دونوں خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے ساتھ ہی بھیانک آواز میں چلّا بھی رہے تھے۔ جب

ان کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا تو وہ دونوں تیزی سے جھونپڑیوں کی طرف بھاگے۔ لیکن جھونپڑیوں تک پہنچ ہی نہ سکے۔ کیوں کہ ہمارے محسن نے انہیں بھی راستے ہی میں ختم کر دیا تھا۔

میں نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ مُجھے یقین نہ آتا تھا کہ میرے دُشمن ختم ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ جان کمزوری کی وجہ سے زمین پر بیٹھ گیا تھا اور جیک حیرت زدہ نظروں سے اوپر چٹّان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رہا امجد تو وہ نجمہ اور اختر کے قریب کھڑا ہوا انہیں تسلیاں دے رہا تھا۔ جیک کے ساتھ ہی ہم سب کی نظریں بھی چٹّان کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور پھر یہ دیکھ کر ہمیں بڑا تعجّب ہوا کہ ہمارا محسن اب وہاں نہیں تھا۔

"یہ شخص کون ہو سکتا ہے جیک۔۔؟" میں نے اپنے ہاتھ کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"خُدا ہی بہتر جانتا ہے۔" جیک کی مُردہ سی آواز نکلی، تکلیف کی وجہ سے اس کا بھی بُرا حال تھا۔

"ابّا جی۔۔۔ ہائے آپ کی کمر پر سے کافی گوشت غائب ہے۔" نجمہ چیختی ہوئی میری طرف بڑھی۔ "ظالم نے کس بے دردی سے کمر کا گوشت دانتوں سے نوچا ہے۔"

"ہمارا سامان غائب ہے، اس لئے کسی کی مرہم پٹّی بھی نہیں ہو سکتی۔" جان نے کمزور آواز میں کہا۔

"فی الحال تو تھوڑی سی مٹّی زخموں پر لگا لیجئے، اس طرح خُون نکلنا بند ہو جائے گا۔" امجد نے رائے دی۔

اور امجد کی رائے پر عمل کرتے ہوئے جیسے ہی میں زمین کی طرف جھکنے لگا۔ میری نظر اچانک سامنے جھونپڑیوں کی طرف اٹھ گئی اور تب میں نے

دیکھا کہ جھونپڑی کے پیچھے والی چٹان میں سے کوئی شخص نمودار ہوا اور پھر بندوق تانے ہوئے ہماری طرف آنے لگا۔ کمزوری کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے جب ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آنے والا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ہمارا جانا پہچانا سوامی ہے۔

سوامی کو سامنے دیکھتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ اس نے بندوق ابھی تک ہماری طرف تان رکھی تھی۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ اب یہ ہم سب سے انتقام لے گا۔ مگر ہمارے قریب آ کر اس نے بندوق نیچی کر لی۔ اور میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے کہ میں ٹھیک وقت پر آ گیا۔۔ ورنہ ظالموں نے تو آپ سب کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔"

"دور رہو۔۔۔" میں نے حقارت کے ساتھ کہا۔ "تم اب جلے پر نمک چھڑکنے آئے ہو۔ لو ہم تمہارے سامنے کھڑے ہیں، کر دو ہمیں ختم۔ مار

دو ہمارے گولی۔"

"آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں مالک"۔ سوامی نے تعجّب سے کہا۔ "مانا کہ مُجھ سے غَلطی ہو گئی تھی، مگر اس غَلطی کی اتنی بڑی سزا تو مت دیجئے، آخر آپ مُجھے کیا سمجھ رہے ہیں؟"

"بدمعاش تو اب بھی چاپلوسی سے کام لے رہا ہے، میں اب اچھّی طرح جان چکا ہوں کہ تو ہی جیگا ہے اور بھیس بدل کر شروع سے ہی ہمارے ساتھ ہے۔ مگر یاد رکھ میں تُجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو یاد رکھے گا۔"

"مالک! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" سوامی نے اپنی بندوق پھینک دی اور جلدی سے میرے قدموں میں آکر گِر گیا اور پھر روتے ہوئے کہنے لگا:

"مالک میں جیگا نہیں ہوں۔ بھگوان کی سوگند میں جیگا نہیں ہوں، آپ یہ کیا سمجھ رہے ہیں، بے بی اور بابا کی قسم میں جیگا نہیں ہوں۔"

وہ بُری طرح رو رہا تھا اور اِدھر میں بڑے شش و پنج میں بمتلا تھا۔ جان،
جیک اور بچّے سب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ سوامی نے اپنے
آنسوؤں سے میرے پیر گیلے کر دیئے اور جب اس نے دیکھا کہ میرا پتھرّ
دِل ابھی تک موم نہیں ہوا تو جلدی سے اٹھا اور آگے بڑھ کر اس نے
بندوق اُٹھالی۔ اس کا ہیمر چڑھایا اور پھر بندوق مُجھے دیتے ہوئے بولا۔

"یہ لیجئے، اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو اس بندوق سے مُجھے ختم کر دیجئے اس
میں گولی موجود ہے۔"

بے خبری کے عالم میں نے بندوق لے لی۔ سوامی کُچھ فاصلے پر سینہ تان
کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بندوق اٹھائی ہی تھی کہ اختر اور نجمہ دوڑ کر سوامی سے
لپٹ گئے اور چلّانے لگے۔

"نہیں ابّا جی نہیں۔۔ کلو سوامی کو مت مارئیے، یہ جیگا نہیں ہے ابّا جی،
اسے مت مارئیے۔"

سوامی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں پاگل تو نہیں ہو گیا جو ایسے وفادار اور جاں نثار ملازم کو جیگا سمجھ بیٹھا ہوں۔ بھلا سوامی کس طرح جیگا ہو سکتا ہے۔ میری تو آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں جب ہی مُجھے دوست اور دُشمن کی تمیز نہیں رہی۔ میں نے بندوق کا ہیمر آہستہ سے گرا دیا اور پھر سوامی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"مجھے معاف کر دو، سوامی۔ مُصیبتوں نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے، جو تم پر خواہ مخواہ شک کر بیٹھا۔"

سوامی کے چہرے پر ایک دم مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے انکساری سے کہا:

"مالک، ہم سب کی یہی حالت ہے، مگر فکر مت کیجئے۔ اگر بھگوان نے چاہا تو اب کوئی آدم خور بھی ہمارے پاس نہیں آ سکے گا۔ اور جلد ہی ہم کسی نہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔"

"مگر یہ سب کُچھ ہوا کیسے؟" جان نے آہستہ سے کہا۔ "سوامی تُم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آخر تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے اور پھر اس کٹھن وقت میں ہماری مدد کے لئے کیسے آ گئے؟"

"آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔" سوامی نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے ابھی تک یہ آپ کو نہیں بتایا۔ مگر اب بتاتا ہوں۔ جس وقت میں پھل توڑنے ندی کے پار گیا تو میں نے پہلی بار چھُپ کر ان آدم خوروں کو درختوں سے جھانکتے دیکھا۔ میں سہم کر ایک بڑے سے کھوکھلے پیڑ کے اندر چھُپ گیا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ آپ لوگوں کو اِطّلاع کرتا۔ کُچھ ہی دیر بعد میں نے آپ سب کو آتے ہوئے دیکھا اور پھر وہی ہوا جس کی مُجھے اُمّید تھی۔ یعنی آدم خوروں نے آپ کو پکڑ لیا۔ میں بھی چھپتا چھپاتا اِن کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یہ لوگ آپ کو جھونپڑیوں تک لے آئے اور میں چٹّانوں کے اوپر پہنچ گیا۔ رات کو آہستہ سے میں وہاں سے اترا۔ میں نے دیکھا کہ

سب سو رہے ہیں۔ یہ خیال کر کے کہ کہیں میری آواز سے کوئی ہڑ بڑا کر نہیں اٹھ بیٹھے اور کسی کی چیخ نہ نکل جائے۔ میں نے سب سامان ایک ایک کر کے اٹھا لیا۔ مُجھے یقین تھا کہ آپ لوگوں سے الگ رہ کر میں آپ کی اچھی مدد کر سکوں گا۔

اور یہ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ بس غَلطی مُجھ سے یہ ہوئی کہ صُبح ہی صُبح یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں آس پاس کُچھ اور آدم خور تو نہیں ہیں، میں ذرا چٹّانوں سے دور نکل گیا۔ کافی دور نکل جانے کے بعد میں نے کُچھ غار دیکھے جو بڑے عجیب ہیں۔ ان میں نہ جانے کہاں سے بڑی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ سب کو آزاد کرانے کے بعد اس جگہ لے آؤں گا۔ جب میں واپس یہاں آیا تو میں نے یہاں کا منظر ہی عجیب دیکھا۔ مالک مُجھے شرم آ رہی ہے، میرا دِل چاہا کہ میں اپنے گولی مار لوں کیوں کہ آپ لوگوں کی فکر کرنے کی بجائے میں خواہ مخواہ غاروں کی طرف چلا گیا تھا۔

اس کے بعد جب میں نے آدم خوروں کو زبردست حملہ کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے بندوق اُٹھا کر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ بعد میں جو کُچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔"

اب مُجھے یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ میں نے ان باتوں کا کیا جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ سوامی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ لٰہذا کُچھ ہی دیر بعد وہ ہمیں چٹّانوں کے اوپر لے آیا اور پھر ہم ایک دوسرے کی مرہم پٹّی کرنے لگے۔ اس کے بعد سوامی کے اصرار پر ہی ہم اس طرف چل پڑے جہاں وہ نرالے غار تھے جن میں سے سوامی کے کہنے کے مطابق ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں ابھی تک اچھّی طرح آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آدم خوروں کی جھونپڑیوں میں ہم بے شک سوئے تھے۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ سروں پر موت کی تلوار لٹک رہی ہو، بھلا کسی کو کیا آرام میسّر آئے گا۔ گِرتے پڑتے ایک دوسرے کو سہارا دیتے

ہوئے تقریباً دوپہر کے وقت ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سوامی کے کہنے کے مطابق غار تھے۔ غاروں کے بارے میں سوامی صرف اسی قدر جانتا تھا کہ وہ غار ٹھنڈے ہیں اور محفوظ ہیں، وہاں رہنے سے آدم خور یا کوئی اور بلا ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ غار نشیب میں واقع تھے۔ مطلب یہ کہ جس جگہ ہم لوگ کھڑے ہوئے تھے، وہاں سے زمین اچانک ختم ہو جاتی تھی۔ اور ہمارے سامنے کی طرف ایک کافی گہرا کھڈ تھا۔ ایک پاؤں بھی اگر ہم آگے بڑھاتے تو کھڈ میں گرتے۔

کھڈ کی گہرائی سے لے کر اس جگہ تک جہاں ہم کھڑے تھے۔ ایک قدرتی دیوار سی بن گئی تھی۔ اور وہ غار اس دیوار کے ساتھ ساتھ کوئی بیس فٹ نیچے جا کر تھے۔ جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سے ان غاروں کا بس تھوڑا سا حصّہ نظر آتا تھا۔ اگر ہم جھک کر دیکھنے کی کوشش کرتے تو یقیناً نیچے گر پڑتے۔ یہ دیکھ کر جب میں نے سوامی سے دریافت کیا کہ بھلا کس طرح وہ

ان غاروں کے اندر پہنچا ہوگا۔ تو اس نے جواب دیا کہ جہاں ہم کھڑے ہیں اس سے کُچھ ہی فاصلے پر ایک بڑی چٹّان ہے۔ اگر اُس چٹّان کے بائیں طرف جھانک کر دیکھا جائے تو ایک تنگ سی سُرنگ نظر آتی ہے۔ اِسی سُرنگ میں سے ہو کر وہ ان غاروں تک پہنچ گیا تھا۔

سوامی نے جیسا بتایا ہم نے ویسا ہی کیا۔ واقعی اُس چٹّان کے برابر میں ایک سوراخ تھا اور وہ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک باری باری اس میں سے رینگ کر اندر سُرنگ میں داخل ہو گیا۔ سُرنگ میں سے گُزرنے کے بعد ہم پہلے غار میں پہنچ گئے۔ یہ غار کافی بڑا تھا۔ یہاں کھڑے ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے بالکل نیچے بھی ایک دیوار تھی جو کھڈ تک پہنچ جاتی تھی اور میرے سر پر بھی دیوار تھی جو بیس فٹ اوپر جا کر اس زمین سے مل جاتی تھی جہاں ہم پہلے کھڑے ہوئے تھے۔ اس جگہ واقعی ہم محفوظ تھے۔ کوئی درندہ اور کوئی آدم خور ہم تک کسی بھی طرح

نہیں پہنچ سکتا تھا۔ سامنے کا نظارہ بھی بہت اچھّا تھا۔ کھڈ میں مختلف قسم کے درخت چٹّانوں کے پاس اُگے ہوئے تھے۔ کافی دُور سامنے کی طرف سمندر بہہ رہا تھا اور آدھے دائرے کی صورت میں وہ پہاڑیاں تھیں جن میں سے ایک کے اندر یہ غار تھا۔

بڑا عجیب منظر تھا۔ میرے سامنے اوپر کی طرف جو زمین نظر آ رہی تھی اس میں ایک چٹّان سی نکلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کھڈ کوئی تالاب ہو اور وہ باہر کو نکلی ہوئی چٹّان اس تالاب میں کودنے کے لئے بنایا ہوا تختہ۔ نہانے کے تالابوں میں ایسے تختے آپ نے ضرور دیکھے ہوں گے بس اسی قسم کی وہ چٹّان تھی۔ ابھی میں اِس چٹّان کو دیکھ ہی رہا تھا کہ یکایک خوف کی وجہ سے میں لڑکھڑا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اسی چٹّان پر اچانک کُچھ آدم خور نمودار ہوئے اور ہمیں دیکھ کر خُوشی سے چلّانے لگے!

انہیں دیکھتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ نہ جانے ان کی منحوس

صورتوں میں کیا تاثیر تھی کہ ہمارے دِل بیٹھنے لگتے تھے۔ تعداد میں وہ اب پندرہ ہو گئے تھے اور ہمیں غار میں کھڑے دیکھ کر خود بھی اُسی طرف آنے لگے تھے۔ شاید انہیں غار میں جانے والی اِس سُرنگ کا راستہ معلوم تھا۔ سُرنگ کے دہانے پر رکھی ہوئی چٹّان کو ہٹا دینا میرے خیال میں اِن خوفناک آدم خوروں کے لئے بہت معمولی سی بات تھی، کیوں کہ کُچھ ہی دیر بعد مُجھے سُرنگ کے اندر سے وہی عجیب سی چیخیں سُنائی دینے لگیں جن کو سُن کر ہمارے دِل دہل جاتے تھے۔ وہ اب سُرنگ میں داخل ہو چکے تھے اور چیختے چِلّاتے ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی سوامی نے جلدی سے کہا۔

"آپ لوگ تیزی سے آگے کی طرف بھاگیے، یہ سُرنگ کافی لمبی ہے۔"

یہ سُنتے ہی ہم نے آگے بھاگنا شروع کر دیا، نجمہ اور اختر سب سے آگے تھے اور پھر ان کے پیچھے ہم سب۔ آگے گھُپ اندھیرا تھا، مگر ہمارے

پاس اتنا وقت ہرگز نہ تھا کہ ہم تھیلوں میں سے ٹارچیں نکال کر جلاتے لہٰذا ہم اس اندھیرے ہی میں بھاگتے رہے اور ہمارے پیچھے وہی خوفناک چیخیں ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔ یکایک مُجھے نجمہ کی چیخ سُنائی دی وہ کہہ رہی تھی۔

"ابّا جی یہ سُرنگ تو ایک دیوار سے بند ہو گئی اور میں دیوار سے ٹکرا گئی ہوں۔"

میں نے خود آگے بڑھ کر اس دیوار کو دیوانوں کی طرح ٹٹولنا شروع کر دیا۔ مگر مُجھے دیوار میں کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جیک نے اپنے تھیلے سے ٹارچ نکال کر جلالی تھی اور اس کی دیکھا دیکھی امجد اور جان نے بھی اپنی اپنی ٹارچیں نکال لیں تھیں۔

میں نے نا اُمّیدی کی حالت میں ایک لمبی سی آہ بھری اور پھر اپنا پستول نکال کر آدم خوروں کی طرف مُونہہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ کیوں کہ اب کوئی دم

جاتا تھا کہ وہ ہمارے سامنے آنے والے تھے۔ میرے اس خیال کی تصدیق فوراًہی ہوگئی۔ آدم خور بھاگتے ہوئے ہمارے سامنے آ گئے، مگر ٹارچوں کی روشنی کو دیکھ کر اچانک ٹھٹھک گئے۔ اپنی لال انگارے جیسی خوفزدہ آنکھوں سے وہ اِن روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو ٹارچوں سے نکل رہی تھیں۔ اچانک اس روشنی سے ڈر کر انھوں نے ایک بھیانک نعرہ لگایا۔ اور پیچھے بھاگنے لگے مگران کے سردار نے ایک تیز اور کراری آواز مُونہہ سے نکالی اور غُصّے میں اپنا پاؤں زمین پر مارا۔

اِس آواز کو سُن کر وہ رُک گئے اور پھر آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھنے لگے۔ مُصیبت یہ تھی کہ ٹارچوں کی روشنی اس وقت بہت ضروری تھی کیوں کہ اس روشنی سے ہی ہم آدم خوروں کو دیکھ سکتے تھے اور دوسرا کوئی طریقہ ایسا نہ تھا کہ ہم بندوقیں بھی اسی ہاتھ میں پکڑتے، ٹارچ اور بندوقوں میں سے ایک چیز ہی ہم استعمال کر سکتے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں

سے کہا کہ وہ ٹارچیں پکڑے رہیں، میں پستول سے ان آدم خوروں کو نشانہ بناتا ہوں۔

آدم خور سردار کا اشارہ پا کر ایک ہماری طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے فوراً اپنا پستول چلا دیا۔ ایک زوردار آواز اس سُرنگ میں پیدا ہوئی اور آدم خور تڑپتا ہوا زمین پر گر گیا۔ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر ان کے سردار کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور پھر اس وہ سب کے سب ایک لمبی سی خوفناک چیخ نکالتے ہوئے ہم پر حملہ آور ہوئے۔ میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ میرے پستول سے ایک گولی پھر نکلی اور پھر یکایک اتنی زبردست آواز ہوئی کہ ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

سُرنگ کی زمین اور دیواریں ہلنے لگیں اور آدم خور دائیں بائیں ڈولنے لگے۔ میرے خیال میں یہ ایک زلزلے کا زبردست جھٹکا تھا۔ سُرنگ کی چھت میں سے وزنی پتھر آ آ کر آدم خوروں پر گرنے لگے اور وہ سب بوکھلا

کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ زلزلہ ابھی تک جاری تھا۔ گڑگڑاہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پتھّر لگاتار گر رہے تھے۔ ایک خوفناک تڑاخا پھر ہوا، بس میں اتنا ہی محسوس کر سکا کہ ہم لوگ یکایک زمین میں دھنسنے لگے۔ کوئی غیبی طاقت ہمیں پاتال کی طرف لے جا رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ اور پتھّروں کے گِرنے کا شور سُنائی دے رہا تھا۔ اور میرے ساتھیوں کی بھیانک اور تکلیف میں ڈوبی ہوئی چیخیں سُنائی دے رہی تھیں۔ اور یہ سب کُچھ جیسے ایک خواب کے عالم میں ہو رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھُلی تو میں نے خود کو ایک ہلکے سے ٹھنڈے چشمے کے کنارے پڑے ہوئے پایا، یہ تو مُجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چشمہ ہے۔ پہلے تو مُجھے اندھیرے میں نظر ہی نہیں آیا۔ آنکھیں کھولتے ہی مُجھے گھُپ اندھیرا دکھائی دیا۔ میں نے اِدھر ادھر ہاتھ بڑھا کر کُچھ ٹٹولنے کی کوشش کی، مگر سوائے زمین کے پتھّروں کے میرے ہاتھ اور کوئی چیز نہیں لگی۔

بیٹھے ہی بیٹھے میں آگے کی طرف کھسکا۔ اس بار میرا ہاتھ پتّوں سے ٹکرایا۔ معلوم ہوا کہ یہ نجمہ ہے۔ نجمہ کے جسم کو چھوتے ہی مُجھے خیال آیا کہ شاید ہم اس وقت بھی ساتھ ہی ہیں اور کوئی ہم سے جُدا نہیں ہوا ہے۔

میں نے آہستہ سے آواز دی۔

"نجمہ بیٹی۔۔۔۔۔ نجمہ بیٹی۔۔ نجمہ بے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ٹی۔۔۔۔ نجمہ بیٹی۔۔ نجمہ بے۔۔ٹی۔۔۔۔"

یہ دراصل گونج تھی اور میں حیران تھا کہ یہ گونج کیوں پیدا ہو رہی ہے۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ سامان کا تھیلا تو میری کمر سے ابھی تک بندھا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے ٹارچ ٹٹول کر نکالی اور پھر اسے جلایا۔۔۔ آہ میں کیا بتاؤں کہ میں نے کیا منظر دیکھا۔۔۔؟

میں نے دیکھا کہ روشنی سامنے چٹّانوں پر پڑ کر دگنی ہو گئی ہے، چٹانوں میں نہ

جانے کیا چیز لگی ہوئی تھی کہ روشنی پڑتے ہی وہ قوسِ قزح کے رنگوں میں ستاروں کی طرح جھِل مِل کرنے لگی۔ جس طرف بھی روشنی کی لکیر پڑتی، ایسی ہی رنگ برنگی شعاعیں پھوٹنے لگتیں۔ اب کے میں نے اوپر روشنی ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اوپر چھت سی ہے۔ نوکیلی اور مخروطی چٹّانیں چھت سے لٹک کر نیچے تک پہنچ رہی ہیں۔ یہ چٹّانیں ہلکے زرد رنگ کی تھیں۔ اوپر سے اِن کا قُطر بڑا تھا اور نیچے آتے آتے یہ سوئی کی طرح باریک ہو جاتی تھیں۔ چھت میں جگہ جگہ ایسی ہی نوکیلی اور گاؤدمی چٹّانیں لٹکی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے چھت سے کوئی پاؤڈر جیسی چیز نیچے ٹپکنی شروع ہوئی ہو اور آہستہ آہستہ وہ ایک ٹھوس چٹان بن گئی ہو۔ یا پھر موم کی طرح ٹپکتے ٹپکتے گاؤدمی شکل بن گئی ہو!

شاید میری آواز یا اس کی گونج سن کر نجمہ نے کراہ کر آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ بھی اب اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، ٹارچ کی روشنی زمین پر ڈال کر

میں نے دیکھا کہ ایک چشمہ نہ جانے کس سمت سے آ رہا ہے اور خُدا جانے کس سمت کو بہتا جا رہا ہے؟ اسی چشمے کے کنارے نجمہ اور ہم سب پڑے ہوئے تھے۔ ہوش آنے کے بعد مُجھے اس تکلیف کا احساس ہونے لگا جو زلزلے کے باعث پتھرّ گِرنے سے لگی تھیں۔ چوٹیں شاید دوسروں کو بھی لگی تھیں۔ کیونکہ امجد، جان، جیک، سوامی اور اختر بھی کراہتے ہوئے اُٹھ رہے تھے۔ وہ مُجھ سے باربار پوچھ رہے تھے کہ ہم کہاں ہیں؟ مگر یہ بات تو مُجھے بھی معلوم نہیں تھی۔ پھر بھلا میں انہیں کیا بتاتا۔

جب وہ سب ہوش میں آ گئے تو معلوم ہوا کہ کسی کو بھی چوٹیں نہیں آئی ہیں۔ ٹارچ کی روشنی چونکہ ایک ہی سِمت پڑتی تھی اس لئے میں نے سوامی سے کہا کہ وہ مشعل جلائے۔ مشعل جب جل گئی تو اس کی روشنی میں وہ جگہ صاف نظر آنے لگی۔ وہ چشمہ، زمین، چٹاّنیں اور وہ عجیب و غریب شعاعیں اب سب کو اچھّی طرح دکھائی دے گئیں اور پھر جان کے مُونہہ

سے حیرت کی آواز نکلی۔

"فیروز۔۔۔ یہ کتنی عجیب جگہ ہے۔ مُجھے یقین ہے، ہاں پکا یقین ہے کہ ہم لوگ اس وقت زمین کی سطح سے کئی ہزار فٹ نیچے پاتال میں ہیں۔ سائنس دانوں نے زمین کے نیچے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ انہوں نے پاتال کے فوٹو کھینچے ہیں اور یہ مقام اُن فوٹوؤں والے مقام سے بالکل ملتا جلتا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔" امجد نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "کیا ہم پاتال میں ہیں؟"

"بالکل امجد صاحب۔۔۔ یہ پاتال ہی ہے۔ زمین سے ہزاروں فٹ نیچے بسی ہوئی ایک کالی دنیا۔"

"کالی دنیا۔۔۔؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں کالی دنیا۔ ۔ جہاں روشنی کا نام ہی نہیں ہے۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "دُنیا بھر کے خزانے یہاں کے خزانوں کے آگے ہیچ ہیں۔ یہاں فاسفورس ہے، گندھک ہے، کوئلہ ہے، کچّے ہیرے، سونا اور چاندی ہے، یہاں اتنی دولت ہے کہ زمین پر کہیں نہ ہوگی۔ میں عرصے سے ایسی جگہ آنے کا خواہش مند تھا اور آج خُدا نے میری یہ آرزو پوری کر دی۔"

"عجیب بات ہے۔" امجد نے خوف سے لرز کر کہا۔ "آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ جیتے جی آپ ایک ایسی قبر میں دفن کر دیے گئے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو امجد، بد قسمتی سے تمہاری بات سچ ہے۔ زلزلے کی وجہ سے سُرنگ دھنس گئی اور ہم لوگ اس کالی دُنیا میں آ گئے۔ جہاں کے عجائبات کا کُچھ شمار نہیں۔ جہاں بے اندازہ دولت ہمارا مُونہہ تک رہی ہے۔ لیکن اس دولت کو باہر لے جانے کا راستہ افسوس ہے کہ اب

بند ہو چکا ہے۔"

جان کی آواز گونج رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس جگہ آ کر پھنس گیا۔ کیا اس قید خانے سے کبھی چھٹکارا بھی مل سکے گا یا نہیں؟ اس جگہ پڑے پڑے چُوں کہ کافی دیر ہو گئی تھی اس لئے میں نے سب کی رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ ایک جگہ نہیں بیٹھے رہنا چاہیئے بلکہ ہر طرف گھوم پھر کر کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا چاہیئے جو ہمیں اوپر کی دُنیا تک پہنچا سکے۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا۔ بندوقیں ہاتھوں میں لیں اور چشمے کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ مشعل کی روشنی میں چٹّانیں ہیرے جواہر کی طرح چمک رہی تھیں۔ کہیں سنہرا رنگ پھوٹتا تھا، کہیں رُوپہلا، کہیں سُرخ اور کہیں نیلا۔ خُدا کی قدرت کا نرالا کرشمہ تھا، چشمے کے کنارے چلنا میں نے یوں بھی مناسب سمجھا تھا کہ ہو سکتا ہے چشمہ ہمیں اس جگہ سے نکلنے کی کوئی راہ بتا دے۔

مگر کُچھ ہی دیر بعد میرا یہ خیال غَلط ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ چشمہ دراصل پانی کی

وہ تہہ تھی جو زمین کے سینے میں ہزاروں سال سے جمع ہے۔ پانی کی اِسی تہہ سے زمین کے لوگ کنویں اور پائپ کے ذریعے پانی نکالا کرتے ہیں۔ یہ چشمہ کہیں جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ زمین میں ہر طرف بہتا رہتا ہے۔ میرے اپنے خیال میں تو کسی مقام پر جھیل بھی ہونی چاہیئے تھی اور جیسا کہ آپ دیکھیں گے بعد میں میرا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔

خیر تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ چشمے کے کنارے کنارے کافی دور تک چلنے کے باوجود بھی ہمیں کوئی راستہ نہ ملا۔ البتّہ لا تعداد غار نما سُرنگیں ضرور ملیں۔ ایک سُرنگ میں اگر ہم گھُستے تو پھر فوراً ہی دوسری طرف سے باہر نکل آتے۔ زمین سے ہزاروں فٹ نیچے کا یہ حصّہ دراصل ایک بہت بڑا ہال تھا۔ نہ ختم ہونے والا ہال۔ جس کی چھت میں آڑی تِرچھی چٹّانیں تھیں۔ ہمیں ہر وقت یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں اوپر سے ہم پر کوئی چٹّان نہ آ گِرے۔

کیوں کہ چھوٹے موٹے ٹکڑے تو لگاتار گر رہے تھے۔ اس کے علاوہ دائیں اور بائیں طرف سے نکلی ہوئی نوکیلی چٹانیں اور زمین پر پڑے ہوئے کالے سفید پتھر۔۔ یہ چیزیں بھی ہمیں تکلیف پہنچا سکتی تھیں۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ مشعل کی روشنی میں کسی چٹّان میں لگا ہوا ہیرا اتنی چمک دے جاتا کہ ہماری آنکھیں چندھیا جاتیں اور ان میں پانی آ جاتا۔

ہم اگر سرگوشی میں بھی بات کرتے تو فوراً ہی یہ سرگوشی گونج بن جاتی۔ شاید میں نے ابھی تک آپ کو یہ نہیں بتایا کہ اس سُنسان اور ویران کالی دنیا میں چمگادڑیں بھی لاتعداد تھیں۔ ایسی ویسی چھوٹی چمگادڑیں نہیں بلکہ گِدھ سے کئی گنا بڑی چمگادڑیں۔ ہمیں ہر وقت یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی چمگادڑ ہمیں نقصان نہ پہنچائے!

مگر مشعل کی لپٹوں نے شاید انہیں ہم سے دور کر رکھا تھا۔ مشعل کی بجائے اگر ٹارچ جل رہی ہوتی تو یہ ہم پر ضرور حملہ کرتیں۔ اس جگہ گرمی اتنی تھی کہ

ہمیں پسینہ آئے جا رہا تھا۔ پسینے کو بار بار چہرے سے پونچھتے ہوئے ہم لوگ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یہاں ہمیں ایسے عجیب و غریب درخت اور پودے نظر آئے جن کی تعریف افسوس ہے کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ پودے اِس قسم کے تھے کہ شاید دُنیا میں آج تک کسی نے نہ دیکھے ہوں گے۔ پتلی سی جڑ اور اوپر سے چھتری کی طرح پھیلے ہوئے پتے۔ بارش اگر ہو رہی ہو اور کوئی شخص اس پودے کے نیچے بیٹھ جائے تو وہ کبھی نہیں بھیگ سکتا!

ہماری حالت اس وقت عجیب تھی۔ زندگی کی اُمّید تو ہم کھو ہی چکے تھے۔ ہمیں یہ اچھّی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ہم جیتے جی اس جگہ سے نہیں نکل سکتے۔ لگاتار چلتے رہنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں گہرے گہرے کھڈ تھے۔ ان کھڈوں کے برابر صرف ایک پتلا سا راستہ دوسری طرف جاتا تھا۔ سامنے کی طرف ہمیں ایک چھوٹی سی آبشار بھی دکھائی

دے رہی تھی۔ لیکن اس آبشار تک پہنچنا بہت دشوار تھا۔ آبشار کے اور ہمارے درمیان جو گہرا کھڈ تھا اس میں جھانک کر دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ ہلکا گرم لاوا کھول رہا ہے۔ ہم اگر آبشار تک جانا چاہتے تو ہمیں دیوار کے ساتھ ساتھ اس دو فٹ چوڑے قدرتی راستے پر سے ہو کر جانا پڑتا جس کے بائیں طرف دیوار تھی اور اس دیوار میں بھی نوکیلے پتھرّ اور شیشے کی دھار سے بھی باریک لمبوترے اور نوکیلے ہیرے نکلے ہوئے تھے۔ اور دائیں طرف گہرا کھڈا تھا۔ جس میں لاوا کھول رہا تھا۔ راستہ میرے خیال میں کوئی بیس گز ضرور ہوگا اور یہ بیس گز لمبا راستہ ہم شاید بیس دِن میں بھی طے نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ دو فٹ چوڑے اور بیس گز لمبے راستے پر چلنے کی ہمّت ہم میں اس وقت بالکل نہ تھی۔ یہ ایک نئی مُصیبت تھی۔

"فیروز۔ یہ گرمی دراصل اُسی لاوے کی ہے جو اس سطح سے غالباً کئی ہزار فٹ نیچے بہہ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ زمین

کی اندرونی تہوں میں ابھی تک آگ بھری ہوئی ہے اور اوپر کی تہیں ٹھنڈی ہوتی جاتی ہیں۔ خُدا کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔" جان نے مجُھ سے کہا۔

"معاف کیجئے گا جان صاحب۔" امجد نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ وقت خُدا کی تعریف کرنے کا نہیں بلکہ اپنی زندگیاں بچانے کا ہے۔ آپ تو سائنس کی دُنیا میں کھو گئے، لیکن یہ بھول گئے کہ آپ اس وقت اس کالی دُنیا میں ہیں جہاں رہ کر سورج کی ایک ننّھی کِرن بھی آپ زندگی بھر نہیں دیکھ سکتے اور جہاں شاید جیگا سے بھی ملاقات ہونے کا اندیشہ ہے۔"

"معاف کرنا امجد۔" جان نے شرمندگی سے کہا۔ "واقعی یہ میری غلَطی ہے کہ میں اپنی موجودہ حالت کو فراموش کر بیٹھا۔ قدرت کے اِن چھُپے ہوئے خزانوں کو شاید کسی انسان نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی تکلیفیں بھول کر یہاں کی دلچسپیوں میں کھو گیا ہوں۔ خیر میں دوبارہ

معافی چاہتا ہوں، اب کہئے کیا کِیا جائے؟"

"کیا کِیا جائے؟ وہاں آبشار تک ہمیں ضرور پہنچنا پڑے گا کیونکہ میرے خیال میں آبشار کا یہ پانی اوپر کی زمین کی کسی دراڑ سے گر رہا ہے اور نیچے آکر آبشار بن گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہاں جانے کے بعد ہمیں ضرور کوئی نہ کوئی راستہ اوپر جانے کے لئے مل جائے گا۔" امجد نے جواب دیا۔

بات ٹھیک تھی اور امجد کا خیال ایک حد تک درست تھا اس لئے بڑی لمبی چوڑی بحث کے بعد ہم نے اس پر عمل کرنے کا پکّا ارادہ کر لیا۔ اپنے اپنے تھیلوں میں سے ہم نے وقت پر کام آنے والی دس دس گز لمبی رسّیاں نکالیں اور پھر اِن رسّیوں کو ایک جگہ جوڑ لیا۔ اس طرح ہمارے پاس تقریباً ٦٥ گز لمبی رسّی تیّار ہو گئی۔ ہر آٹھ گز کے بعد ہم نے رسّی کا ایک حلقہ بنا لیا۔ مطلب ہے کہ چُوڑی کی طرح اِسے موڑ لیا اور سب سے پہلے جیک کو اِس حلقے میں رکھا، پھر میں نے خود اپنی کمر اس حلقے میں دی۔

میرے بعد نجمہ، پھر اختر اور اختر کے بعد امجد پھر جان اور سب سے آخر میں سوامی۔

ایسا لگتا تھا جیسے کہ ہم لوگ کسی رسّہ کشی کے مُقابلے کے تیاری کر رہے ہیں۔ اس کے بعد خُدا کا نام لے کر ہم نے اس ٹیڑھے میڑھے دو فٹ کے راستے پر قدم رکھا جس کے ایک طرف نوکیلے ہیرے ہمارے جسم چھلنی کر دینے کے لئے تیّار تھے۔ اور دوسری طرف نامعلوم گہرائی میں کروٹیں لیتا ہوا گرم لاوا ہمیں نگلنے کے لئے بے قرار۔ ۔ اس بیس گز لمبے راستے پر چلنا تھا ہمیں اور ہم ڈگمگاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ہیروں کی نوکیں ہمارے جسموں میں چُبھ رہی تھیں مگر جسم سے خُون کا نکلنا لاوے میں گِر کر لاوا بن جانے سے کہیں بہتر تھا۔ نجمہ اور اختر کی چیخیں بار بار گونج جاتی تھیں۔ اور چمگادڑیں اپنے لمبے پر پھڑپھڑاتی ہوئی آتی تھیں مگر مشعلوں کی لہراتی ہوئی لپٹوں کو دیکھ کر پھر دور چلی جاتی تھیں۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ

ایک چمگادڑ نے جیک پر حملہ کر دیا اور وہ خود کو بچاتے ہوئے اس دو فٹ کے راستے پر بُری طرح ڈگمگایا۔ ڈگمگاتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ تیزی سے کھڈ میں گرا۔

اس کی دِل دہلا دینے والی چیخ گونجی۔ مگر میرے اوسان قابو میں تھے اس لئے میں فوراً مضبوطی سے رسّی کو پکڑ لیا۔ چونکہ رسّی کا اگلا سِرا جیک کی کمر سے بندھا ہوا تھا اور اس کے بعد یہی رسّی میری کمر سے بھی لپٹی ہوئی تھی۔ اس لئے میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ مگر میں نے اپنے دونوں پاؤں زمین پر جما دیے تھے اور اس جھٹکے کے لئے میں پہلے ہی سے تیّار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیک کھڈ کے اندر نہیں گِرا بلکہ رسّی سے لٹکنے لگا۔ سب سانس روکے ہوئے خوفزدہ نظروں سے جیک کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے چلّا کر جیک سے کہا کہ وہ ہمّت نہ ہارے، میں اسے اوپر کھینچتا ہوں۔ اپنے پیروں سے دیوار کا سہارا لے کر وہ خود بھی اوپر چڑھنے کی

کوشش کرے۔ میرے تسلّی دینے سے جیک میں ہمّت پیدا ہو گئی اور جو میں نے کہا تھا اس نے وہی کیا۔ میں نے اسے اوپر کھینچنا شروع کیا۔ وہ اپنے پیروں سے سہارا لے کر خود بھی اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی دیر کے بعد جیک اوپر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ نجمہ اور اختر نے بھی آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا میں نے دیکھا کہ جیک اس وقت ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا اور اُس کے ہاتھ پیر بُری طرح لرز رہے تھے۔ اس وقت ہم راستے کے بالکل بیچ میں تھے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی مُصیبت اور دقّت کے بعد ہم نے وہ راستہ طے کیا ہے۔

اِسے تو کوئی ایسا آدمی ہی جان سکتا ہے جس پر یہ افتاد پڑی ہو۔ کہنے کو تو میں نے ایک منٹ میں یہ واقعہ بیان کر دیا ہے مگر جو وقت ہم پر گذرا وہ ہمیں ایک سال سے بھی لمبا محسوس ہوا تھا۔

آبشار کے قریب آ کر ہم فوراً زمین پر گِر پڑے اور لمبے لمبے سانس لینے

لگے۔ کیوں کہ اس بیس گز لمبے راستے کو طے کرنے میں ہماری جتنی طاقت صرف ہوئی تھی وہ شاید بیس دِن میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ پچھلے حادثے کا خوف ہر ایک کے دِل پر طاری تھا۔ میں نے یہ بات محسوس کر کے ہر ایک کو اُس جنگلی پپیتے کا ایک ٹکڑا دیا جو سوامی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے آبشار سے بے حد ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیا۔ جسم میں اس سے کافی طاقت پیدا ہو گئی اور تب ہم آپس میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

یہ بحث ہونے لگی کہ اب کیا کِیا جائے۔ سوامی نے امجد کا کہنا مان کر آبشار کے آس پاس کی چٹّانوں کو اچھّی طرح چھان لیا مگر کوئی دراڑ، کوئی ذرا سا سوراخ یا راستہ باہر جانے کا اسے نظر نہ آیا۔ جب وہ نا اُمّید ہو گیا تو تھک کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اِدھر ہم سوچنے لگے کہ اب کیا کریں؟ بڑی دیر کے سوچ بچار کے بعد جان نے کہا کہ ہمیں چلتے رہنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس تلاش و جستجو کے بعد ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ باہر کی دُنیا میں جانے کا مل ہی

جائے، کیوں کہ اِس جگہ بیٹھے رہنے سے تو کُچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا!

مشعل ہاتھ میں اُٹھا کر ہم لوگ چلنے کے لئے پھر کمر بستہ ہو گئے، رسّیاں کھول کر ہم نے دوبارہ اپنے اپنے تھیلوں میں رکھ لی تھیں۔ چاقو اور بندوقیں ہاتھوں میں لے لی تھیں اور سوبیا کا ڈبّہ جان نے اب اپنے گلے میں لٹکا لیا تھا۔ نجمہ آفاقی ہار ابھی تک اپنے گلے میں پہنے ہوئے تھی۔ آفاقی ہار پر چونکہ اب ہم سب ایمان لے آئے تھے۔ اس لئے نجمہ کو بار بار تاکید کر رہے تھے کہ وہ اس ہار کو کبھی اپنے گلے سے علیحدہ نہ کرے۔

ہمارا یہ مُختصر سا قافلہ اِس ساز و سامان کے ساتھ دوبارہ اپنی نامعلوم منزل کی طرف چلنے کے لئے تیّار تھا۔ اور جان نے جب حُکم دیا تو یہ قافلہ چل پڑا۔ جُوں جُوں ہم آگے بڑھتے جاتے تھے چٹّانوں کی چمک بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جگہ جگہ رنگ برنگی آتش بازی چھوٹ رہی ہو۔ مشعل کی روشنی اِس چمک کو ہزار گُنا زیادہ کر دیتی تھی۔ آبشار کے گِرنے

سے جو چشمہ پیدا ہوا تھا، ہم اسی چشمے کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ اونچی نیچی چٹّانیں، سفید پتھرّ اور رنگ برنگے شیشے (جو یقیناً یاقوت زمرّد اور لعل ہوں گے) بار بار ہمارے راستے میں آجاتے تھے۔

یہ جگہ اتنی بڑی تھی کہ ہم اس لمبی چوڑی دنیا میں بالکل ننھّے مُنےّ سے نظر آتے تھے۔ ہماری مثال اُن چیونٹیوں کی سی تھی جنہیں کوئی ایک بہت ہی بڑے کمرے میں چھوڑ دے۔ راستہ اب کوئی نہ تھا۔ کبھی کوئی چٹّان راہ میں حائل ہو جاتی اور کبھی قدرتی سُرنگ سامنے آجاتی۔ اِس سُرنگ کو طے کرتے تو پھر سامنے کھُلا ہوا حصّہ آجاتا۔ کہیں چھت سے لٹکتی ہوئی مخروطی چٹّانیں ملتیں اور کہیں قُدرتی پُل، یہ پُل کسی سخت اور ٹھوس مٹّی کے ایک جگہ جمع ہوتے رہنے سے آپ ہی آپ بن گئے تھے۔ یہ پُل چھوٹے چھوٹے کھڈوں پر اِس خوبصورتی سے بن گئے تھے جیسے کسی انسان نے سوچی سمجھی اسکیم کی مدد سے تیّار کیے ہوں۔

ایسے ہی ایک پُل پر جب ہم نے قدم رکھا تو جیسے ہماری روح فنا ہو گئی۔ ہمیں اُسی منحوس گھنٹے کی دُور سے آتی ہوئی آواز سُنائی دینے لگی تھی جو جکاریوں کے لیے بجایا جاتا تھا اور جِس کی آواز جکاریوں کی روح کی خوراک تھی۔ یہ آواز اب ہمیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سُنائی دے رہی تھی۔ اور ابھی ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ پُل پر آگے بڑھیں یا نہیں کہ ہمیں پُل کے آخری سرے پر ایک عجیب و غریب چیز نظر آئی۔

جیسے کہ میں پہلے بتا آیا ہوں، مشعل کی روشنی چٹانوں میں چھپے ہوئے ہیروں سے ٹکرا کر سو گُنی تھی، اس لئے اس چمکیلی روشنی میں وہ چیز مُجھے پُل پر آہستہ آہستہ اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ وہ انوکھی چیز سر سے پاؤں تک سُرخ رنگ کے ایک خاص لباس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ہمارے طرف بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے چلنے کے انداز اور بڑھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہی میں چونک گیا اور گھبرا کر ایک

قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ دراصل ایک جکاری تھا جو ایک خاص قسم کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ جیگا نے ایک بار ہمیں دھمکی دی تھی کہ سوبیا اب ہمیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ تو کیا یہ لباس جکاریوں کو سوبیا کی زہریلی کرنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہے!

اِن سب باتوں کے ساتھ ہی اب یہ خیال بھی پکّا ہو گیا کہ ہم درحقیقت جیگا کی اُس زمین دوز دُنیا میں آ گئے ہیں، جہاں رہ کر وہ ہماری دُنیا کو ختم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے، اور جس کی بابت زہروی سائنس داں شاگو نے جان کو بتلایا تھا۔ مگر یہ وقت حیرت کرنے کا نہیں تھا کیوں کہ جکاری آہستہ آہستہ بے ڈھنگی چال سے ہماری طرف آ رہا تھا۔

پُل کی لمبائی اندازاً کوئی پچاس گز تھی اور جکاری اب اس کے بالکل درمیان میں آ گیا تھا۔ ہم اگر بھاگنا بھی چاہتے تو نہیں بھاگ سکتے تھے۔ کیوں کہ اس

صورت میں ہمیں پھر اُسی خطرناک راستے سے گزرنا پڑتا جسے ہم بڑی مشکل سے طے کر کے آئے تھے۔ جکاری آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا اور نجمہ و اختر خوف کی وجہ سے سِسکیاں لینے لگے تھے۔

مجھے اچھّی طرح معلوم تھا کہ بندوقیں اور چاقو جکاری کے لئے بالکل بے کار ہیں، پھر اب کیا کریں۔ وہ خونخوار درندہ اب ہم سے صرف دس گز دور رہ گیا تھا۔ نو گز۔۔۔ آٹھ گز۔۔۔ سات گز۔۔۔ اور پھر میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔ نجمہ پہلے تو ڈر رہی تھی مگر نہ جانے کیا ہوا کہ اس وقت اچانک وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے کسی خاص قوّت نے اُسے ایسا کرنے کی ترغیب دی ہو۔ اس کے ساتھ ہی جان نے سوبیا کا ڈبّہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر جکاری کی طرف کر دیا۔ سوبیا کی زہریلی کرنوں نے شاید اپنا اثر دکھایا۔ جکاری لڑکھڑانے لگا اور پھر فوراً ہی ایک چیخ مار کر پُل پر گِرا اور پھر فوراً ہی مر گیا۔

جکاری کی لاش کو ابھی ہم حیرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک اُس کے لباس پر لگا ہوا ایک گول سا سفید رنگ کا شیشہ خود بخود روشن ہو گیا۔ پہلے وہ زرد ہوا، پھر سُرخ اور پھر اچانک اُس میں سے ایک سر اٹا بلند ہوا چند لمحوں بعد ہی یہ سر اٹا آواز میں تبدیل ہو گیا۔۔۔ کوئی کہہ رہا تھا :

"خوش آمدید میرے معزّز مہمانو! کالی دُنیا میں آپ کی تشریف آوری مبارک۔۔ میں آپ کا خادم جیگا آپ سے ہم کلام ہوں۔ میں تو مُدّت سے آپ حضرات کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ زہرہ کی قسم، آج میری حسرت پوری ہو گئی، میرے خادم جکاری کو ختم کرنے کا شکریہ مسٹر جان۔ مُجھے افسوس ہے کہ سوبیا کی کرنوں سے بچاؤ کرنے والا یہ لباس بھی بے کار ثابت ہوا۔ اِس بار آپ جیت گئے۔ اِس کم بخت لڑکی کے گلے کے ہار نے بھی اپنا کرشمہ دکھایا۔ سوبیا کی کرنوں کے ساتھ مل کر اِس نے میرے خادم جکاری کو ختم کر دیا۔

مگر کوئی بات نہیں، ابھی تو کئی مرحلے باقی ہیں۔ آپ کو اس لڑکی کی اچھّی طرح حفاظت کرنی ہوگی، کیوں کہ جب تک اس کے گلے میں آفاقی ہار موجود ہے، میرا ہر اِرادہ ناکام ہو جائے گا۔ اب ایک دلچسپ بات آپ کو اور بتا دوں۔ شاگو نے آپ کو بتا ہی دیا ہے کہ میں چولا بدلنے میں ماہر ہوں۔ ایک ہی وقت میں میں دو جگہ موجود ہو سکتا ہوں۔ اس لئے آپ خود سے اور اپنے ساتھیوں سے ہوشیار رہیئے گا۔ میں ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں، بمبئی سے جس وقت آپ اس خطرناک سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ ایک انسانی شکل میں اس وقت سے ہی میں آپ کے ساتھ لگ گیا تھا۔ اب یہ پہچاننا آپ کا کام ہے کہ آپ کے جاں نثار ساتھیوں میں سے کون وہ شخص ہے جو دراصل جیگا ہے؟ آپ کو اِس اُلجھن میں چھوڑ کر اب میں چلتا ہوں۔۔ گھبرائیے مت، جلد ہی آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔"

حیرت کے مارے میرا مُونہہ پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ اور جان کی حالت یہ ہوئی کہ

پہلے وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف گھوما اور پھر ہر ایک کو اس طرح گھورنے لگا گویا پرکھنا چاہتا ہو۔ اس آواز کے آلے کا رنگ اب پھر پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ جیگا کے کہنے کے مطابق ہم میں سے ایک آدمی خود جیگا تھا۔ اس خطرناک سفر کے شروع ہی میں جیگا ہماری پارٹی کا ایک ممبر تھا اور ہم اُسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ یہ عقدہ جب کھلا تو ہم ایک دوسرے کو شُبہ کی نظر سے گھورنے لگے۔ ہماری اس پارٹی میں ایک امجد ہی ایسا آدمی تھا جو ہمارے لئے بالکل نیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم سوامی پر بھی شُبہ کر چکے تھے، جان اور جیک بھی ہمیں بعد میں ملے تھے اس لئے کون سا وہ آدمی ہو سکتا تھا جو درحقیقت جیگا تھا۔ امجد نے جب مُجھے اپنی طرف گھورتے پایا تو گھبرا کر کہنے لگا:

"نہیں، فیروز صاحب میں جیگا نہیں ہو، خُدا کی قسم میں جیگا نہیں ہوں۔ آپ مُجھے اس طرح مت دیکھئے۔"

"پھر کون ہو سکتا ہے؟" جان نے غُصّے سے چلّا کر کہا۔

"م۔۔۔م۔۔ مُجھے نہیں معلوم۔ یقین کیجئے میں جیگا نہیں ہوں۔۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مُجھ پر شُبہ کر رہے ہیں مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ میں جیگا نہیں ہوں، خُدارا میری بات کا یقین کیجئے۔"

امجد کے گڑگڑانے سے میرا دِل پسیج گیا اور میں خاموش ہو گیا۔ مگر جان نے آہستہ سے کہا:

"اور سوامی تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

سوامی خوف کے مارے کپکپا رہا تھا۔ اس کے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اس نے کافی دیر تک سُبکیاں لینے کے بعد کہنا شروع کیا:

"میں جیگا نہیں ہوں، بھگوان کی سوگند میں جیگا نہیں ہوں۔ آہ! اُس کم بخت جیگا نے ہمیں آپس میں لڑانے کی ایک چال چلی ہے، مالک آپ ہی انہیں

سمجھائیے۔ میں جیگا نہیں ہوں مالک۔"

"جھوٹ مت بولو سوامی۔۔" جان نے کڑک کر کہا۔ "تم اِس سفر میں تین مرتبہ موت کے مُونہہ میں جا چکے ہو مگر کسی نہ کسی طرح ہمیشہ بچ گئے۔ ایسے خطروں سے بچ نکلنے والا شخص یقیناً انسان نہیں بلکہ کوئی خاص ہستی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ہستی تم ہو۔ اس سے پہلے بھی ہم تم پر شُبہ کر چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ہی جیگا ہو۔۔۔ اور ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔"

"اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں تو پھر یہی سہی۔" سوامی نے نڈر ہو کر کہا۔ "لیکن اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ خود جیگا ہیں تب۔۔۔؟ تب آپ اس بات کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے کیا کہیں گے؟"

"میں تو جیگا نہیں ہوں۔۔" جان نے یکایک گھبرا کر جواب دیا۔

"جب آپ نہیں ہیں تو پھر آپ مُجھے کس طرح کہہ سکتے ہیں۔"

"بدمعاش! مُجھ سے زبان چلاتا ہے۔" جان نے غُصّے میں بھر کر جواب دیا۔

"زبان نہیں چلا رہا بلکہ سچ بات کہہ رہا ہوں۔" سوامی نے تن کر کہا۔

"خاموش بدزبان۔۔ لے میں تُجھے اِس کا مزا چکھاتا ہوں۔"

جان نے اتنا کہہ کر اپنا پستول نکال لیا اور پھر چاہتا ہی تھا کہ سوامی پر گولی چلا دے کہ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے پستول والے ہاتھ کو جھٹکے سے نیچے گِرا دیا۔ گولی چلی اور اِس زمین دوز دُنیا میں اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں انکل۔" میں نے جان سے کہا۔ "سوامی میرا پرانا ملازم ہے۔"

"مگر یہ مُجھ پر الزام کیوں لگاتا ہے؟" جان نے خونی نظروں سے سوامی کو

دیکھتے ہوئے کہا۔

سوامی نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ حد سے گُزر چکا ہے تو وہ دوڑ کر جان کے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا:

"مجھے معاف کر دیجیۓ آقا۔ میں غُصّے میں اندھا ہو گیا تھا۔ میرا یقین کر لیجیۓ کہ میں جیگا نہیں ہوں۔ یہ دراصل ہم لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کی ایک زبردست چال ہے اور جیگا اس میں کامیاب ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے پر شُبہ کر رہے ہیں۔ جب آپس ہی میں ہم ایک دوسرے پر اطمینان نہیں کریں گے تو خود ختم ہو جائیں گے۔ مُجھ سے آپ جیسی قسم چاہیں لے لیں، مگر میرا یقین کریں کہ میں یا امجد جیگا نہیں ہیں۔ آپ مالک یا جیک صاحب بھی جیگا نہیں ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی جیگا نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک چال ہے، آپ اسے سمجھیۓ اور غور کیجیۓ کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

سوامی کی یہ بات جان کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا

رہا اور پھر آخر کار بولا:

"تم ٹھیک کہتے ہو سوامی۔ تم مُجھے بھی معاف کرنا کہ میں نے تمہیں بُرا بھلا کہا۔ میں اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا۔ نہ جانے میں کیا کر بیٹھتا اُفّوہ۔۔۔ یہ مُجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں تُم پر گولی چلانے لگا تھا۔"

آپس میں بڑی دیر تک اِسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، جس جگہ ہم اس وقت تھے وہاں گرمی کم تھی۔ شاید یہ لاوے والے کھڈ سے دور ہونے کا اثر تھا۔

راستہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ چھوٹے چھوٹے سُرنگ نما غار ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں تک روشنی پہنچتی اور ہماری نظر کام کرتی ہمیں رنگ برنگے جگنو سے چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہماری منزل کوئی نہ تھی۔ ہم خود نہیں چل رہے تھے بلکہ راستہ ہمیں جس طرف لے جا رہا تھا اسی طرف جا رہے تھے۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا تھا کہ راستہ آگے جا کر بند ہو جاتا تھا۔ یا بہت دشوار گزار ہو جاتا تھا یا پھر ایسا ہوتا تھا کہ راستہ آگے ٹوٹ جاتا تھا

مطلب یہ کہ وہ ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی پگڈنڈی بیچ میں سے ٹوٹی ہوئی ملتی۔ درمیان میں ایک خلا پیدا ہو جاتا جو تقریباً دو یا تین گز کا ہوتا تھا۔ ہم اس خندق کو پار کرنے کے لئے کبھی کود کر اس طرف سے اس طرف جاتے۔ کبھی ایک آدمی پہلے کسی نہ کسی طرح دوسری طرف چلا جاتا اور رسّی اس طرف پھینک دیتا۔ اِس رسّی کو ہم کسی نوکیلی چٹان سے باندھ دیتے اور پھر مداریوں کی طرح اُس کو ہاتھوں سے پکڑ کر لٹکتے ہوئے خندق پار کرتے۔ یہ مشکلیں ایسی تھیں جنہوں نے ہمیں اَدھ موا کر دیا تھا۔ کھانے کا سامان بھی اب ختم ہونے لگا تھا۔ کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔

جس حصّے سے ہم اِس وقت گُزر رہے تھے وہاں سانپوں اور اژدہوں کی کثرت تھی۔ سانپوں کی تو ہمیں خیر زیادہ فکر نہ تھی۔ ہاں البتّہ اژدہوں سے بے حد ڈر لگ رہا تھا۔ اب تک یہ اژدہے ہمیں ایک دو جگہ مل چکے تھے۔ ان کی لمبائی چالیس چالیس فٹ تک تھی اور درمیان میں سے یہ تقریباً دو گز

موٹے تھے۔ ہمیں یہ عموماً گڑھوں ہی میں ملے۔ راستے میں پڑا ہوا ایک بھی
نہ ملا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں راستہ اب دشوار گزار ہونے لگا تھا۔ کبھی
ایسا ہوتا کہ ہم اچانک کسی سُرنگ کو پار کر کے کسی بہت بڑے ہال میں آ
جاتے۔ اور کبھی اس ہال کو طے کر کے کسی سُرنگ میں۔ ہمارا سفر اسی
طرح برابر جاری تھا اور اب ہم بھوک سے بے دم ہو رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک ایسے ہال میں پہنچ گئے جہاں کا منظر ہی نرالا تھا۔ اس
ہال کی چھت سے لٹکتی ہوئی مخروطی چٹّانیں زمین کو چھُو رہی تھیں اور ایسی
چٹّانیں یہاں بے شمار تھیں۔ اِن چٹّانوں میں جو چمکیلے پتھّر چپٹے ہوئے تھے
وہ مشعل کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔ زمین میں جگہ جگہ
گول سوراخ تھے اور اِن سوراخوں میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ عجیب
جگہ تھی۔ یہاں ہمیں قدرتی پودے بھی کافی تعداد میں ملے۔ یہ پودے اُن
درختوں سے بالکل جُدا تھے جو ہمیں پہلے مل چکے تھے۔ چٹّانوں میں سے

ایک طرف ایک چھوٹی سی آبشار گزر رہی تھی اور اس آبشار کا پانی زمین کی دراڑوں میں جا رہا تھا۔ ہمیں قدم قدم پر جکاریوں، زوکوں اور آدم خوروں کے آنے کا خدشہ تھا۔ اس لئے ہم ہر وقت چوکنّے تھے۔

جان نے اس جگہ آرام سے بیٹھنے کے بعد کہا:

"فیروز، اب تو بھوک سے دم نکلا جا رہا ہے۔"

"کیا کروں انکل۔۔۔ میرے پاس اب تو کوئی پھل نہیں ہے۔"

"ابّا جی۔۔ کیا ہم اِن پودوں کو نہیں کھا سکتے۔ آپ دیکھئے ان پودوں کے پتّے کتنے بڑے بڑے ہیں اور اِن کے بیچ میں سُرخ رنگ کا ایک پھل بھی لٹکا ہوا ہے۔" نجمہ نے کہا۔

"میں توڑ کر لے آؤں ابّا جی۔۔؟" اختر نے کہا۔

"نہیں بابا۔۔۔ پتہ نہیں وہ پھل کیسا ہو۔ ہمیں اس جگہ زہریلے پھل بھی مل

سکتے ہیں۔" سوامی نے اختر کو روکا۔

"پھر کیا کیا جائے۔ بھوک سے تو ہماری جان نکلی جا رہی ہے۔" نجمہ نے آہستہ سے کہا۔

"بہت اچھّا، میں یہ پھل لینے جاتا ہوں۔۔۔"

امجد نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

"اچھّا پھر تم ہی جاؤ۔" جان نے کہا۔ "مگر اِسے کھانا نہیں۔"

امجد نے اپنا نوکیلا چاقو ہاتھ میں لیا اور پھر آہستہ آہستہ ایک پودے کی طرف جانے لگا۔ مخروطی چٹّانوں کا سہارا لیتا ہوا اور اِدھر اُدھر احتیاط سے دیکھتا ہوا وہ اُس پودے کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے سوچا کہ امجد کے ساتھ ساتھ میں بھی کُچھ پھل توڑ لوں گا، اس لئے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں تک پہنچ گیا۔

وہ پودا۔۔۔ بلکہ پودا کیا اُسے درخت کہنا چاہیئے، امجد کے قد سے کوئی دو فٹ اونچا تھا۔ اس کے ہاتھی کے کان جیسے پتّوں میں بُول جیسے کانٹے تھے اوراِس درخت کے پتّوں کے بیچ میں خربوزے سے بھی بڑے سُرخ پھل لٹکے ہوئے تھے۔ مُجھے یقین تھا کہ یہ پھل ضرور ذائقے دار ہوں گے۔ امجد نے آگے بڑھ کراس درخت کے اِن پھلوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس کام کے لئے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک ٹھٹھک گیا۔ اس درخت کے وہ لمبے لمبے پتے اب آہستہ آہستہ نیچے جھک رہے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ میں یا امجد آگے پیش آنے والے حادثے کو جان سکتے، درخت کے پتّوں نے امجد کو چاروں طرف سے ڈھک لیا۔ اس نے ایک خوفناک چیخ ماری اور شاید وہ غریب ان پتّوں سے لڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے بقیہ ساتھیوں کو آواز دی اور پھر خود بھی امجد کی مدد کو دوڑ پڑا۔ میری سمجھ میں اور تو کُچھ نہیں آیا، بس اپنا چاقو نکال کر میں

نے بھی باہر سے پتّوں پر وار کرنا شروع کر دیا۔ نجمہ خوف کی وجہ سے چلا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی۔

"انہیں بچائیے ابّا جی۔ ۔ انہیں بچائیے۔"

جیک نے گولی چلانی چاہی۔ مگر جان نے اسے فوراً روک دیا اور کہا:

"کیا کرتے ہو بے وقوف! گولی امجد کے بھی لگ سکتی ہے۔ آؤ اپنے چاقوؤں سے اس زندہ درخت کو چھید کر رکھ دو۔"

جب سب نے مل کر اپنے چاقوؤں سے درخت پر حملہ کر دیا تو اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ درخت کے پتّے اوپر اٹھنے لگے۔ لیکن اٹھتے اٹھتے بھی وہ امجد کو دبوچنے کی کوشش برابر کر رہے تھے۔ مُجھے تو بس ذرا سا موقع چاہئے تھا۔ اور یہ موقع ملتے یہ میں نے امجد کی ٹانگیں پکڑ کر اسے فوراً باہر گھسیٹ لیا۔ درخت کے پتّے اب اِس طرح پھڑ پھڑا رہے تھے گویا اپنے شکار کو جاتے

دیکھ کر بے بسی سے کوئی ہاتھ مل رہا ہو۔

امجد کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر میں آبشار کے نزدیک لے آیا۔ وہ غریب لہو لہان تھا اور "خوف کی وجہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ ہمارے دِل بھی قابو میں نہیں تھے اور ڈر کے باعث ابھی تک ہمارے ہاتھ لرز رہے تھے۔ میں نے نجمہ سے کہا کہ وہ امجد کے زخموں کو پانی سے دھونا شروع کرے، اتنے میں آس پاس کوئی کھانے کی چیز تلاش کرتا ہوں۔ مگر نجمہ نے آنسو بہاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں ابّا جی مُجھے کُچھ نہیں چاہیئے۔۔ ہائے یہ ہم کہاں آ گئے جہاں کے درخت بھی آدم خور ہیں۔"

"روؤ مت بیٹی۔" جان نے نجمہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ دُنیا ہمارے لیئے بالکل نئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم یہاں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ اگر ہمیں پہلے سے پتہ ہوتا تو امجد کو اس درخت کے

قریب جانے ہی نہیں دیتے۔"

نجمہ کے ساتھ ہی اختر اور سوامی نے بھی امجد کے زخموں کو دھویا۔ جہاں مرہم پٹّی کی ضرورت تھی وہ کر دی اور اتنے عرصے میں اس حال میں گھومتا رہا۔ گھنٹے کی آواز ابھی تک برابر آ رہی تھی۔ میں یہ اچھّی طرح جانتا تھا کہ اس زمین دوز دُنیا میں کسی نہ کسی مقام پر جکاریوں کی ایک کافی بڑی تعداد موجود ہے اور یہ مقام زیادہ دور نہیں ہے۔ خطرات کی چکّی میں بُری طرح پسنے کے بعد اب جکاریوں کا خوف میرے دِل سے جاتا رہا تھا۔

مجھے یہ اچھّی طرح معلوم تھا کہ ہم سب کو مرنا تو ہے ہی۔ جب اِس کالی دُنیا میں سے ہماری لاشیں بھی باہر نہیں جا سکتیں تو پھر ہم ڈریں کیوں؟ مرنا ہے تو بہادری کے ساتھ مریں! مُجھے اپنی فکر تو نہیں تھی ہاں البتّہ بچّوں کا غم بُری طرح کھائے جا رہا تھا۔ میرے ساتھ یہ دو معصوم زندگیاں بھی تباہ ہو رہی ہیں۔ اس کا مُجھے بہت افسوس تھا۔

ہر طرف گھومنے پھرنے کے بعد بھی مجھے کوئی ایسی چیز نہیں نہیں ملی جسے ہم لوگ کھا سکتے۔ بڑی مشکل اور چھان بین کے بعد میں ایک دراڑ میں اُگی ہوئی کچھ جڑیں توڑلایا جو موٹائی میں گاجر جتنی تھی۔ یہ جڑیں میں نے جان کو دے دیں، جان چوں کہ سائنس داں تھا اور جڑی بوٹیوں کو پہچاننے میں خاصی مہارت رکھتا تھا اس لئے اس نے پہلے انہیں سونگھا اور پھر تھوڑا سا چکھا اس کے بعد کہنے لگا۔

"یہ چیز مولی جیسی ہے۔ ہم اسے کھا سکتے ہیں۔"

جان کی زبانی یہ سُننا تھا کہ سب بھوکی نظروں سے اِن جڑوں کو دیکھنے لگے۔ میں نے اُن نظروں کا مطلب سمجھ کر ایک ایک جڑ سب میں بانٹ دی اور پھر امجد کے زخموں کو غور سے دیکھنے لگا۔ نہ جانے آبشار کے پانی میں کیا اثر تھا؟ وہ گندھک کا پانی تھا، فاسفورس کا مادہ تھا یا نہ جانے کیا تھا کہ اس کی مدد سے امجد کے زخم حیرت انگیز طریقے پر اچھے ہو رہے تھے۔ اور امجد اب

مُسکرا رہا تھا۔ جڑیں گو تھوڑی سی کسیلی تھیں مگر طاقت ور تھیں۔ اُن کو کھانے کے بعد یوں لگا جیسے کہ ہم میں پھر سے طاقت آگئی ہو۔ کھانے کی طرف سے اب ہم بے فکر ہو گئے تھے۔ کیوں کہ اس قسم کی جڑیں زمین کی بیشتر دراڑوں میں جگہ جگہ اُگی ہوئی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ اگر حلوہ پراٹھا نہیں تو نہ سہی، انسان سبزیاں بھی تو کھا سکتا ہے۔ جب پیٹ بھر گیا تو ہم آپس میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

"اس گھنٹے کی آواز بتاتی ہے کہ جکاری ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔" جان نے کہا۔ "اور ہم اس جگہ سے اب باہر بھی نہیں جا سکتے۔ فیروز! اِن باتوں کو دھیان میں رکھ کر اب تم ہی بتاؤ کہ کیا کیا جائے؟"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ اب جب کہ ہمیں اپنی زندگیوں کی اُمّید نہیں ہے، جیگا اور جکاریوں سے چھپنا بے کار سی بات ہے۔ کیوں نہ ہم ان تک پہنچ کر انہیں ختم کرنے کی سوچیں۔ یا تو ہم خود مر جائیں گے یا انہیں ختم کر دیں

گے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" جان نے کہا۔ "لیکن اب ہمارا اگلا قدم کیا ہو؟ شاگو تو اب ہمیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ صرف اس کی دی ہوئی دو چیزیں ہمارے پاس ہیں۔ سوبیا اور آفاقی ہار۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آگے جا کر یہ چیزیں ہمیں کیا فائدہ پہنچائیں گی؟"

"ایک فائدہ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔" امجد نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "اِن دونوں چیزوں نے مل کر ایک جکاری کو حفاظتی کپڑے پہننے کے باوجود بھی مار ڈالا اور شاید یہ آفاقی ہار کا ہی کرشمہ ہے کہ میرے زخم اچھے ہو رہے ہیں۔ اور اب مجھے کوئی تکلیف بھی محسوس نہیں ہو رہی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمیں جیگا کے قریب چلنا ہی چاہیے؟" جان نے پوچھا۔

"بالکل، کیوں کہ اِس کے بغیر اب کوئی چارہ بھی نہیں ہے" ۔ میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر یہ دونوں چیزیں اپنا کرشمہ پھر دکھائیں۔ شاگو نے تو یہ سب کُچھ آپ پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ کو اپنی عقل سے کام لے کر یہ طِلسم توڑنا پڑے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔۔ کیوں امجد، کیا اب تم چلنے کے لئے تیّار ہو؟"

"جی ہاں۔۔ میں اب بالکل اچھّا ہوں۔"

ہم یہ جواب سُن کر کھڑے ہو گئے اور سوچنے لگے کہ اب کس طرف جائیں؟ طے یہ پایا کہ سامنے نظر آنے والی سُرنگ ہی میں داخل ہوا جائے۔ ہمارے جسم پر سوائے جانگیوں کے اور کوئی لباس تو تھا نہیں۔ جو لباس تھا، تو وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ ہمیں اپنا جسم ڈھانکنے کے لئے بھی کوئی چیز چاہیئے تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح ہمیں کسی جانور کی کھال مل جائے تو سب کے جسم ڈھانپنے کے کام آئے۔ اس

لئے میں سُرنگ میں اِدھر ادھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کالی دُنیا میں ہم نے اِس قدر ہیرے جواہرات دیکھے تھے کہ اب ہماری نگاہوں میں ان کی کُچھ قدر نہ رہی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ ہمیں اِن قیمتی پتھروں کی ڈھیریاں ملتی تھیں اور ہم انہیں پیروں سے ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔ ہم نے صرف ایک مشعل روشن کر رکھی تھی۔ باقی کو اس لئے بُجھا دیا تھا کہ نہ جانے کب اِن کی ضرورت پڑ جائے! مشعلوں کا تیل اور موم ہمارے لئے بے حد ضروری تھا۔ وہ اگر ختم ہو جاتا تو سوائے ٹارچوں کے اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس روشنی کا نہیں تھا۔

یہ سُرنگ میرے خیال میں پہلی سب سُرنگوں سے زیادہ بڑی اور لمبی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد اس میں جگہ جگہ کُچھ دہانے نظر آتے تھے، کبھی دائیں طرف تو کبھی بائیں طرف۔ ہر دہانہ دراصل ایک نئی سُرنگ کا مُونہہ تھا۔ یہ سُرنگ بالکل سیدھی نہیں تھی بلکہ سانپ کی

طرح بل کھائی ہوئی تھی۔ ہر لمحہ مُجھے یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں ہم میں سے کوئی کم نہ ہو جائے۔ اس لئے میں بار بار آواز دیتا تھا اور اس آواز کا سب جواب دیتے تھے۔ اس طرح مُجھے اطمینان ہو جاتا کہ پارٹی کے ممبر پورے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں، ہم نے صرف ایک ہی مشعل جلا رکھی تھی اور چوں کہ سُرنگ ٹیڑھی میڑھی تھی اس لئے اس کی روشنی ان لوگوں تک نہیں پہنچتی تھی جو سب سے پیچھے آ رہے تھے۔ پیچھے آنے والے صرف میری آواز کے سہارے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔

کافی دیر اسی طرح چلتے رہنے کے بعد میں نے زور سے ایک آواز لگائی :

"سب لوگ موجود ہیں کیا۔ ۔ جواب دیتے جاؤ۔ "

"میں موجود ہوں۔" جان نے کہا۔

"میں ساتھ ہوں۔" جیک کی آواز آئی۔

"میں جیک کے پیچھے ہوں۔" سوامی نے جواب دیا۔

"میں بھی چل رہا ہوں ابّا جی۔" اختر نے پیچھے سے آواز دی۔

"میں بھی موجود ہوں۔" امجد نے پکار کر کہا۔

کچھ دیر تک تو میں انتظار کرتا رہا کہ نجمہ کی آواز آنے والی ہے۔ مگر جب دو منٹ ہو گئے تو میں نے کہا۔

"نجمہ بیٹی! تم نے جواب نہیں دیا۔"

نجمہ کا کوئی جواب نہیں آیا۔

"نجمہ۔۔۔ تم کہاں ہو۔" میں نے یکایک پریشان ہو کر کہا۔

"فیروز صاحب۔ نجمہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔" امجد کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"کیا کہا۔۔۔ نجمہ موجود نہیں ہے۔" میں نے خوف زدہ لہجے میں چلّا کر کہا۔

"جی ہاں۔۔ آپ رُکے رہیئے، میں انہیں پیچھے دیکھنے جاتا ہوں۔"

امجد مُجھے نظر تو نہیں آیا، البتّہ اس کے بھاگنے کی آواز مُجھے دیر تک آتی رہی۔ اور پھر اس کے بعد ہی مُجھے وہ گونج سُنائی دی جو چٹّانوں اور غاروں سے ٹکرا کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ یہ گونج امجد کی آواز کی تھی وہ بار بار نجمہ کو آواز دے رہا تھا مگر اس کے جواب میں نجمہ کی کوئی آواز نہ آتی تھی۔ میرا دِل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا۔ میں تو خاموش ہو گیا مگر اختر اور سوامی پریشانی کے عالم میں نجمہ کو آوازیں دینے لگے۔

اتنی آوازوں کے بعد بھی جب نجمہ کی کوئی آواز نہ آئی تو مُجھے یوں لگا جیسے کہ میری ٹانگوں میں دم نہ رہا ہو۔ میں لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے میں نے اپنا سر تھام لیا۔ امجد کے قدموں کی آواز دور سے اب قریب آ رہی تھی۔ مُجھے اس کی شکل تو دکھائی نہیں دی لیکن اس کی آواز سُنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میں انہیں کافی پیچھے تک ڈھونڈ آیا ہوں فیروز صاحب۔ مگر ان کا کہیں پتہ نہیں۔"

"مگر وہ تو تمہارے آگے تھی امجد۔ اگر وہ غائب ہو گئی تو تمہیں پتہ کیوں نہیں چلا؟" جان نے پوچھا۔

"ایک جگہ میں ایک نوکیلی چٹان سے ٹکرا کر کُچھ دیر کے لئے رکا تھا۔ ایسا لگا ہے کہ وہ اچانک وہیں سے غائب ہو گئیں۔" امجد کی آواز بھرّانے لگی۔

"آؤ۔ ہمیں اس جگہ لے چلو۔"

جان نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ میری حالت اتنی خراب تھی کہ جان نے مُجھے سوامی کی مدد سے بہت مُشکل کے بعد اُٹھایا میں نے چلنے کی کوشش کی مگر قدم بڑھتے ہی نہ تھے۔ یہ حالت دیکھ کر جان نے کہا۔

"کیا پاگل ہو گئے ہو۔۔۔ ارے بے وقوف اس طرح ہمّت ہار دینے سے

کیا تمہیں نجمہ مل جائے گی۔ آگے بڑھ کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔
گھبراؤ مت۔ نجمہ ضرور مل جائے گی۔"

جان کی یہ بات میری سمجھ میں آگئی اور اِدھر اختر نے بھی مُجھے سمجھایا۔ ان دونوں کی ہمّت بڑھانے سے اتنا تو ہوا کہ میں نجمہ کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ اور اپنا پستول نکال کر جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔ امجد نے اب اپنے تھیلے میں سے ٹارچ نکال کر جلالی تھی۔ ہم نے ٹارچوں کو صرف خاص حالات میں جلانے کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ خاص حالات اور کون سے ہو سکتے تھے۔ کُچھ ہی منٹ بعد ہم لوگ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پر امجد کے کہنے کے مطابق نجمہ غائب ہوئی تھی۔ یہاں ایک سُرنگ کا دہانہ بائیں طرف جاتا تھا، سوامی جلدی سے اِس سُرنگ میں گھُس گیا۔ وہ یہ دیکھنے گیا تھا کہ کہیں نجمہ اِس سُرنگ میں تو نہیں چلی گئی۔ اتنے عرصے میں ہم لوگ باہر کھڑے انتظار

کرتے رہے۔ ہمیں بار بار سوامی کی آواز سُنائی دے رہی تھی جو چلّا چلّا کر نجمہ کا نام پُکار رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد ہمیں سُرنگ میں سے مشعل کی روشنی باہر آتی ہوئی دکھائی دی۔ سوامی اب نجمہ کی ناکام تلاش کے بعد واپس آرہا تھا۔

"کیوں۔۔۔ ملی؟" جان نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

"جی نہیں، میں اِس سُرنگ کا چپّہ چپّہ ڈھونڈ آیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سُرنگ کی زمین کو بھی دیکھا کہ شاید کہیں بے بی کے قدموں کے نشان نظر آجائیں۔۔ مگر افسوس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے بی اُدھر گئی ہی نہیں۔"

سوامی کی زبانی یہ سُنتے ہی میں پھر ایک نااُمّیدی کے عالم میں دیوار سے سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ نجمہ سے مُجھے جس قدر محبّت تھی وہ آپ حضرات جانتے ہی ہیں۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان؟ کُچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کِیا جائے؟ دراصل وہ امجد کے آگے

آ گئے تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرے دِل میں یہ بے ہودہ خیال آیا کہ شاید یہ امجد ہی جیگا ہے اوراس نے جان بوجھ کر نجمہ کو غائب کر دیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے غور سے امجد کے چہرے کو دیکھا۔

وہ بے چارہ بڑا پریشان تھا اور اس کا چہرہ بے حد غمگین تھا۔ اس کی آنکھوں کی معصومیت کو دیکھ کر میں نے اس عجیب خیال کو اپنے دِل و دماغ سے نکال دیا اور پھر سوچنے لگا کہ اب کیا ہو گا؟ نجمہ کیسے ملے گی۔۔ ہم اسے کیسے اور کہاں تلاش کریں گے؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک امجد نے کہا۔

"ٹھہرئیے۔۔۔ ایک تدبیر دماغ میں آئی ہے۔۔ ذرا مشعل کو نیچے کیجئے۔ ساتھ ہی میں ٹارچ جلا کر اس کی روشنی بھی نیچے زمین کی طرف پھینکتا ہوں۔"

"مگراس سے فائدہ؟" جیک نے پوچھا۔

"میں نجمہ کے قدموں کے نشان دیکھوں گا۔ جہاں یہ نشان آ کر ختم ہو جائیں گے، سمجھ لیجئے کہ اسی مقام سے وہ گُم ہوئی ہیں۔"

ہم سب نے ایسا ہی کیا۔ امجد کُچھ دیر تک تو پیچھے دیکھتا رہا اور پھر واپس وہیں آگیا جہاں ہم کھڑے تھے۔ اس کے چہرے پر نااُمّیدی صاف جھلک رہی تھی۔ ٹارچ بجھا کر وہ بڑے اداس لہجے میں بولا۔

"افسوس۔۔۔ میرا خیال غَلط ثابت ہوا۔ نجمہ کے پیروں کے نشانات کو ہم سب نے مل کر ختم کر دیا ہے۔ ہمارے بھاگنے اور اِدھر اُدھر گھبراہٹ میں دوڑنے کی وجہ سے وہ نشان ختم ہو گئے ہیں۔"

میری اور اختر کی حالت اس وقت بہت زیادہ خراب تھی۔ اختر کو اپنی بڑی بہن کے گُم ہو جانے کا رنج تھا اور مُجھے اپنی پیاری بیٹی کے بچھڑ جانے کا۔ میرا دماغ جواب دے چکا تھا اور اب میں پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگا تھا۔ پہلے تو میں بُری طرح قہقہے لگانے لگا اور چیخنے لگا۔

"ہم سب یہیں مریں گے۔۔اسی جگہ گھُٹ گھُٹ کر مریں گے، جہاں نجمہ کھو گئی ہے۔ ہم اس جگہ سے باہر نہیں نکل سکتے، سُنتے ہیں انکل۔ یہ سُرنگیں ہی ہماری قبریں بنیں گی۔"

اور پھر افسردہ لہجے میں بولا۔

"نجمہ اب بھلا کس طرح ملے گی؟ میں جانتا ہوں کہ یہ سب جیگا کی کارستانی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر نجمہ کو اغوا کر لیا ہے تاکہ ہماری ہمّتیں ٹوٹ جائیں۔ میں دوسروں کے بارے میں کُچھ نہیں کہہ سکتا، مگر ہاں میری ہمّت اب جواب دے گئی ہے۔ میں اب یہاں سے آگے نہیں بڑھوں گا۔ ہرگز آگے نہیں بڑھوں گا۔"

اتنا کہہ کر میں بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سب مُجھے تسلّی دیتے جاتے تھے لیکن میں برابر روئے جاتا تھا۔ میرے ساتھ ہی اختر بھی رو رہا تھا۔ سب لوگ نجمہ کا غم بھول تو گئے اور مُجھے خاموش کرنے میں

لگ گئے۔ ایسا وقت شاید مُجھ پر کبھی نہ گذرا ہو گا۔ جتنا وہ مُجھے چپ کرتے میں اتنا ہی روتا۔ جب ان سب نے دیکھ لیا کہ میں اس مقام پر جم کر بیٹھ گیا ہوں تو انھوں نے مجبوراً وہاں اپنا اپنا سامان رکھ دیا اور میرے قریب بیٹھ گئے۔ جان میرے رونے سے اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ آخر اس نے تنگ آ کر کہا۔

"خاموش ہو جاؤ فیروز! ہم سب کا دماغ خراب مت کرو۔ کیا بچّوں کی طرح روتے ہو۔ اس طرح تو تم سب کے اوسان خراب کر دو گے۔ بھلے آدمی رونا دھونا چھوڑو اور نجمہ کو ڈھونڈنے کی فکر کرو۔ اگر تم اب بھی خاموش نہ ہوئے تو پھر مُجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ ہاں۔"

جان کی ان باتوں سے میری کُچھ ڈھارس بندھی اور میں نے دِل کو قابو میں کر کے کہا۔

"بہت اچھّا۔ اب میں چُپ رہوں گا۔"

"امجد تم ذرا اپنے دماغ پر زور ڈالو شاید تمہیں کوئی سُراغ ہاتھ آ جائے۔"
جیک نے امجد سے کہا۔

امجد پہلے تو کُچھ دیر تک اپنے سر کو پکڑے بیٹھا رہا اور پھر اس کے بعد یکایک چٹکی بجاتے ہوئے بولا:

"بالکل ٹھیک، بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا۔ لیجیئے جان صاحب، مُجھے یقین ہے کہ اب نجمہ کا سُراغ ضرور مل جائے گا۔"

ہم سب جلدی سے اس کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ اس نے ٹارچ جلاتے ہوئے کہا۔

"میں سُرنگ کے اِس راستے پر کُچھ دور تک اپنے قدموں کو زور زور سے زمین پر پٹختا ہوا چلتا ہوں۔ اس طرح دھب دھب کی آواز پیدا ہوگی۔ مگر جیسے ہی آپ کو اس آواز میں کُچھ تبدیلی محسوس ہو، مُجھے روک دیں۔"

"مگراس کا مطلب۔۔۔؟"میں نے حیرت سے کہا۔

"بس آپ دیکھتے رہیئے۔۔۔"

امجد نے اتنا کہا کہ اور پھر اُلٹے قدموں پیچھے کی طرف تھوڑی دور تک چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنے پیروں کو زمین پر مارنا شروع کیا اور ساتھ ہی آگے بڑھتا رہا۔ دھب دھب دھب دھب کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں، امجد ابھی ہم سے کوئی تین گز دور ہو گا کہ یہ آوازیں اچانک بدل گئیں۔ دھب دھب کی بجائے یکایک کھٹ کھٹ کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ امجد برابر آگے بڑھتا رہا۔ دو قدم آگے بڑھانے کے بعد ہی کھٹ کھٹ کی آوازیں پھر دھب دھب میں تبدیل ہو گئیں۔ یہ محسوس کر کے امجد نے فخریہ ہم سب کو دیکھا اور پھر کہا۔

"آپ کُچھ سمجھے۔۔۔؟ جس مقام پر کھٹ کھٹ کی آواز آتی تھی، دراصل وہاں لکڑی کا فرش ہے، سُرنگ کے اندر کسی نے یہ تختے لگا رکھے ہیں اور

ان پر مٹّی ڈال دی ہے تاکہ کسی کو شُبہ نہ ہو۔ یہ تختے کسی کل کے ذریعے کھینچ لیئے جاتے ہیں۔ نجمہ نے جب اِن پر قدم رکھے تو تختے اپنی جگہ سے ہٹ گیئے اور نجمہ نیچے گِر پڑیں۔ اِن کے گِرتے ہی تختے اپنی جگہ پر پھر واپس آ گیئے اور یوں کسی نے نجمہ کو اغوا کر لیا ہے۔"

"کیا کہہ رہو امجد۔۔۔؟" میں نے اس طرح کہا جیسے مُجھے اس کی باتوں کا یقین نہ آیا ہو۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ فیروز صاحب، میں نے یہی اندازہ لگایا ہے اور جہاں تک مُجھے یقین ہے یہ اندازہ غلَط نہیں ہو سکتا۔ ضرور اِس سُرنگ کے نیچے خُفیہ تہہ خانے ہیں اور دُشمن نے نجمہ کو اِن ہی تہہ خانوں میں گِرا لیا ہے۔ میں آپ سے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات سولہ آنے درست ہے۔"

جان ٹکٹکی باندھے امجد کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں

تعریفی چمک تھی۔ جب امجد کی بات ختم ہو گئی تو اس نے خوش ہو کر کہا۔

"شاباش امجد۔۔۔ تم نے بہت کار آمد بات نوٹ کی۔ تمہاری ذہانت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔۔۔ چلو چلو، جلدی سے اس جگہ کو توڑنا شروع کر دو۔"

جان کے یہ کہتے ہی ہم لوگ اس مقام تک پہنچ گئے اور اپنے چاقوؤں کی مدد سے زمین کھودنے لگے۔ کُچھ ہی دیر بعد ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ امجد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کیوں کہ درحقیقت وہاں مضبوط تختے بچھے ہوئے تھے اور ان کا تعلّق کسی پوشیدہ کمانی سے تھا۔ کمانی دبتے ہی تختے کواڑ کی طرح ایک طرف جھک جاتے ہوں گے اور اُن پر کھڑا ہوا آدمی یا جانور نیچے گر جاتا ہو گا۔ چاقوؤں سے بھلا یہ تختے کہاں ٹوٹتے! اس لئے جیک نے جلدی سے ایک بڑا سا پتھّر اٹھایا اور پھر ان تختوں پر مارنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد تختے ٹوٹ گئے اور امجد کے کہنے کے مطابق واقعی ایک خلا نظر آنے لگا۔

امجد نے آگے بڑھ کر ٹارچ کی روشنی نیچے ڈالی تو معلوم ہوا کہ تقریباً چھ فٹ نیچے زمین ہے اور اس زمین پر پھوس بچھا ہوا ہے۔

"آپ نے دیکھا۔۔۔!" امجد نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "نجمہ کو اسی پھوس پر گرایا گیا ہے۔ جس کسی نے انہیں گرایا ہے اِس نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ گرنے والے کو چوٹ نہ لگے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو امجد۔" میں نے امجد کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ اب ہم سب جلدی سے نیچے کود جائیں۔"

"فیروز کا خیال درست ہے۔" جان نے کہا۔ "کم از کم ہمیں یہ تو پتہ لگا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔"

اپنے اپنے سامان کو اٹھا کر ہم لوگ نیچے کودنے کے لئے تیّار ہو گئے۔ سب سے پہلے امجد کودا اور اس کے بعد باری باری باقی سب کود گئے۔

نیچے جا کر ہم نے مشعلیں دوبارہ روشن کیں اور ٹارچ کی روشنی ہر طرف ڈال کر دیکھنے لگے کہ شاید کوئی خُفیہ دروازہ نظر آئے۔ مگر دروازہ تو کوئی نظر نہ آیا، ہاں البتّہ چند سیڑھیاں نظر آئیں تو جو نیچے جا رہی تھیں۔ ان سیڑھیوں کو دیکھ کر مُجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ یہ سیڑھیاں باقاعدہ تراش کر نہیں بنائی گئی تھیں بلکہ زمین کو کھود کر چھوٹے چھوٹے گڑھے سے بنا دیئے گئے تھے۔ سب سے زیادہ تعجّب مُجھے اس بات پر ہوا کہ ان سیڑھیوں کے برابر ہی کُچھ سیڑھیاں اور تھیں اور وہ باقاعدہ تراش کر بنائی گئی تھیں۔ سب سے زیادہ حیرت زدہ کر دینے والی بات یہ تھی کہ یہ سیڑھیاں شاید گڑیوں کے اُترنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ ہر سیڑھی دوسری سیڑھی سے تقریباً دو انچ اونچی اور چار انچ چوڑی تھی، بیچ میں سے یہ سیڑھیاں استعمال ہوتے ہوتے گھُس بھی گئی تھیں۔ ان سیڑھیوں کو دیکھتے ہی ہم سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"یہ سیڑھیاں ہی ہیں یا کُچھ اور۔۔۔؟" جان نے مُجھ سے پوچھا۔

"مجھے تو سیڑھیاں ہی نظر آتی ہیں۔"

"ایسا لگتا ہے جیسے کہ یہ زینے چھوٹے قد کے انسانوں نے بنائے ہوں۔" امجد نے کہا۔ "آپ دیکھیئے نا، اِن سیڑھیوں پر تقریباً ایک فٹ کا انسان چڑھ اور اُتر سکتا ہے۔"

"ایک فٹ کا انسان۔۔۔؟" جیک یہ سنتے ہی ہنس پڑا۔ "امجد صاحب بے کار باتیں مت کرو۔ بھلا ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔"

"میں نے تو اپنی عقل سے یہی بات سوچی ہے۔" امجد نے جواب دیا۔

"تمھاری بات ایک حد تک ٹھیک ہے امجد۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "اِس دُنیا میں ہم اَن ہونی باتیں دیکھ رہے ہیں۔ یہاں جو کُچھ بھی ہو، عجیب نہیں ہے۔ واقعی اِن سیڑھیوں کو دیکھ کر ہر کوئی یہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ

یہاں ایک سے انسان رہتے ہیں۔۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خیال غلط ہو۔ مگر اس طرح سوچنے اور باتیں کرنے میں وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔ ہمیں ان بڑی سیڑھیوں کے سہارے نیچے اُترنا چاہیئے اور نجمہ کو تلاش کرنا چاہیئے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کی تلاش ہمارے لئے اتنی ہی مشکل ہوتی جائے گی۔"

امجد نے جان کی باتوں کا جواب تو کُچھ نہیں دیا بلکہ ٹارچ کی روشنی زمین پر ڈال کر کُچھ اور دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ "رہے ہو؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے۔۔۔۔!" امجد نے مُونہہ سے تعجّب کی آواز نکلی۔ "یہ کیا۔۔۔ فیروز صاحب ذرا اِدھر آئیے۔"

میں جلدی سے اس کے قریب پہنچ گیا اور اس مقام کی طرف دیکھنے لگا

جہاں ٹارچ کی روشنی دائرے کی صورت میں پڑ رہی تھی۔

"غور سے دیکھئے یہ کیا ہے؟"

میں نے جب غور سے زمین کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت کے باعث پھٹی رہ گئیں۔ زمین پر نجمہ کے پیروں کے نشان صاف صاف نظر آرہے تھے۔ مگر حیرت مُجھے اِن نشانوں کو دیکھ کر نہیں ہوئی تھی۔ حیرت تو مُجھے اُن نشانوں کو دیکھ کر ہوئی تھی جو نجمہ کے نشانات کے قریب ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ نشانات تعداد میں بہت زیادہ تھے اور ان میں سے بیشتر تو ہم نے اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد مٹا دئیے تھے۔ قدموں کے یہ نشان مشکل سے ڈیڑھ انچ لمبے تھے۔ اور بہت غور سے دیکھنے کے بعد نظر آتے تھے۔ پاؤں کے نشان بتاتے تھے کہ جس انسان کے یہ نشان ہیں اس کا پاؤں صرف ڈیڑھ انچ لمبا ہے اور اس میں پانچ انگلیاں بھی ہیں۔ یہ انکشاف ایسا تھا کہ ہم لوگ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"اب فرمائیے، آپ کیا سمجھتے ہیں کیا میرا اندازہ غَلط تھا۔۔۔؟" امجد نے تعریف طلب نظروں سے مُجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔"

"اور دیکھئے یہ نشان سیڑھیوں ہی کی طرف جا رہے ہیں۔" امجد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "وہ عجیب و غریب قوم نجمہ کو پکڑ کر اِن ہی سیڑھیوں کے راستے نیچے گئی ہے۔ نجمہ بڑی سیڑھیوں پر سے اُتر کر گئی ہیں اور وہ قوم چھوٹی سیڑھیاں طے کر کے۔ دیکھ لیجئے بڑی سیڑھیوں پر صرف نجمہ کے ہی قدموں کے نشان ہیں۔"

"میرے خُدا۔۔۔۔۔!" جان نے گھبرا کر کہا۔ "تمھاری ہر سوچی ہوئی بات درست نکل رہی ہے۔"

"درست کیوں نہ نکلے گی۔۔" جیک نے عجیب سی آواز میں کہا۔ "امجد

صاحب کو پہلے ہی سے یہ سب کُچھ معلوم تھا۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" امجد جلدی سے جیک کی طرف پلٹا۔

"زیادہ بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو امجد۔۔۔" جیک نے اب یکایک اپنا چاقو ہاتھ میں لے کر کہا۔ "جتنی خوبی کے ساتھ تُم نے نجمہ کا سُراغ لگایا ہے، یہ باتیں وہی شخص کر سکتا ہے جس نے یہ سب چیزیں بنائی ہوں۔ تم بہت چالاک ہو لیکن زیادہ چالاک اور عقل مند ہونا بھی اچھّا نہیں۔ تمہاری سُراغ رسانی نے تمہاری پول کھول دی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تُم نجمہ کو پسند کرتے ہو اور اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔ مگر میں تمہارا یہ اِرادہ کبھی پورا نہ ہونے دوں گا مسٹر جیگا۔۔۔"

"جیگا۔۔۔" ہماری سہمی ہوئی آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔

"کیا کہہ رہے ہو مسٹر جیک۔۔۔۔ تم ہوش میں ہو یا نہیں؟" امجد نے گھبرا کر کہا۔

"پہلے میں بے شک بے ہوش تھا، لیکن اب ہوش میں آ گیا ہوں۔ فیروز صاحب کی پیاری بیٹی کو میں اِس طرح تباہ نہ ہونے دوں گا۔" جیک نے اپنا چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

"تم بے وقوف ہو جیک۔۔ میں جیگا نہیں ہوں۔" امجد پیچھے ہٹنے لگا۔

"تمہارے علاوہ جیگا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم ہی جیگا ہو۔ تم اتنی آسانی سے ہم سب کو ختم نہیں کر سکتے۔" جیک نے غُصّہ سے کہا۔

"جیک۔۔۔۔ خُدا کے واسطے میری بات سنو۔" امجد نے اِلتجا بھرے لہجے میں کہا۔ "یقین کرو میں جیگا نہیں ہوں۔ مُجھ سے کیسی بھی قسم لے لو۔ یہ

راستہ تو میں نے صرف اندازے سے تلاش کیا ہے۔ میری بات مانو مُجھے پہلے سے اس راستے کا ذرا بھی پتہ نہ تھا۔۔۔۔ فیروز صاحب خُدا کے لئے آپ ہی ذرا انہیں سمجھائیے۔"

"فیروز صاحب آپ اس کی باتوں میں مت آئیے گا۔۔۔ اس سے نپٹنا میں اچھّی طرح جانتا ہوں۔" جیک نے تیز آواز میں کہا۔

میں اِس وقت ایک عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔ شُبہ تو مُجھے بھی یہی ہوا تھا کہ امجد جیگا ہو سکتا ہے مگر جس اِلتجا اور بے قراری کے ساتھ امجد خود کو بے قصور ثابت کر رہا تھا اس سے میرا دِل بھی پسیجنے لگا۔ مُجھے پھر جیگا کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں کہ آپ کی پارٹی کا ایک ممبر جیگا ہے۔ ہمارے دِل صاف ہو گئے تھے مگر اب پھر یہ شُبہ پکّا ہو گیا۔ امجد دراصل ہمیں راستے میں ملا تھا اس لئے اِسی پر شک جاتا تھا۔ یہ حالت اتنی عجیب تھی کہ میرا دماغ چکرا گیا۔ میں نے جیک کو روک دیا کہ وہ ابھی امجد پر حملہ نہ کرے۔

مگر جیک پر انتقام کا بھُوت سوار تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ امجد کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔

"جلد بازی سے کام مت لو جیک۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں بعد میں پچھتانا پڑے۔" جان نے بارُعب آواز میں کہا۔

جیک آگے بڑھتے بڑھتے اچانک رُک گیا۔

"امجد کو موقع دینا چاہیئے، اگر یہ جیگا نہیں ہے تو اسے یہ بات ثابت کرنی پڑے گی۔" سوامی نے نرم آواز میں کہا۔

"میں۔۔۔ میں کیسے ثابت کر سکتا ہوں۔" امجد نے بوکھلا کر کہا۔ "کس طرح ثابت کر سکتا ہوں۔"

"تم بے شک ثابت نہیں کر سکتے مگر ایک طریقہ ہے۔" جیک نے کہا۔

"کون سا۔۔۔؟"

"میں تمھیں قتل کر دیتا ہوں، اگر تم جیگا ہوئے تو یا تو بچ جاؤ گے یا غائب ہو جاؤ گے یا خود کو تبدیل کر لو گے۔"

"لیکن اگر میں جیگا نہیں ہوا تو قتل کرنے کے بعد آپ لوگ مُجھے پھر سے زندہ کر لیں گے؟"

امجد کی یہ بات سنتے ہی میں کانپ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس بات کو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ امجد بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"آپ مُجھے اطمینان دِلا دیجئے کہ مُجھے مار ڈالنے کے بعد پھر سے زندہ کر لیں گے تو میں مرنے کے لئے تیّار ہوں۔"

سب یکایک یہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ جیک کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گِر گیا اور وہ امجد کو بُری طرح گھورنے لگا۔

"شاید آپ حضرات کے دِلوں میں کُچھ رحم پیدا ہو رہا ہے۔" امجد نے کہنا

شروع کیا۔ "مگر میں رحم کی درخواست نہیں کروں گا، کیونکہ سوچ بچار میں کافی وقت ضائع ہوچکا ہے۔ اور نجمہ نہ جانے اب ہم سے کتنی دور جا چکی ہیں میں چاہتا ہوں کہ انہیں فوراً تلاش کیا جائے اور مُجھے اسی جگہ رسّیوں سے جکڑ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی جیک صاحب میرے ساتھ رہیں اور پہرہ دیتے رہیں۔ میں کہیں بھاگ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں وقت ضائع کرنے سے بہتر یہ ہے کہ نجمہ کو تلاش کیا جائے۔ جب وہ مل جائیں تب میرے حق میں فیصلہ کر دیا جائے، مُجھے آزاد کرنا چاہیں آزاد کر دیں، ختم کرنا چاہیں ختم کر دیں۔"

امجد نے یہ باتیں ایسی بے کسی اور التجا کے ساتھ کہی تھیں کہ میرا دِل پسیج گیا اور میں نے اس سے کہا:

"نہیں امجد ایسا نہیں ہو سکتا۔ مُجھے افسوس ہے کہ تم پر شُبہ کیا گیا۔ مگر ایسا کرنے کے لئے ہم میں سے ہر شخص مجبور ہے۔ جن حالات سے ہم گُزر

رہے ہیں، انہیں تم اچھّی طرح جانتے ہو۔ تمہیں میں اپنی ذمّہ داری پر آزاد کراتا ہوں۔ اگر تم جیگا ہوئے تب بھی میں سب الزام اپنے سر لے لوں گا۔ ہماری قسمت میں جو لکھا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ اس لئے جیگا سے ڈرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم اگر اسی طرح ایک دوسرے پر شُبہ کرتے رہے تو نہ آگے کا سفر کر سکیں گے اور نہ اپنی حفاظت کر سکیں گے۔ جیک صاحب مجُھے اُمّید ہے کہ آپ بھی اب مطمئن ہو گئے ہوں گے۔"

جیک کافی دیر تک گردن جھکائے سوچتا رہا اور پھر اتنا کہہ کر چُپ ہو گیا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔۔۔ مجُھے افسوس ہے کہ میں ناحق امجد پر شُبہ کر بیٹھا۔ امجد میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

"معافی کس بات کی۔۔۔ آپ نے جو کُچھ کیا اپنے ذاتی فائدے کے لئے نہیں بلکہ سب کی حفاظت کی خاطر کیا۔ مجُھے کوئی گِلہ نہیں۔ بس اب تو میں یہ

چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد نیچے اُتر کر نجمہ کو تلاش کیا جائے۔"

بات معقول تھی اس لئے ہم لوگ نیچے اُترنے کے لئے بالکل تیّار ہو گئے۔ امجد کو اس بار ہم نے سب سے آگے رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ٹارچ کی روشنی میں نجمہ کے قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ بے ڈھنگی سی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد جلد ہی ہم لوگ پہلے مقام سے کوئی بیس فٹ نیچے اتر آئے۔ یہاں آگے ہی سُرنگوں کا وہ جال پھر شروع ہو گیا۔ مشعل کی روشنی بڑا کام دے رہی تھی۔ بعض مقامات پر کئی مخروطی چٹانیں تو ایسی تھیں کہ اگر مشعل نہ ہوتی تو ہم ضرور لہولہان ہو گئے ہوتے۔ ایک سُرنگ میں سے نکلنے کے بعد کبھی ہم دوسری سرنگ میں گھستے اور کبھی دوسری سے نکل کر تیسری میں۔ نجمہ کے قدموں کے نشانات ہمیں برابر نظر آ رہے تھے۔ کئی جگہ، جہاں زمین پتھریلی ہو گئی تھی، یہ نشانات تلاش کرنے میں بہت دقّت ہوئی مگر امجد کی ہمّت کو شاباش، کہ

وہ کسی نہ کسی طرح نشانات ڈھونڈ ہی لیتا تھا۔

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم لوگ کتنے عرصے تک چلتے رہے۔ خیال یہی ہے کہ شاید ایک گھنٹے تک متواتر چلتے رہے۔ تھکن کی وجہ سے بُرا حال تھا اور قدم اب آگے بڑھنے سے کترا رہے تھے۔ جیسا کہ میں آپ کو پہلے بتلا آیا ہوں۔ اس زمین دوز دُنیا میں دِن اور رات کی تمیز کرنا مشکل تھی۔ جس کے ساتھ ہی اب دماغ بھی تھکنے لگا تھا۔ سر بھاری بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس حالت سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ باہر کی دنیا میں یقیناً رات ہو چکی ہے اور اب اگر ہم کُچھ گھنٹوں کے لئے سو نہ گئے تو مر جائیں گے۔ مگر کس طرح سو سکتے تھے! نجمہ کی گمشدگی نے جو صدمہ پہنچایا تھا اس نے تو میری آنکھوں کی نیند اڑا رکھی تھی!

خدا خُدا کر کے سُرنگوں کا وہ جال ختم ہوا اور ہم ایک کھُلی ہوئی جگہ میں آ گئے۔ یہ جگہ ایک بہت بڑا تہہ خانہ لگتی تھی۔ کیونکہ مشعل کی روشنی اس جگہ آ

کر ہلکی ہو گئی تھی اس لئے سامنے کی طرف ہمیں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ اوپر چھت میں ویسی ہی نوکیلی چٹانیں لٹک رہی تھیں۔ ایک عجیب قسم کی بُو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور اگر ہم سانس بھی لیتے تھے تو اس کی آواز ہمیں صاف سُنائی دیتی تھی۔ ہمارے آگے ایک صاف اور چٹیل میدان تھا۔ ہم جلدی سے اس میدان میں پُہنچے مگر پھر اچانک رُک گئے۔ کیونکہ یہ میدان پندرہ گز آگے جا کر ختم ہو جاتا تھا اور اس کے بعد نہ جانے کتنے ہزار فٹ گہرا کھڈ تھا۔ ہم لوگ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور اس جگہ جا کر کھڑے ہو گئے جہاں یہ میدان ختم ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی میں نے نیچے جھانک کر دیکھا تو حیرت کی وجہ سے گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا بات ہے فیروز۔۔۔ نیچے کیا ہے؟" جان نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں کیا بتاؤں، آپ خود دیکھ لیجئے۔" تعجّب کی وجہ سے میری

زبان لڑکھڑا گئی۔

"ارے یہ کیا۔۔۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" جان نے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔ "یہ گھر ہیں ہی چھوٹے یا پھر ہمیں بُلندی سے چھوٹے نظر رہے ہیں۔"

جس چیز کو دیکھ کر میں اچنبھے میں رہ گیا تھا وہ یہی گھر تھے۔ جس جگہ ہم کھڑے تھے۔ شاید وہاں سے تقریباً دو سو فٹ نیچے ایک چھوٹی سی دُنیا آباد تھی۔ یہ گھر در حقیقت بہت چھوٹے تھے۔ اور جیسا کہ جان کا خیال تھا یہ بُلندی سے چھوٹے نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ تھے ہی چھوٹے۔ یہ دُنیا کافی بڑی تھی اور اس میں سڑکیں بھی تھیں اور ان سڑکوں پر بہت ہی عجیب و غریب گاڑیاں چل رہی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ گاڑیاں کون سی قوّت سے چل رہی تھیں۔ بہر حال ایک اچھّی خاصی رفتار سے چل ضرور رہی تھیں۔ اس کے علاوہ گاڑیوں کے پاس مُجھے کُچھ چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی

دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ شہر ہمارے ہاں کے شہروں سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ گھروں میں روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکیوں سے یہ روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ سڑکوں پر بجلی کے قمقُمے لگے ہوئے تھے۔ اور اِسی لئے سڑکیں روشن تھیں۔ اتنی اونچائی سے مُجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ہوں اور اس کی کھڑکیوں میں سے کسی شہر کو رات کے وقت دیکھ رہا ہوں۔

"یہ کون سی جگہ ہے، ہم کہاں آ گئے ہیں ابّا جی۔۔۔" اختر کے مطلب کی چیز تھی اس لئے اس نے چہک کر پوچھا۔

"دیکھا۔۔ میں آپ سے کیا غَلط کہتا تھا۔۔ یہ اُسی قوم کے گھر ہیں۔" امجد نے کہا۔

"مگر یہ قوم تو ترقّی یافتہ معلوم ہوتی ہے۔" جان نے حیرت سے کہا۔

"ان کے مکانات بنانے کے طریقے اور روشنی کے انتظامات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آئیے اب نیچے چلیں۔ مگر چلنے سے پہلے اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیجئے۔" امجد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ابھی ہم لوگ واپس چلنے کے لئے مُڑے ہی تھے کہ اچانک اُسی مقام پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ مُجھے اتنی حیرت ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا؟ اس چھوٹے سے میدان میں اس وقت ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے انسان کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے قد مشکل سے کوئی ایک فٹ کے ہوں گے۔ شکل و صورت ان کی بڑی عجیب تھی، کان اوپر سے نوکیلے تھے۔ تھوڑی لمبی اور چپٹی ناک۔ اس کے علاوہ اور سب چیزیں اُن کی انسانوں جیسی ہی تھیں۔ وہ سب بے حد چُست اور سُرخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ ہر ایک

کے سر پر ایک ٹوپی تھی جو سرکس کے جوکروں جیسی تھی۔ یعنی پیچھے سے جا کر یہ ٹوپی بالکل پتلی ہو جاتی تھی اور ٹوپی کا یہ پتلا حصّہ ان میں سے ہر ایک کے کندھے پر پڑا ہوا تھا۔ سب سے آگے ایک بونا نیلی وردی پہنے کھڑا ہوا تھا۔ آسانی کے لئے اب اس قوم کے لوگوں کو میں بونا ہی کہوں گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس لمبی چوڑی فوج کا کمانڈر تھا۔

آپ اسے حیرت کہہ لیجئے یا پھر ڈر، کہ ہم لوگوں نے ریوالور والے ہاتھ نیچے کر لئے۔ کمانڈر کے ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا اور باقی فوج کے ہاتھوں میں عجیب طرح کی گول گول گیندیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ گیندیں کس قسم کی تھیں اور وہ بونے ان سے کس قسم کا کام لینا چاہتے تھے۔ اتنا میں ضرورت سمجھ گیا تھا کہ شاید وہ اس بونی فوج کا خاص ہتھیار تھا۔ جس انداز سے وہ اِن گیندوں کو پکڑے ہوئے تھے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر ہم نے اپنی جگہ سے ذرا سی بھی جنبش کی تو وہ اِن گیندوں سے ضرور کام لیں

گے۔ اس مسخری بونی فوج کو دیکھ کر مُجھے ہنسی بھی آئی اور غُصّہ بھی۔ ہنسی تو اس لیئے کہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! اور غُصّہ یوں کہ یہ ایک فٹے بونے ہم سے ٹکّر لینے کے لیئے بالکل تیّار تھے۔

"فیروز۔۔۔ یہ ایک نئی مصیبت معلوم ہوتی ہے۔" جان نے گھبرا کر کہا۔

"مگر یہ بونے ہمارا کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے حقارت سے جواب دیا۔

"دشمن کو کبھی کمزور مت سمجھو۔ اگر یہ قوم دوڑ کر ہماری ٹانگوں سے لپٹ جائے۔ کُچھ ہمیں گِرا لیں اور باقی ہم پر چڑھ جائیں تو بھلا ہم کیا کر سکیں گے۔"

جان کی بات معقول تھی اس لیئے میں سوچنے لگا۔ ابھی میں کُچھ سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ بونوں کی فوج سمجھ میں نہ آنے والی عجیب سی زبان میں چِلّائی۔ اور اِن کے چِلّاتے ہی چند بونے سات فٹ لمبی ایک سیڑھی اٹھائے ہوئے

نمودار ہوئے ۔ سیڑھی تھی تو سات فٹ کی مگر اس میں چڑھنے کے لئے ڈنڈے اندازاً چالیس لگے ہوئے تھے ۔ اپنی پارٹی میں چوں کہ سب سے آگے میں ہی کھڑا تھا ۔ اس لئے چار بونے وہ سیڑھی پکڑے ہوئے میری طرف آئے اور انہوں نے وہ زینہ میرے شانے سے اس طرح لگا دیا جیسے میں کوئی پتھر کا بُت ہوں!

اِس کے بعد اُس بونی فوج کا کمانڈر اکڑتا ہوا آگے بڑھا اور پھر اس زینے پر چڑھنے لگا ۔ ابھی تک میری سمجھ میں کُچھ نہ آیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہیں؟ مُجھے ان کی یہ حرکتیں دیکھ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی ۔ اپنے طور پر انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم لوگ بالکل موم کی طرح ہیں اور ان کا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔ اس لئے وہ اپنی من مانی کر رہے تھے ۔ بونا کمانڈر پوری سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میرے شانے کے قریب پہنچ گیا تھا ۔ شانے کے قریب پہنچ کر اس نے اس ڈر سے کہ کہیں نیچے نہ گر پڑے ، سہارے کے لئے میرا کان

پکڑ لیا اور پھر آہستہ آہستہ اپنا مُونہہ میرے کان کے قریب لانے لگا۔
اس کی صورت بہت قریب سے دیکھنے کے بعد مُجھے پتہ چلا کہ اس بونی قوم
کی صورت ہم لوگوں جیسی ہے۔ فرق صرف کانوں میں اور جسم کے رنگ
میں تھا۔ قریب سے دیکھنے کے بعد مُجھے یہ رنگ ہلکا اودا نظر آیا۔ ابھی میں
سوچ ہی رہا تھا کہ مُجھے کیا کرنا چاہیئے کہ اچانک میرے کان میں ہلکی سی
باریک آواز آئی۔ کمانڈر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہہ رہا تھا۔

"تم لوگ ہماری قید میں ہو۔۔ ہمارے کہنے پر چلو گے تو زندہ رہو گے، ورنہ
مار دیئے جاؤ گے۔"

یہ سُنتے ہی میں اچانک بُری طرح ہنسنے لگا۔ مُجھے ہنسی اس بات پر آئی کہ بونی
فوج کے کمانڈر نے کس طرح اپنا مطلب بیان کیا تھا۔ چونکہ اُس کی آواز قد
کے لحاظ سے بہت باریک تھی اور مُجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی اس لئے اس
نے زینے کا استعمال کیا تھا۔ ہنسی مُجھے اس کی دیدہ دلیری پر بھی آئی کہ

ایک فٹ کا انسان ہوتے ہوئے بھی وہ ہم لوگوں سے ٹکر لینے کا ارادہ کر رہا تھا۔

"ہنسو مت اور غور سے سنو۔" کمانڈر نے غُصّہ ہو کر کہا۔ "تم سمجھتے ہو ہم تمہارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن ایسا نہیں ہے، ہم چاہیں تو تمہیں ختم کر دیں۔ ہم ابھی تمہیں اپنی طاقت دکھاتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے اشارہ کیا اور فوج کے اگلے بونوں نے اپنے ہاتھوں کی گیندیں ایک ساتھ ہماری طرف پھینک دیں۔ گیندیں زمین سے ٹکرانے بھی نہ پائی تھیں کہ اچانک پھٹ گئیں اور اس میں سے سُرخ رنگ کا دھواں نکل کر ہمارے چاروں طرف پھیل گیا۔ جیسے ہی دھوئیں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لیا، مُجھے یکایک ایسا لگا کہ میں، مَیں نہیں ہوں۔ میری قوّت بالکل ختم ہو گئی۔ دماغ بالکل بے کار ہو گیا، ایسا معلوم ہوا جیسے میرا دماغ میرا اپنا نہیں ہے اور اس پر کسی دوسرے نے اپنا قبضہ کر لیا ہے۔

میں نے ہاتھ ہلانا چاہا مگر ہاتھ نہیں ہلا۔ ایک طرح میں بالکل مفلوج اور بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر بونا کمانڈر میرے کان میں مُونہہ دے کر زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا :

"اب کیوں نہیں ہنستے۔۔ ہنسو، دِل کھول کر ہنسو۔۔ کیا میں نہ کہتا تھا کہ ہم تمہیں ختم کر سکتے ہیں۔ تمہاری یہ حالت دیر تک قائم نہیں رہے گی۔ مگر اتنے عرصے میں کہ تم اپنی اصلی حالت پر آؤ گے، ہم تمہیں بالکل ختم کر سکتے ہیں۔ اب اگر تم وعدہ کرو کہ کہنے پر چلو گے تو ہم تمہیں اس مُصیبت سے چھٹکارا دِلا سکتے ہیں۔"

ایسی صورت میں ہم کیا کر سکتے تھے اس لئے مُجھے مجبوراً وعدہ کرنا پڑا اور تب اس بونے کمانڈر نے اپنی جیب سے ایک نیلی لکڑی نکالی اور مُجھے سنگھائی، لکڑی سونگھتے ہی میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ بونے کے ہاتھ سے وہ لکڑی لے کر میں نے پہلے جان کو سنگھائی اور پھر جب وہ ہوش میں آ گیا تو لکڑی

اسے دے کر کہا کہ وہ باقی لوگوں کو بھی ہوش میں لے آئے۔ اس کے بعد میں نے بونے کمانڈر سے پوچھا۔

"اب بولو تم کیا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ تم ہمارے قیدی ہو۔ تم ہمارے ساتھ ہمارے زومبو میں چلو گے اور وہاں ہم تمہیں قید کر دیں گے۔"

"زومبو کیا۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

"زومبو ہمارا بڑا محل ہے جس میں ہماری مَلِکہ رہتی ہے۔ زومبو ہم نے تم جیسے دیوؤں کے رہنے کے لئے بنایا ہے۔ بہت پہلے تمہارے جیسا ایک آدمی یہاں آیا تھا اور اس نے سب جگہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہماری اس سے لڑائی ہے۔ وہ بہت غَلَط آدمی ہے۔ ہم تمہیں اس کے مقابلے کے لئے تیّار کریں گے۔ ہماری مَلِکہ جو حُکم دے گی ہم وہی کریں گے۔"

"تمہاری مَلِکہ کون ہے۔۔۔۔۔۔؟" جان نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آہستہ بولو بُڈّھے۔۔۔" بونا کمانڈر چیخ کر بولا۔ "میرے کانوں کے پردے کیوں پھاڑے ڈالتے ہو۔۔۔ہاں۔۔۔ تم نے کیا مَلِکہ کے بارے میں پوچھا تھا۔۔۔ اس کے بارے میں تمہیں سب کُچھ بتا دیتا ہوں، ہم لوگ یہاں ہمیشہ سے رہ رہے ہیں۔ ہماری مَلِکہ تمہاری جیسی ہے اور اُوپر کی دُنیا سے ہمارے پاس آئی ہے۔ اب سے بہت عرصہ پہلے وہ پاتال سے باہر، اوپر چلی گئی تھی اور پھر اوپر ہی کی ہو کر رہ گئی۔ آج وہ تمہارے ساتھ اتّفاق سے پھر اِدھر آ گئی۔ اور ہم نے اُسے تُم سے چھین لیا۔۔۔ اب وہ پھر ہماری مَلِکہ ہے۔"

"کیا کہتے ہو۔۔کیا تم نجمہ کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ابّا جی ضرور یہ بونا نجمہ آپا کا ذکر کر رہا ہے۔۔۔۔۔۔" اختر نے پریشانی سے کہا۔

"جب وہ ہمارے پاس سے گئی تھی تب بھی مقدّس بام بو کے پتّے پہنے ہوئے تھی اور جب واپس آئی ہے تب بھی مقدّس بام بو کے پتّوں سے اپنا بدن ڈھانکے ہوئے ہے۔" بونے نے فخریہ انداز سے کہا۔

"او احمق بونے۔۔۔۔۔۔ وہ تمہاری مَلِکہ نہیں میری بیٹی ہے۔"میں نے غُصّے سے کہا۔

"مَلِکہ کبھی کسی کی بیٹی نہیں ہو سکتی۔" بونے نے کہا۔ "وہ مقدّس بام بو کے تنے سے پیدا ہوتی ہے اور وہیں واپس جا کر مر جاتی ہے۔"

"اِس گدھے کی سمجھ میں کُچھ نہیں آئے گا"۔ سوامی نے کہا۔ "مالک آپ تو یہ کہیئے کہ آپ مَلِکہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اور اُسی سے باتیں کرنا چاہتے

ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔۔۔" میں نے سوامی کی بات پر عمل کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اے مقدّس بام بو کے پجاری اور اے اپنی مَلِکہ کے نمک خوار، تو ہمیں اپنی مَلِکہ تک پہنچا دے۔۔۔ ہم اُسی سے بات کریں گے۔"

بونا یہ سُنتے ہی خوش ہو گیا اور بولا۔ "خوب خوب مَلِکہ بھی یہی چاہتی ہے۔ اُسی نے ہم سب کو تمہیں گرفتار کرنے کو بھیجا ہے۔ میں ذرا نیچے اُتر جاؤں، پھر تم میرے ساتھ وہاں چلو۔"

بونا کمانڈر نیچے اُترنے کے بعد اپنی فوج کے پاس پہنچا اور اپنی باریک سی آواز میں انہیں کُچھ ہدایتیں دینے لگا۔ اِدھر ہم لوگوں میں عجیب چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نجمہ اِس بونی مخلوق کی مَلِکہ کیسے بن گئی ہے اور پھر ہمیں اپنے پاس بلانے سے اس کا مقصد کیا ہے؟

"میں نے اِس بے وقوف کی باتوں سے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہ ہے۔" امجد نے کہنا شروع کیا۔ "آواز گو مُجھے بہت ہلکی آ رہی تھی مگر میں نے سُن سب کُچھ لیا ہے۔ یہ قوم خُدا کی قُدرت سے یہاں پاتال میں بہت پہلے سے آباد ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم لوگ اوپر آباد ہیں۔ یہ کسی درخت وغیرہ کو مقدّس مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی مَلِکہ مقدّس بام بو کے تنے سے زندہ نکلتی ہے اور ان پر حکومت کرتی ہے۔ وہ مَلِکہ ہمارے قد کے برابر ہوتی ہے۔ شاید نجمہ میں اُس مَلِکہ کی شکل ملتی ہوگی اور یہ قوم کافی عرصے سے بغیر کسی مَلِکہ کے اپنا کام چلا رہی ہوگی اس لئے انھوں نے نجمہ کو پکڑ لیا ہے۔ چوں کہ وہ پتّوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں اس لئے یہ احمق سمجھتے ہیں کہ نجمہ ہی ان کی بھاگی ہوئی مَلِکہ ہے۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کہئے انکل۔۔۔۔۔۔" میں نے جان سے پوچھا۔ "اب کیا ہم ان بونوں

کے ساتھ چلیں؟"

"ضرور چلنا پڑے گا۔۔۔ نجمہ نے ہمیں گرفتار ہی اِس لئے کرایا ہے کہ ہم اسے پالیں۔"

"بالکل۔۔۔۔۔۔ اور پھر اِس کے علاوہ اور کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے۔" امجد نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ بونے ہمارے ریوالوروں کے استعمال سے واقف نہیں ہیں۔ اگر واقف ہوتے تو ان پر ضرور قبضہ کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "اس لئے بہتر یہ ہے کہ اپنے ریوالور اور بندوقوں کو استعمال کرنے کے لئے ہم سب ہر وقت تیّار رہیں۔"

"بڑی معقول بات کہی ہے تم نے۔" جان نے کہا۔ "لیکن فیروز! وہ بونا یہ بھی تو کہہ رہا تھا کہ ہمارے جیسا کوئی آدمی بہت پہلے یہاں آیا تھا اور اس

نے اِن بونوں کی دُنیا پر قبضہ کرلیا تھا۔ اُن کی اس سے لڑائی ہے اوراب مَلِکہ ہمیں اس سے لڑنے کے لئے تیّار کرے گی۔ یہ کیا قصّہ ہے ؟"

"میرے خیال میں اس کا اشارہ جیگا کی طرف ہے۔ اسی نے پاتال پر قبضہ کررکھا ہے۔ اوروہی ان کا دُشمن ہے۔"

"واقعہ یہی بات ہے۔" جان نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "فیروز۔۔۔۔۔۔ اگر ہم کسی طرح اس بونی مخلوق کی مدد حاصل کرلیں تو جیگا سے ٹکّر لیتے وقت ان کی مدد مل سکتی ہے۔"

بونا کمانڈر شاید چلنے کے لئے تیّار تھا ہمیں باتیں کرتے دیکھ کراس نے اپنے ہاتھ زورزور سے ہلانے شروع کردئیے۔ ہم نے اس کی بات سمجھ کر جواب دیا کہ ہم چلنے کے لئے بالکل تیّار ہیں، کُچھ فوج آگے چلی گئی۔ کمانڈر ہمارے ساتھ بیچ میں آگیا اور باقی فوج ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ عجیب سماں تھا ہم چھ چھ فٹ کے لوگ ایک فٹ کے انسانوں کے قیدی

بنے ہوئے تھے ان کے ساتھ جا رہے تھے۔

راستہ آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا۔ یہ راستہ کافی صاف ستھرا اور پتھرّوں سے پاک تھا۔ ہم اگرایک قدم بڑھاتے تو بونے چار۔۔۔۔۔۔ اس لئے ہمیں چلنے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ ہم آہستہ چل رہے تھے مگران کے مُقابلے میں پھر بھی تیز تھے۔ شاید ہم آدھے گھنٹے تک اسی طرح چلتے رہے حتّٰی کہ وہ مکانات قریب آ گئے جو ہمیں بُلندی پر سے گُڑیوں کے گھر نظر آتے تھے۔ واقعی وہ گُڑیوں کے گھر تھے۔ بڑے سے بڑے مکان کی اونچائی بھی مشکل سے کوئی سات فٹ ہوگی۔ یہ بونے انہیں مکانوں میں رہتے تھے۔ اسی تناسب سے اُن کی ہر ایک چیز تھی۔ شہر کے اندر تو ہم داخل ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہمارے قدموں کے دھماکے سے مکانوں کے گِر جانے کا خطرہ تھا اس لئے بونی فوج ہمیں شہر کے کنارے کنارے جانے والی ایک چوڑی سڑک پر لے آئی۔ یہ سڑک بالکل ہماری

سڑکوں جیسی تھی۔ اس سڑک کے آخر میں مُجھے ایک عالی شان محل نظر آ رہا تھا جو ہماری دنیا کے کسی قلعے جیسا لمبا اور اونچا تھا۔ میرے خیال میں یہی زومبو تھا اور بونی فوج کی مَلِکہ اسی زومبو میں رہتی تھی۔

فوج کے قدموں کی آواز سُن کر شہر کے سب بونے جلدی جلدی اپنے مکانوں کی چھتّوں پر چڑھ گئے اور ہمیں دیکھ کر نعرے لگانے لگے۔ بُلندی پر سے ہمیں سڑک کے آس پاس جو چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی دِکھائی دیں تھیں وہ دراصل یہی بونے تھے۔ ایک دو بار ہمارے برابر سے گھرر گھرر کرتی ہوئی کوئی کالی سی چیز بھی نکل گئی یہ درحقیقت وہاں کی سواری تھی اور جیسا کہ مُجھے بعد میں معلوم ہوا یہ سوبیا دھات سے ہی چلتی تھی۔ ہمارے ہاں کی موٹر میں اور پاتال کی اس سواری میں صرف اتنا فرق تھا کہ موٹر پٹرول سے چلتی ہے اور یہ سوبیا سے۔۔۔۔۔

بونے اور ان کے بچّے (سبحان اللہ! ان کے قد تو چار اور چھ انچ کے

درمیان تھے) ہمیں دیکھ دیکھ کر خُوشی سے تالیاں بجا رہے تھے اور شاید اپنی زبان میں ہمیں بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

بونوں کے شہر کے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں، میرا قلم مجبور ہے کہ وہاں کے حالات ٹھیک ٹھیک بیان کر سکے۔ وہ شہر بالکل ہمارے شہروں جیسا تھا۔ سڑکوں پر تانگے بھی چل رہے تھے۔ مگر اُن میں گھوڑوں کی جگ کُچھ عجیب قسم کے جانور جُتے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر آدمی چل رہے تھے اور بازاروں میں بڑی بھیڑ تھی۔ پورے شہر پر ایک دودھیا رنگ کی روشنی برس رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے دِن نکلا ہوا ہو۔۔ سڑک پر چلتے ہوئے ہم لوگ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے کہ گُڑیوں کے کسی شہر کا ماڈل اپنے شہر کی نمائش میں دیکھ رہے ہوں۔ اس شہر کی تعریف میں کہاں تک بیان کروں؟ اگر آپ تصوّر کریں تو اس شہر کا خاکہ آپ کے ذہن میں کھنچ کر آسکتا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ زومبو تک پہنچ گئے تھے ۔ بڑے دروازے تک پہنچنے کے لئے دس پندرہ بڑی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور ان سیڑھیوں کے برابر ہی چھوٹی سیڑھیاں ۔ بونی فوج چھوٹی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی اور ہم بڑی سیڑھیاں طے کرنے لگے کُچھ ہی دیر بعد ہم ایک بڑے ہال میں تھے ۔ جگہ جگہ دیواروں میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی ۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پوری دیواریں ہی روشن ہوں ۔ روشنی کہاں سے اور کیسے نکل رہی تھی؟ یہ اندازہ ہمیں بالکل نہ ہوتا تھا ۔ ہال کی سجاوٹ کو دیکھ دیکھ کر میں حیرت میں پڑا جا رہا تھا ۔ یہ ہال کسی بہت بڑے قلعے کا معلوم ہوتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم زمین کی سطح سے ہزاروں فٹ نیچے پاتال میں نہیں بلکہ انگلینڈ کے کسی قلعے میں چل رہے ہیں ۔ لمبے لمبے ستون چِکنا فرش اور چھت سے لٹکتے ہوئے جھاڑ فانوس ، یہ سب چیزیں ایک قلعے کی سی تھیں ۔

میں نے دیکھا کہ بونی فوج باقاعدہ مارچ کرتی ہوئی ہال میں ایک طرف ادب

کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ آدھی فوج دائیں طرف اور آدھی بائیں طرف۔ بیچ میں ہم لوگ حیران و پریشان کھڑے تھے اچانک میری نظر ہال میں بالکل سامنے کی طرف گئی۔ میں نے دیکھا کہ دِلّی کے لال قلعے جیسی ایک اونچی سی کُرسی ہال کے بالکل آخر میں بنی ہوئی ہے۔ آپ میں سے بہت سوں نے لال قلعے کے دیوان خاص میں بادشاہوں کے بیٹھنے کی یہ سنگ مرمر کی کرسی ضرور دیکھی ہوگی۔ بس یہ کرسی ویسی ہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ سنگِ مرمر کی نہیں بلکہ سیپ یا پھر کسی اور پتھرّ کی بنی ہوئی تھی۔ ہم لوگ اس کرسی کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔

بونی فوج کا کمانڈر اکڑتا ہوا اس کرسی کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے فوراً ہی چند بونی لڑکیاں جن کے قد مشکل سے دس دس انچ کے تھے بل کھاتی اور لہراتی ہوئی آئیں اور کرسی کے نیچے ادب کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ ان لڑکیوں کے بعد مُجھے چند بونے زرق برق پوشاکیں پہنے

ہوئے ہال کے اندر داخل ہوتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے ایک بونے کو اپنے درمیان میں لے رکھا تھا۔ یہ بونا بہت اونچی سی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اور دوسرے بونوں سے بالکل الگ نظر آتا تھا۔ اس کا لباس بھی سب سے زیادہ قیمتی تھا اور چال بھی شاہانہ تھی۔ ہمیں حقارت سے دیکھتا ہوا وہ اونچی کرسی کے نیچے ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھ گیا اور جیسا کہ مُجھے بعد میں معلوم ہوا وہ اس بونی مخلوق کا وزیرِ اعظم تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عصا تھا جسے اس نے تین بار زمین پر بجایا۔

اچانک ہال کے کسی کونے میں سے کُچھ بونوں نے سنکھ کی آواز جیسے کُچھ بگل بجائے اور سب ادب کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

اُونچی کرسی پر جو مسند بچھی تھی۔ وہ ابھی تک خالی تھی اور اب میں یہ اچھّی طرح جان چکا تھا کہ اس اُونچے رتبے کی مسند پر سوائے مَلِکہ کے اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ اور مَلِکہ سوائے نجمہ کے اور کوئی نہ تھی۔ بگل تھوڑے

تھوڑے وقفے کے بعد برابر بج رہے تھے اور بگل جب آخری بار ایک لمبی آواز نکال کر خاموش ہو گئے تو مجھے اونچی کرسی پر نجمہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ مگر کس حلیے میں! میں اگر آپ کو بتاؤں تو آپ بھی تعجّب کریں گے۔ سر سے پاؤں تک نجمہ ایک بہترین اور جگمگاتے ہوئے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے سر پر سونے کا تاج رکھا ہوا تھا۔ اور اس تاج میں پاتال میں پائے جانے والے بہترین ہیرے جگمگا رہے تھے۔ نجمہ کے گلے میں قیمتی ہار پڑے ہوئے تھے اور اس کی کمر کے پیچھے ایک شال لٹکی ہوئی تھی جیسی کہ آپ نے کبھی کبھار مَلِکہ برطانیہ کی تصویر میں دیکھی ہو گی۔ نجمہ کے ہاتھ میں ایک خوبصورت عصا تھا اور اس نے اس خوبصورت عصا کو ہاتھ میں پکڑ کر اوپر اٹھا رکھا تھا۔

نجمہ کو دیکھتے ہی تمام بونے خُوشی سے چلّا اُٹھے اور اپنی زبان میں انہوں نے بہت سے نعرے لگائے۔ نجمہ کے چہرے پر جو شاہی دبدبہ نظر آ رہا

تھا اس نے ایک بار تو مُجھے بھی حیرت زدہ کر دیا۔ کیا یہ میری وہی بیٹی نجمہ ہے! بونے ابھی تک چلّا رہے تھے۔ لیکن جب نجمہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کو کہا تو وہ چُپ ہو گئے اور نجمہ کے کرسی پر بیٹھتے ہی سجدے میں گِر گئے۔ اپنی بیٹی کی یہ عزّت افزائی دیکھ کر میں خُوشی سے پھولا نہ سمایا اور جوش میں چلّاتا ہوا نجمہ کی طرف بڑھا۔

"نجمہ۔۔۔ میری بیٹی! تم اِن بونوں کی مَلِکہ کس طرح بن گئیں؟"

شاید کوہ ہمالیہ کو اگر کسی چھوٹے سے ڈبّے میں بند کر دیا جاتا تو مُجھے اتنا تعجّب نہ ہوتا یا پھر اگر سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہونے لگتا تو مُجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی یہ دیکھ کر ہوئی کہ میری اپنی ہی بیٹی نجمہ مُجھے آگے بڑھتے دیکھ کر اچانک غُصّے کی وجہ سے بپھر گئی اور یکایک کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے عصا والے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا اور نہایت ہی غضب ناک آواز میں کہنے لگی۔

"کون ہے یہ بدتمیز جسے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔۔۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں مقدّس بام بو کی بیٹی ہوں!"

میں تو حیرت زدہ ہو کر اچانک پیچھے ہٹ گیا مگر پورے ہال میں ایک بھنبھناہٹ سی گونجنے لگی۔ بونے اپنے سر سجدے سے اُٹھا چکے تھے اور مُجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ نجمہ غُصّے کی وجہ سے کھڑی ہوئی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بونوں کا وزیرِاعظم اور فوج کا کمانڈر مُجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے ابھی قتل کر دے گا۔ مگر میں ان سب کی نظروں سے بے پروا، حیرت زدہ کھڑا ہوا تھا اور نجمہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ نجمہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد نے خود پر قابو پایا اور دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کُچھ لمحوں تک وہ ہال میں بھرے ہوئے بونوں کو دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"میں نہیں جانتی تم کون لوگ ہو، کوئی اور ہوتا تو اسے اِس گستاخی کی سزا مل جاتی۔ مگر تم چونکہ قیدی ہو اور چند گھڑی کے مہمان، اس لئے تمہاری اس پہلی خطا کو معاف کیا جاتا ہے۔"

نجمہ کے ان الفاظ سے مجُھے اتنا صدمہ پہنچا کہ میں گردن جھکا کر خاموش ہو گیا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"وزیرِ اعظم۔۔۔ تم کھڑے ہو کر بتاؤ کہ قیدیوں کا کیا قصور ہے؟" نجمہ نے اسی رزق برق پوشاک والے بونے سے کہا۔

"میری عزیز مَلِکہ اور اے مقدّس بوم بو کی بیٹی۔۔۔ وزیرِ اعظم نے ادب سے ایک چھوٹے سے لمبے آلے میں، جو شاید ان لوگوں کا مائیکرو فون تھا کہنا شروع کیا۔ "یہ لوگ سورج کی دُنیا کے رہنے والے ہیں، اِن جگہوں کے جہاں مقدّس اندھیرا صرف رات کو پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اُس شخص کے ساتھی ہیں جس نے ایک بار ہماری دُنیا پر قبضہ کرنا اور ہماری لال

طاقت کو چُرانا چاہا تھا۔ اس کے بعد وہ شخص کافی آگے پاتال کے دوسرے کونے پر اپنی حکومت بنا کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت بڑی طاقت کا مالک ہے اور اِن لوگوں کو بُلا کر اِن کی مدد سے ہماری دُنیا کو ختم کرنا چاہتا ہے۔"

"انہیں اِس کی سزا ملے گی۔۔۔ آگے کہو۔" نجمہ نے کہا۔

"اور جیسا کہ مَلِکہ کو معلوم ہے مَلِکہ مقدّس بام بو کی بیٹی ہے اور اُسے سب باتوں کا پہلے ہی سے پتہ چل جاتا ہے۔ یہ لوگ مَلِکہ کو چُرا کر اپنے ساتھ سورج کی دُنیا میں لے گئے، وہاں اِس لمبے شخص نے مَلِکہ کو اپنی بیٹی بنا لیا، لیکن مَلِکہ سے اپنے خادموں کی بے بسی دیکھی نہیں گئی اِس لئے وہ اِن لوگوں کو چکمہ دے کر واپس بام بو کی دُنیا میں آ گئی۔"

"ہاں یہ سچ ہے، ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔" نجمہ نے جواب دیا۔

"مَلِکہ ہماری ہے اور ہماری ہی رہے گی۔۔۔" سب بونوں نے خُوشی کا

ایک نعرہ لگایا۔

"قیدیو۔۔۔ سُنو، غور سے سُنو۔۔۔" وزیر نے کہا۔ "اب تُم سب سمجھ گئے کہ مَلکہ ہماری تھی اور تُم نے اِسے چُرالیا تھا۔ اگر یہ ہماری مَلکہ نہ ہوتی تو کس طرح تمہارے خلاف بولتی؟ اس لئے اب بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔۔۔؟"

اِس سے پہلے کہ میں کُچھ جواب دیتا، نجمہ نے چیخ کر کہا۔

"انہیں زندہ جلادو۔۔۔"

اِن الفاظ سے مُجھے اتنا رنج پہنچا کہ میں رو پڑا۔ نہ جانے خُدا مُجھے میرے کون سے گناہوں کی سزا دے رہا تھا۔ میری اپنی ہی بیٹی ایک تو مُجھے پہچانتی نہ تھی اور اوپر سے مُجھے زندہ جلا ڈالنے کا حُکم صادر کر رہی تھی۔ جان اور میرے باقی ساتھی بھی حیرت میں پڑے ہوئے تھے اور مُجھے بار بار دِلاسہ

دے رہے تھے لیکن میرا دِل تھا کہ بھرا آ رہا تھا۔ نجمہ کا یہ فیصلہ سُنتے ہی بونے پھر خُوشی سے چیخنے لگے۔ میرے مُونہہ سے تو کوئی آواز نکلی نہیں مگر جان سے نہ رہا گیا۔ اُس نے دو قدم آگے چل کر کہا۔

"خاموش۔۔۔ خاموش، مقدّس بام بو کے پجاریو خاموش۔ میں تمہاری مَلِکہ سے کُچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

بونے جب خاموش ہو گئے تو مَلِکہ نے غُصّیلی نظروں سے جان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "بولو تم کیا کہنا چاہتے ہو، ہم تمہاری بکواس ضرور سُنیں گے بُڈّھے احمق۔۔۔"

نجمہ کی زبان سے جان کی شان میں ایسے گُستاخانہ الفاظ سُن کر ہم سب کا تو خون کھولنے لگا مگر بونا کمانڈر اور بونا وزیرِ اعظم لفظ بُڈّھے احمق کو مزے لے لے کر بار بار دہرانے لگے۔ ہنستے جاتے تھے اور دہراتے جاتے تھے۔ جیسے اِس خطاب سے زیادہ واہیات خطاب جان کے لئے اور کوئی

مناسب نہ تھا۔

"بونوں کی مَلِکہ اِس عزّت افزائی کا شکریہ۔" جان نے طنزاً کہا۔

"نجمہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تُم مذاق کر رہی ہو یا واقعی سنجیدہ ہو۔ ہم تمہیں ڈھونڈنے آئے تھے کہ یہاں خود پھنس گئے۔ اِس مخلوق کا سب سے بڑا دُشمن جیگا ہے اور تُم اب اِس بونی قوم کی مدد کر رہی ہو۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جیگا اِس طرح اور دُشمن ہو جائے گا۔ خُدا کے لئے نجمہ ذرا عقل سے کام لو اور ابھی ہمارے ساتھ چلو۔"

"بُوڑھے آدمی سمجھ میں نہیں آتا کہ تُم کیا کہہ رہے ہو۔" نجمہ نے کہا۔

"مَلِکہ اِن لوگوں کی باتوں میں مت آئیے۔ یہ بہت چالاک ہیں۔" کمانڈر نے آگے بڑھ کر ویسے ہی ایک آلے میں کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر پھر اِن کا کیا کِیا جائے؟"

"میرے خیال میں انہیں زندہ جلا دینا چاہیئے۔ مقدّس بام بو پر بھینٹ چڑھائے ہوئے بھی عرصہ ہوگیا۔ اِن کی بھینٹ پاکر مقدّس بام بو خوش ہو جائیں گے۔" وزیرِاعظم نے جلدی سے کہا۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ ہم ایسا ہی کریں گے۔" نجمہ نے اتنا کہہ کر تالی بجائی اور بولی۔ "اِن سب کو ابھی آگ میں جلا دیا جائے۔"

چند بونے یہ حُکم سُنتے ہی آگے بڑھے۔ اُن کے ہاتھوں میں وہی گیندیں تھیں جِن کا دھواں انسان کو مفلوج کر دیتا تھا۔ شاید وہ ہمیں گرفتار کرنے آ رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر اختر سے نہ رہا گیا۔ وہ ابھی تک حیرت سے نجمہ کی باتیں سُن رہا تھا مگر اب اچانک چیخنے لگا۔

"نجمہ آپا یہ ظُلم ہے۔۔ یہ تم کیا کر رہی ہو نجمہ آپا؟ تُم اپنے بھائی تک کو نہیں پہچانتیں۔ مُجھے نہیں پہچانتیں۔"

"یہ لڑکا خواہ مخواہ چیخ رہا ہے۔ اِس کی زبان کاٹ لی جائے۔" نجمہ نے دوسرا حُکم صادر کیا۔

میری حالت عجیب تھی۔ کُچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ بونوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہماری طرف بڑھ رہی تھی اور ہم بے بسی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ ہمارے ہاتھوں میں ریوالور اور بندوقیں موجود ہیں۔ کیوں نہ اِن بندوقوں سے اس وقت کام لیا جائے۔ اپنا یہ خیال میں نے چُپکے سے اپنے ساتھیوں پر ظاہر کر دیا۔ بونے قریب آتے جا رہے تھے اور جب وہ ہم سے دس گز دور رہ گئے تو میں نے اشارہ کیا اور یہ اشارہ پاتے ہی ہم سب نے گولیوں کی ایک باڑھ ماری۔ گولیوں سے تو لا تعداد بونے مرے ہی مگر گولیوں کی آواز سے بھی بہت سے سہم کر گِر گئے اور فوراً مر گئے۔ باقی جو بچّے تو وہ چیختے چِلّاتے ہال سے باہر بھاگنے لگے۔ عجیب افراتفری مچ گئی۔

"رُک جاؤ۔ ۔ ۔ رُک جاؤ۔ کہاں بھاگے جاتے ہو۔" نجمہ نے اپنا عصا اُٹھا کر ہوا میں لہرایا اور چلّانے لگی۔

اُس کی آواز سن کر بونے رُک گئے، میں نے دیکھا کہ اس وقت نجمہ کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ وہ اِن نگاہوں سے ہمیں کافی دیر تک دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"قیدیو! تُم نے میرے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا۔ تمہارے پاس جادُو کی لکڑیاں ہیں جو آگ اُگلتی ہیں۔ ایسی ہی لکڑی ہمارے اس دُشمن کے پاس بھی ہے جس نے میری اِس دُنیا پر قبضہ کرنا چاہا تھا۔"

"بالکل ٹھیک بالکل ٹھیک۔" کمانڈر نے جوش میں بھر کر کہا۔

"اُس کے پاس ایک لکڑی تھی اور تمہارے پاس کئی ہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"ہاں اُن کے پاس کئی ہیں۔" کمانڈر نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں تمہارا یہ قصور معاف کرتی ہوں کہ تُم نے میرے آدمیوں کو مار ڈالا۔ مگر میں اب تمہیں ایک اور سزا دیتی ہوں۔ تُم زندہ آگ میں نہیں جلائے جاؤ گے۔ بلکہ اپنی اِن لکڑیوں کے ساتھ تم پاتال کے اُس کونے میں جاؤ گے جہاں ہمارے دُشمن کی حکومت ہے۔ وہاں جا کر تم ہمارے اُس دُشمن کو یا تو ختم کر دو گے یا پھر خود ختم ہو جاؤ گے۔ مُجھے یقین ہے کہ میری رعایا کو یہ بات پسند آئے گی۔"

نجمہ جب اتنا کہہ کر چُپ ہو گئی تو بونے خُوشی کے نعرے لگانے لگے اور پھر وزیرِ اعظم نے اُٹھ کر کہا۔

"مقدس بام بو کی بیٹی نے اِن لوگوں کی بڑی اچھّی سزا تجویز کی ہے۔ ہم سب کو اِن کی یہ سزا منظور ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ مَلِکہ جلد سے جلد اِن کو پاتال کے کونے میں بھیجے۔"

"ٹھیک ہے۔" نجمہ نے کہنا شروع کیا۔

"بس تو اے قیدیو! تمہاری زندگی کے دِن پورے ہو گئے۔ تم لوگ اب قید خانے میں جاؤ۔ تُم آرام کرو اور خود کو ہمارے دُشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے تیّار کرو۔ اِس کے بعد ہم تمہیں آزاد کر کے پاتال کے کونے کی طرف بھیج دیں گے۔"

نجمہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور جانے کے لئے تیّار ہو گئی۔ تمام بونے ایک دم پھر سجدے میں گر گئے اور نجمہ اُن پر ایک نظر ڈالتی ہوئی واپس چلی گئی۔ نجمہ کے جانے کے بعد بونوں نے اپنا سر اٹھایا اور پھر وہ کھڑے ہو گئے۔ بونوں کا کمانڈر اپنے ہاتھ میں وہی گیند تھامے ہوئے آہستہ آہستہ ہماری آنے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے جیک سے کہا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے اس بونی مخلوق کے پاس اس گیند کے علاوہ اور کوئی دوسرا ہتھیار نہیں ہے۔"

"جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔ اگر دوسرا کوئی ہتھیار ہوتا تو اسے یہ لوگ تھوڑی دیر پہلے ضرور استعمال کرتے۔" جیک نے جواب دیا۔

"فیروز تُم نے کُچھ اندازہ لگایا۔۔۔" جان نے کہنا شروع کیا۔ "نجمہ اچانک اتنے جلد کیسے بدل گئی؟"

"کُچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔" میں عجیب شش و پنج میں تھا۔ "میرا تو سوچتے سوچتے دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ نجمہ نہیں ہے بلکہ اُس کی صورت سے ملتی جلتی کوئی اور عورت ہے۔" امجد نے جواب دیا۔

"نہیں یہ کیسے مُمکن ہے، کیا میں اپنی بیٹی کو نہیں پہچان سکتا۔"

"یا پھر ہو سکتا ہے کہ اسے بونی مخلوق نے نجمہ کو کوئی ایسی چیز سنگھا دی ہو، جس کی وجہ سے اس کی یادداشت کھو گئی ہو۔" جان نے کہا۔

"ہاں یہ بات دِل کو لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہی بات ہو۔ مگر اب خاموش رہیئے، بونا کمانڈر آ رہا ہے۔"

بونا کمانڈر اُس گیند کو اپنے ہاتھ میں گھماتا ہوا ہمارے پاس آ گیا اور اپنی گردن اونچی کر کے ہم سے کہنے لگا۔

"مَلِکہ کا حُکم ہے کہ تمہیں آزاد کر دیا جائے۔ تُم لوگ اب خود کو آزاد سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس آگ اُگلنے والی لکڑیاں ہیں اور اِن کے آگے ہم تمہارا کُچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم تم سے صلح کر لیں۔ تُم لوگ کُچھ دیر آرام کر لو۔ اس کے بعد تمہیں پاتال کے دوسرے کونے تک جانے والے راستے پر چھوڑ دیا جائے گا یعنی اُسی جگہ جہاں سے تمہیں پکڑا گیا تھا۔"

یہ سن کر مُجھے خُوشی تو بہت ہوئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کمانڈر کو یہ حقیقت بتاؤں کہ ہم لوگ تو خود ہی جیگا تک جا رہے ہیں۔ اُس مقام کی باتیں اُلٹی تھیں۔ مُمکن تھا کہ یہ لوگ تب یہ سمجھ کر ہمیں روک لیتے کہ شاید ہم جیگا کے ساتھی ہیں جو وہاں جا رہے ہیں۔ ہماری خیریت اِسی میں تھی کہ ہم اس

وقت ڈر کی نمائش کرتے۔

"نہیں نہیں۔ تم ہمیں پاتال کے کونے میں مت بھیجو، وہ آدمی ہمیں مار ڈالے گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" بونے نے خُوشی سے پھول کر کہا۔ "ہم تمہیں وہیں بھیجیں گے۔"

بونا تو اکڑ دکھاتا ہوا واپس چلا گیا اور ہم لوگ وہیں ہال میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ بونی فوج بھی ایک ایک کر کے باہر چلی گئی۔ اب ہم اس ہال میں اکیلے تھے۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ بونوں کی مَلکہ، بد قسمتی سے اب میں نجمہ کو یہی کہوں گا، نے جو فیصلہ کیا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اپنی دانست میں وہ چاہتی ہے کہ ہم جیگا کے ہاتھوں مارے جائیں یا پھر اسے مار دیں۔ اسی لئے اس نے ہمیں آزاد کیا ہے، ہمیں شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت شاید اس لئے نہیں دی گئی کہ ہمارے قدموں کے دھماکوں

سے مکانات کے گر جانے کا اندیشہ تھا۔ یہ زومبو اس وقت ہمارا قید خانہ تھا اور ہمیں نہ جانے اس میں کتنی دیر تک اور رہنا تھا؟ میرا دِل چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح میں اونچی کرسی پر چڑھ جاؤں اور اس راستے کی طرف چلوں جدھر نجمہ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح نجمہ کا کُچھ پتہ چل جائے۔

اس ارادے کو پورا کرنے کی خاطر میں نے پہلے تو پنجوں کے بل اُچک کر اونچی کرسی کی طرف دیکھا اور پھر مُونہہ پر انگلی رکھ کر ہر ایک کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہوا آہستہ آہستہ اس طرف چلا۔ اونچی کرسی کے ایک حصّے کو میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ مگر پھر فوراً ہی میرے ارادوں پر اوس پڑ گئی۔ جیسے ہی میرا سر اونچی کرسی پر پہنچا، مُجھے راستے میں چار بونے کھڑے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں گیندیں تھیں اور مُجھے دیکھتے ہی یہ گیندیں انہوں نے میری طرف پھینک دیں۔ اور پھر وہی ہوا جو اب سے کافی دیر پہلے ہو چکا تھا۔ میں بالکل مفلوج ہو گیا اور میرے

ہاتھوں میں جان نہ رہی۔ دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ میرے ساتھی تیزی سے میری طرف دوڑے اور مُجھے اٹھا کر واپس لے گئے۔ میں دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا مگر میرے ہاتھ پاؤں کام نہ دیتے تھے۔ میرے ساتھی مُجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے مگر مُجھے ہوش نہ آتا تھا۔ میری یہ حالت اندازاً دو گھنٹے تک رہی اور اس کے بعد میرے ہاتھوں میں حرکت ہونے لگی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بونوں کا یہ گیند والا ہتھیار کافی خطرناک تھا، وہ انسان کو ختم تو نہیں کر سکتا تھا مگر اسے عارضی طور پر بیکار ضرور بنا سکتا تھا۔

میرے اپنے حساب سے تقریباً چھ گھنٹے بعد بونوں کا کمانڈر ہال میں داخل ہوا اور مُجھ سے اپنے مائیکروفون جیسے آلے میں مُونہہ کر کے کہنے لگا۔

"اب تم چلنے کے لئے تیّار ہو جاؤ۔ تمھیں اسی سڑک سے واپس چلنا ہے۔"

ہم فوراً تیّار ہو گئے اور بونے کمانڈر کے ساتھ ساتھ ہال سے باہر آ گئے۔

سڑک کے دونوں طرف ہزارہا بونوں کا ہجوم تھا۔ بونوں کے آگے ان کی
فوج ایک لمبی قطار میں کھڑی ہوئی تھی۔ فوج کے ہر سپاہی کے ہاتھ میں ایک
ایک گیند تھی۔ دور دور تک ہمیں بس بونے ہی بونے نظر آتے تھے۔ وہ
اپنی زبان میں چلّا رہے تھے کمانڈر نے مُجھے بتایا کہ وہ وداعی گیت گا رہے
ہیں۔ سپاہی جب دُشمن سے لڑنے کے لئے جاتا ہے تو اسی قسم کے گیت
گائے جاتے ہیں۔ ہم لوگ ہال کی سیڑھیوں سے اتر کر اب سڑک پر آ گئے
تھے۔ میں یہ سوچ کر افسردہ تھا کہ نجمہ کا کیا ہوگا؟ میں نے پکّا ارادہ کر لیا تھا
کہ نجمہ کو یہاں سے لئے بغیر ہرگز نہ جاؤں گا۔ اور جیسے ہی کمانڈر مُجھے سڑک
پر چلنے کے لئے کہے گا، پہلے تو میں اسے مار ڈالوں گا اور اس کے بعد
بندوقوں اور ریوالوروں سے گولیاں برساتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ
اندر زومبو میں جاؤں گا اور نجمہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے آؤں گا۔
میرا یہ ارادہ پورا ہونے میں اب کُچھ دیر نہیں تھی کہ اچانک مُجھے شور سُنائی

دیا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ بہت سے بونے ایک اونچی سی گاڑی کو کھینچتے ہوئے اسی طرف آ رہے ہیں۔ اس گاڑی میں پہیئے لگے ہوئے تھے اور بہت غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس گاڑی میں نجمہ بڑے شاہانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔

نجمہ کا لباس بڑا خوبصورت تھا۔ وہ ایک لمبا گاؤن پہنے ہوئے تھی جو کھڑے ہونے پر یقیناً اس کے قدموں تک آتا ہوگا۔ اس کے سر پر ابھی تک وہ حسین تاج رکھا ہوا تھا اور ہاتھ میں وہ جگمگاتا ہوا عصا ابھی تک موجود تھا۔ گاڑی ہمارے قریب آ کر رُک گئی نجمہ غضب ناک نظروں سے ہمیں اس وقت بھی دیکھ رہی تھی۔ اپنا عصا والا ہاتھ اس نے اوپر اٹھایا اور ہجوم خاموش ہوگیا۔

"قیدیو! مُجھے خُوشی ہے کہ تم ہمارے دُشمن سے لڑنے جا رہے ہو۔ ابھی تمہارے لئے بہت عمدہ کھانا لایا جائے گا۔ تم اِسے کھاؤ گے اور ہم

تمہاری سلامتی کی دُعائیں مانگیں گے۔ اس کے بعد تمہیں اسی جگہ لے جایا جائے گا جہاں سے تمہیں پکڑا گیا تھا۔ مُجھے یقین ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کروگے۔ جس کی وجہ سے تمہیں پھر مفلوج ہونا پڑے۔ تمہارے ساتھ صرف دس بڑے بڑے افسر جائیں گے۔ ان کے ہاتھوں میں مفلوج کر دینے والی گیندیں ہوں گی۔ ان افسروں کے ساتھ میں بھی چلوں گی۔ اور جب تک تمہیں اس مقام پر غائب ہوتے ہوئے نہ دیکھ لوں گی۔ جہاں سے تم ہماری دُنیا میں کودے تھے، مُجھے چین نہ آئے گا۔ واپسی پر مُجھے مقدّس باپ بام بو کے درشن بھی کرنے ہیں۔۔ کیوں میری رعایا۔۔۔ کیا میں نے ٹھیک کہا۔۔۔؟"

نجمہ کے یہ پوچھتے ہی ہزاروں آوازیں آئیں۔۔۔

"مَلِکہ سچّی ہے، مَلِکہ نے ٹھیک کہا ہے۔"

"بس تو پھر میرے حُکم کی تعمیل کی جائے۔۔۔"

نجمہ کے حُکم کی فوراً ہی تعمیل کی گئی۔ ہمارے لئے بڑے مزے دار کھانے لائے گئے۔ اس میں گوشت اور عجیب و غریب سبزیاں شامل تھیں، یہ سوچے سمجھے بغیر یہ گوشت کس کا ہے اور سبزیاں کیسی ہیں؟ ہم نے کنگلوں کی طرح فوراً ہی سارا کھانا چٹ کر لیا۔ اس کے بعد سنکھ کی آواز والے بگل بجنے لگے اور بونی مخلوق چیخ چیخ کر نعرے لگانے لگی۔ فوج میں سے دس افسر نکل کر ہمارے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ ہمیں چلنے کے لئے مجبور کیا گیا تو ہم آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھانے لگے۔ میں دِل ہی دِل میں یہ سوچ رہا تھا کہ نجمہ کو اغوا کرنے کا موقع اس وقت بالکل نہیں ہے، فی الحال تو اسے اپنے ساتھ چلنے دینا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ آگے جا کر کوئی صورت اسے اِن بونوں سے بچانے کی نکل آئے۔ اب ہوا یہ کہ سب سے آگے آگے تو ہم چلنے لگے اور ہمارے پیچھے نجمہ کا رَتھ جسے پچاس بونے کھینچ رہے تھے۔ راستے میں ہر طرف سے مَلِکہ کو سلامی ملتی

رہی۔ لوگ سجدے میں گرتے رہے، پھول برستے رہے اور نعرے لگتے رہے۔ آخر کار کچھ دیر کے بعد ہم لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے اوپر چڑھنے کا راستہ شروع ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر ملکہ گاڑی سے اتر گئی اور اس نے بونوں کو رخصت کر دیا۔ صرف وہی دس بڑے افسر باقی رہ گئے جن کے ذمّے ہمیں آخر تک پہنچانے کا کام تھا۔ نجمہ اب پیدل چل رہی تھی۔ جب بھی میں اس کی طرف دیکھتا وہ مجھے ایسی غضب ناک نظروں سے گھورتی کہ میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ اختر نے کئی بار کوشش کی کہ اپنی بہن سے بات کرے مگر نجمہ اس کی طرف دیکھتی ہی نہیں تھی۔

جب وہ سُرنگیں آگئیں جن سے گزر کر ہم اس مقام پر آئے تھے جہاں سے بونوں کی دُنیا بہت نیچے نظر آتی تھی تو نجمہ نے پہلے ہم کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مجبوراً ہم سُرنگوں میں پہلے داخل ہو گئے۔ کافی دیر تک ہم اسی طرح چلتے رہے۔ حتّیٰ کہ وہ سیڑھیاں آگئیں جن کے برابر ہی بونوں کے

چڑھنے کے لئے چھوٹی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں ہم اِن سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ نجمہ ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ اور اب کُچھ ہی دیر بعد وہ مقام آنے والا تھا جہاں پھوس بِچھا ہوا تھا اور جس کے اوپر وہ سوراخ تھا جس میں سے کُود کُود کر ہم لوگ پہلی بار اس چھوٹی سی دُنیا میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر نجمہ نے کہا۔

"قیدیو! تم اب آزاد ہو، اپنی رسّی اوپر پھینک کر تم اس کے ذریعے لٹکتے ہوئے اوپر جا سکتے ہو۔ مگر یاد رکھو ہمارے دُشمن کو ختم کرنا تمہارا سب سے پہلا کام ہوگا۔ میں چاہتی تو تمہیں زندہ آگ میں جلوا دیتی۔ مگر میں نے ایک پنتھ دو کاج والا کام کیا ہے۔ تمہاری مدد سے میں اپنی دُنیا کے ایک دُشمن کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں، نجمہ کو بچانے کا بس اب صرف آخری موقع تھا۔ اگر میں زبردستی کرتا تو اس کے افسر مُجھے مفلوج کر

دیتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اس آخری موقع کو ہر گز ہاتھ سے نہ جانے دوں گا اور نجمہ کو ان مُوذیوں کے چنگل سے چھڑانے کی ایک زور دار کوشش ضرور کروں گا۔ نہ جانے نجمہ میرے دِل کا یہ راز کیسے جان گئی۔ کیوں کہ اس نے مُجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ مگر میں تمہارا یہ ارادہ ہر گز پورا نہ ہونے دوں گی۔"

"یہ کیا سوچ رہا ہے مَلکہ۔۔۔؟" ایک افسر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"یہ قیدی چاہتے ہیں کہ مُجھے زبردستی اٹھا کر لے جائیں۔۔۔ کیا تم ایسا ہونے دو گے؟"

"ہر گز نہیں، ہر گز نہیں۔۔۔" بونے افسر نے ایک ساتھ چلّائے اور خوفناک نظروں سے ہمیں گھورنے لگے۔

"میں اِن لوگوں کے خطرناک ارادوں کو محسوس کر رہی ہوں۔ افسرو، اس سے پہلے کہ یہ لوگ تمہیں کُچھ تکلیف پہنچائیں تم اپنی گیندیں مُجھے دے دو۔ میں قد میں اِن قیدیوں کے برابر ہوں اس لئے جیسے ہی انہوں نے کوئی غلَط حرکت کی، میں فوراً دس کی دس گیندیں ایک ساتھ اِن کی طرف پھینک دوں گی۔۔ لاؤ جلدی دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پہلے اپنا وار کر بیٹھیں۔"

"مَلکہ سچّی ہے۔ مَلِکہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بونوں نے ایک ساتھ چلا کر اپنی اپنی گیندیں نجمہ کو دے دیں۔

گیندیں اپنے قبضے میں کرنے کے بعد اچانک نجمہ نے اپنے جسم پر لپٹا ہوا وہ گاؤن ایک جھٹکے کے ساتھ کھینچ کر دور پھینک دیا۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو اس وقت وہ انہیں پتوں کے لباس میں ملبوس تھی جس میں غائب ہونے سے پہلے تھی، میں نے دیکھا کہ نجمہ کے چہرے پر سے غُصّے کے آثار اچانک ختم ہو گئے اور پھر اس نے بڑی ملائم لیکن گھبرائی ہوئی آواز

میں مُجھ سے کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں ابّا جی۔۔ خُدا کے لئے جلدی سے ان کمبختوں کو ختم کر دیجئے۔"

دونوں جہاں کی دولت بھی اگر مُجھے مل جاتی تو مُجھے اتنی خُوشی نہ ہوتی جتنی نجمہ کے اِن الفاظ کو سُن کر ہوئی اس سے کُچھ پوچھنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ جیک تو جلدی سے سوراخ کے دہانے پر رسّی باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی مدد سوامی نے نیچے گھوڑا بن کر کی تھی۔ اور ادھر میں نے امجد اور جان کے ساتھ ہی اپنا ریوالور نکال لیا۔ بو نے ابھی کُچھ سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہماری گولیوں نے انہیں کٹے ہوئے درختوں کی طرح زمین پر گرا دیا۔ گولیوں کی آواز زبردست گونج پیدا کرنے لگیں اس عرصے میں اختر دوڑ کر نجمہ سے لپٹ گیا۔

"ابّا جی جلدی سے اوپر چلیئے۔۔ دیر مت کیجئے۔" نجمہ نے اختر کو لپٹاتے

ہوئے کہا۔

اتنا کہہ کر نجمہ نے وہ دس گیندیں تیزی کے ساتھ دور پھینک دیں۔ زمین پر گرنے سے پہلے ہی وہ گیندیں پھٹ گئیں اور ان میں سے سُرخ دھواں نکل کر ہر طرف پھیلنے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ دھواں ہم لوگوں تک پہنچتا۔ ہم رسّی سے لٹکتے ہوئے اور جیک و سوامی کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔ اوپر پہنچ کر ہم نے جیک اور سوامی کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ اب ہم لوگ وہیں تھے جہاں سے پہلے امجد نے تختے توڑے تھے۔ اس منحوس جگہ پر پہنچتے ہی ہم لوگوں نے تیزی سے آگے ہی آگے بھاگنا شروع کر دیا۔ شاید ہم لوگ دس منٹ تک اسی طرح بھاگتے رہے اور جب یہ سُرنگ ختم ہو کر ایک چھوٹے سے ہال میں مل گئی تو ہم رُک گئے اس ہال میں ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہم نے پہلے یہ پانی پیا اور پھر زمین پر بیٹھ گئے۔ مشعل کی روشنی میں مجھے نجمہ کا چہرہ پیلا نظر آیا۔

میں نے بڑی محبّت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"نجمہ بیٹی۔۔۔! آخر یہ سب کیا تھا؟"

"ابّا جی پہلے تو میں اپنے اُن الفاظ کی معافی چاہتی ہوں جو میں نے آپ لوگوں کو کہے تھے۔ میں سچ کہتی ہوں کہ وہ الفاظ ادا کرنے کے لئے مجبور تھی۔"

"نہیں بیٹی۔۔ ہمیں کوئی شکوہ نہیں۔" جان نے محبّت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں سب کُچھ سمجھ گیا ہوں، تم نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا، مگر میں چاہتا ہوں کہ مختصر لفظوں میں تم یہ سب باتیں ہمیں بتاؤ۔"

"اُفّوہ۔۔۔ وہ بڑے خطرناک لوگ تھے۔" نجمہ نے کہنا شروع کیا۔

"جب ہم پہلی سُرنگ میں چل رہے تھے تو امجد صاحب میرے پیچھے تھے، ایک جگہ شاید ان کو چوٹ لگی اور وہ رُک گئے، میں مُڑ کر ان کی مدد کے لئے

جانا ہی چاہتی تھی کہ اچانک میں نیچے گر پڑی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں
میں پھُوس پر گری تھی۔ میں جلدی سے کھڑی ہو گئی اور تب میں نے دیکھا
کہ دس بونے وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے فوراً ایک گیند میری
طرف پھینکی۔ میں مفلوج ہو گئی۔ کُچھ دور پیدل چلنے کے بعد پچاس کے
قریب بونے ایک ڈولی لے کر آئے، مُجھے اس ڈولی میں لِٹا دیا گیا اور وہ
لوگ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ راستے میں ان لوگوں کا وزیرِاعظم
مُجھے مل گیا اور وہ بھی میرے ساتھ ہی ڈولی میں بیٹھ گیا۔ اس نے مُجھے بتایا
کہ میں بام بو درخت کی بیٹی ہوں اور اس مخلوق کی مَلِکہ۔ میں بہت پہلے اس
جگہ سے بھاگ گئی تھی اور آج دوبارہ وہاں آ گئی ہوں۔۔ میں سب کُچھ دیکھ
اور سُن رہی تھی مگر ہاتھ نہیں ہلا سکتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ جو لوگ مُجھے پکڑ کر
لے گئے تھے وہ اب میری تلاش میں نیچے کود پڑے ہیں، انہیں گرفتار کیا
جائے گا اور میں جو سزا اُن کے لئے تجویز کروں گی، وہی سزا انہیں دی

جائے گی۔"

"خوب! انہیں ہمارے نیچے کودنے کا بھی علم ہو گیا تھا۔" امجد نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔۔ خیر آگے سنئے۔ خُدا کی قدرت کہ اس نے اس موقع پر مُجھے ہمّت اور عقل عطا کی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں یہ ظاہر کروں کہ درحقیقت میں ان بونوں ہی کی مَلکہ ہوں اور جو وہ کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ جب آپ سب زومبو میں پُہنچے تو میں نے اتنے عرصے میں بہت سی ضروری معلومات مہیّا کر لی تھیں۔ میں آپ کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آئی۔ میرے اس سلوک سے جہاں آپ کو رنج ہوا وہاں بونوں کے وزیرِ اعظم کو یقین ہو گیا کہ میں ہی اصلی مَلکہ ہوں اور آپ لوگوں کی جانی دُشمن۔ میں نے آپ سب کو بُرا بھلا کہہ کر بونوں کے دِل میں جگہ پیدا کر لی۔ میں بھی موقع کی تلاش میں تھی مگر موقع نہ ملتا تھا۔ میں نے آپ کو یہ سزا دی کہ آپ جا کر

بونوں کے دُشمن سے لڑیں جو درحقیقت جیگا ہے۔ یہ سزا سب بونوں نے بڑی خُوشی سے سُنی۔ میری تجویز یہی تھی اور جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے میری یہ تجویز کامیاب رہی اور اب میں نے نہ صرف آپ کو اس خوفناک قوم سے نجات دلوادی ہے بلکہ خود بھی آپ کے سامنے ہوں۔"

مجھے نجمہ کی یہ باتیں اتنی پیاری معلوم ہوئیں کہ میں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اختر نے بھی جلدی سے اپنی بہن کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ نجمہ روتی جاتی تھی اور ہم سب سے اپنے الفاظ کی معافی مانگتی جاتی تھی۔ جب ہم نے اسے دلاسا دیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ آپس میں یہ مشورہ کرنے لگے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ راستے کی تھکن اتنی سوار تھی کہ ہماری نگاہیں بند ہوئی جاتی تھیں مگر ہم اس ڈر سے نہیں سوتے تھے کہ کہیں وہ بونی مخلوق ہمارا پیچھا نہ کر رہی ہو، جب کافی دیر اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہو گئی تو جان نے کہا۔

”میرے خیال میں اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔“

”جی ہاں، اسی طرح ایک جگہ بیٹھے رہنے سے تو کُچھ نہ ہو گا۔“ امجد نے رائے دی۔

سوامی اور جیک کا بھی یہی خیال تھا کہ آگے بڑھا جائے۔

سب کی رائے پر عمل کرتے ہوئے آخر میں کھڑا ہو گیا اور پھر ہال کو طے کر کے ہم لوگوں نے سامنے نظر آنے والی سُرنگ میں قدم رکھا۔ جان ایک بات نجمہ سے پوچھنی بھول گیا تھا اور وہ اب اس نے پوچھ لی۔ اس نے سوبیا کے ڈبّے کے بارے میں پوچھا تھا اور نجمہ نے یہ کہہ کر اسے اطمینان دِلا دیا تھا کہ وہ ابھی تک اسی کے پاس ہے۔ رہا آفاقی ہار تو وہ نجمہ کے گلے میں نظر آ ہی رہا تھا۔ یہ سُرنگ کُچھ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ جگہ جگہ اس میں نوکیلے پتھرّ دائیں اور بائیں طرف لگے ہوئے تھے۔ ہم لوگ ان پتھرّوں سے خود کو بچاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی

راستہ تنگ ہو جاتا اور کبھی کشادہ۔ کئی بار ہمارے سر مخروطی چٹّانوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہمارے سر ضرور زخمی ہو جاتے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں ہم جس غار نما سُرنگ میں چل رہے تھے وہ پہلے کی طرح زیادہ لمبی نہیں تھی کیونکہ جلد ہی ہم دوسری طرف نکل آئے۔ یہاں کا منظر بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ ویسی ہی مخروطی لٹکتی ہوئی چٹانیں لاتعداد تھیں۔ جگہ جگہ گڑھے تھے، اور تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گہری دراڑ بھی تھی جو اوپر سے کافی چوڑی تھی۔ گہرائی کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے تھے۔ ہاں یہ دیکھ سکتے تھے کہ اوپر سے دس گز کا فاصلہ اس دراڑ کا ضرور تھا۔ اگر کوئی بھولے سے اِس دراڑ میں گِر جاتا تو بس پھر اس کا خُدا حافظ۔ ہم نے ابھی اِس حصّے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک ایک سرسراہٹ بُلند ہوئی اور پھر یہ سرسراہٹ بڑھ کر شور بن گئی۔ دراڑ میں سے گرم ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا اور ہماری مشعل کو بُجھا گیا۔

مشعل کے بجھتے ہی ہمیں یوں لگا جیسے ہماری بینائی جاتی رہی ہو۔ چٹّانوں کی جگمگاہٹ اور پتھرّوں کی چمک سب یکایک جاتی رہی۔ شور لگاتار بڑھتا جا رہا تھا اور کُچھ ہی دیر بعد یہ شور اتنا بڑھ گیا کہ ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے لگے اور پھر اس کے ساتھ ہی کسی نے زور سے میرے سر پر کوئی نوکیلی چیز ماری۔ ایک خاص قسم کی بُو نے یکایک جان کو بتا دیا کہ یہ خونی چمگادڑوں کا ایک غول تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔ زمین پر بیٹھ جاؤ۔ اور جلدی سے مشعل روشن کرو۔" جان نے چلّا کر کہا۔

چمگادڑوں کا یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ ہم لوگ اپنے حواس کھو بیٹھے اور ایک دوسرے سے بُری طرح لپٹ گئے۔ میں ایک ہاتھ سے چمگادڑوں کو اپنے جسم سے پرے ہٹا رہا تھا اور دوسرے سے اپنے تھیلے میں سے ٹارچ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹارچ نکالنے کے بعد جیسے ہی میں نے اسے

جلایا تو دیکھا کہ ڈھائی فٹ لمبی چمگادڑوں کا ایک زبردست غول ہے۔ جو ہم پر چاروں طرف سے حملہ کر رہا ہے اور یہ چمگادڑیں اسی دراڑ میں سے نکل رہی ہیں جو ہم سے کچھ ہی فاصلہ پر تھی۔

چمگادڑیں ہمارے ننگے جسموں سے بوٹیاں نوچنے میں مصروف تھیں اور اِدھر جیک بغیر خُوف کئے مشعل جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم سے تین چمگادڑیں چمٹی ہوئی تھیں۔ مگر وہ وقت ضائع کئے بغیر مشعل جلا رہا تھا۔ اور آخر کار اس نے مشعل جلا لی۔ مشعل کے جلتے ہی چمگادڑیں بُری طرح چیخنے لگیں اور جیک سے دور دور ہٹ گئیں۔ میں نے چلّا کر کہا سب جلد سے جلد جیک کے چاروں طرف اکٹھے ہو جائیں۔ میرا کہنا مان کر سب نے یہی کیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ چمگادڑیں ہم پر حملہ کرنے سے کترانے لگیں اور اپنے پر پھیلا کر چیخنے لگیں۔ نجمہ اور اختر کے جسموں سے بھی اِن کم بخت چمگادڑوں نے بوٹیاں نوچ لیں تھیں اور

وہ دونوں بھی تکلیف کی وجہ سے کراہ رہے تھے۔ مشعل آگے بڑھا کر ہم نے چلنے کی کوشش کی تو چمگادڑوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اب تو ہم بڑے گھبرائے، چمگادڑیں ہمیں ایک ہی جگہ روکے رکھنا چاہتی تھیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے جلدی سے اپنے پستول کی ایک گولی سامنے والی چمگادڑ پر داغ دی۔ ایک خوفناک چیخ مار کر وہ چمگادڑ نیچے گر پڑی اور باقی اسی ہیبت ناک آواز میں چیخنے لگیں۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ چمگادڑوں کی چیخیں سُن کر اوپر چھت سے لٹکتی ہوئی ایک مخروطی چٹّان میں حرکت ہوئی اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چٹان نیچے سِرکنے لگی۔ جب میں نے اپنی ٹارچ کی روشنی اس طرف ڈالی تو خوف کے باعث میرا ہاتھ لرز گیا۔ ایک بہت بڑا اژدہا اِس ہال کی چھت میں نہ جانے کب سے لٹکا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں مُجھے وہ بھی ایک مخروطی چٹّان نظر آیا تھا۔ دھم سے وہ زمین پر گر پڑا اور اپنا خوفناک مُونہہ آگے بڑھا کر اس

نے ایک چمگادڑ کو دبوچ لیا اور پھر اُسے زندہ نگل گیا۔ یہ حالت دیکھ کر چمگادڑیں ہمیں تو بھول گئیں اور انھوں نے اژدہے پر حملہ کر دیا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر میں نے سب کو اشارہ کیا کہ وہ بغیر آواز کیے آہستہ آہستہ آگے کی طرف کھسکیں اور بائیں طرف جو سُرنگ نظر آرہی ہے اس میں پناہ لیں۔ کُچھ ہی دیر بعد ہم لوگ سُرنگ کے دھانے پر کھڑے ہو کر اژدہے اور چمگادڑوں کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ جیک نے ایک مخروطی چٹّان اوپر سے توڑ کر اِس دہانے پر رکھ دی تاکہ اگر چمگادڑیں ہمارا پیچھا کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں۔ دہانے کے ایک سوراخ سے میں نے دیکھا کہ چمگادڑوں نے اژدہے پر قابو پا لیا ہے اور اب اس کی تِکّا بوٹی کرنے میں مصروف ہیں۔

میں نے گھبرا کر اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھنے کو کہا۔ اور پھر ہم اس سُرنگ میں تیزی سے بھاگنے لگے۔ دوسری طرف نکلنے کے بعد ہم لوگ

اچنبھے میں رہ گئے اور سانس روک کر سامنے کے منظر کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ ہمارے بالکل سامنے ایک جھیل تھی جو کافی دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اس جھیل کے اوپر ایک قُدرتی چھت تھی۔ جس میں جگہ جگہ مخروطی چٹّانیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اس جھیل میں دور دور سے آنے والے چشموں کا پانی گر رہا تھا۔ مشعل کی روشنی نے پورے حصّے کو جگمگا دیا تھا۔ چٹّانوں سے ٹکرا کر یہ روشنی اتنی تیز ہو گئی تھی کہ ہم کو ہر چیز بالکل ویسی ہی نظر آ رہی تھی جیسی کہ دِن کی روشنی میں نظر آتی ہیں۔ یہ اتنا عجیب منظر تھا کہ کبھی کسی انسانی آنکھ نے نہ دیکھا ہو گا۔ جھیل کا پانی آہستہ آہستہ ہلکورے لے رہا تھا۔

جکاریوں والے گھنٹے کی آواز اب بہت تیز سُنائی دینے لگی تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب وہ ہم سے کُچھ زیادہ دور نہیں تھے۔ ہمیں اب تھکن بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ سورج تو نکل نہیں رہا تھا کہ ہم وقت کا اندازہ

کرتے۔ اس تھکن سے ہم سمجھ گئے کہ شاید باہر کی دُنیا میں رات ہو گئی ہے۔ ہماری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اس لئے ایک چھوٹے سے غار کے اندر جا کر ہم سو گئے۔ وقت کا چونکہ کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا اس لئے نہ جانے کب تک پڑے سوتے رہے۔ نیندیوں بھی اچھّی آئی کہ ہم اس جگہ اپنے زخموں پر مرہم لگا لیا تھا۔

جب میں جاگا تو میں نے دیکھا اختر اور نجمہ جھیل کے کنارے پڑے ہوئے گول گول پتھرّ چُننے میں مصروف تھے۔ مُجھے جاگتے دیکھ کر نجمہ دوڑ کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

"دیکھئے ابّا جی! یہ خوبصورت پتھرّ آفاقی ہار جیسے ہی ہیں نا۔"

میں نے اِن پتھرّوں کو نجمہ کے گلے میں پڑے ہوئے ہار سے ملا کر دیکھا تو مُجھے بڑا تعجّب ہوا۔ واقعی جس طرح کے دانے آفاقی ہار میں تھے۔ یہ پتھرّ ہو بہُو اِن جیسے تھے۔ جب میں نے اختر سے پوچھا کہ وہ اِن کا کیا کرے گا تو

اس نے جواب دیا۔

”میں اس کا ایک دوسرا آفاقی ہار بناؤں گا اور اپنے گلے میں پہنوں گا۔“

اختر یہ کہہ کر ہنسنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں بھی بُری طرح قہقہے لگانے لگا۔ یہ ہنسی بہت عرصے کے بعد میرے ہونٹوں پر آئی تھی۔ اِن قہقہوں کو سن کر باقی سب بھی جاگ گئے۔ سونے کے بعد چوں کہ ہم تازہ دم ہو چکے تھے اس لئے آپس میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟

انسان آگے کے بارے میں تو اس وقت سوچتا ہے جب کہ اس کے سامنے کوئی پروگرام ہوتا ہے۔ ہمارے پاس کیا پروگرام تھا؟ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہمیں آگے کرنا کیا ہے۔ اس وقت ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق باتیں کہیں۔ طریقے بتلائے کہ یوں کرو اور دوں کرو۔ لیکن جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں یہ باتیں بیکار تھیں۔ اس لئے ہم

لوگ پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ سب سے بڑا فکر تو ہمیں اب لباس کا تھا ہم تو مرد تھے ہمارا تو خیر کُچھ نہیں مگر نجمہ کی ہمیں بہت فکر تھی۔ اپنا جسم ڈھانکنے کے لئے اب وہ کسی پودے یا درخت کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کہ کہیں وہ درخت اُس کو پکڑ نہ لے۔ فی الحال جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے نجمہ دائیں سمت والے ایک غار کی طرف جانے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ شاید وہ کسی درخت یا پودے کی تلاش میں جا رہی ہے۔ اس لئے میں نے امجد سے کہا کہ وہ بھی ذرا اس کی حفاظت کے لئے ساتھ چلا جائے۔ اور اسے کسی درخت یا پودے کو چھونے نہ دے۔

کچھ ہی دیر بعد امجد نے مُجھے آ کر بتایا کہ نجمہ کو ایسا ایک درخت مل گیا ہے جس کی چھال کو وہ کپڑے کی جگہ استعمال کر سکتی ہے۔ اور چوں کہ اس وقت وہ اس چھال کو کوٹ کر سیدھا کرنے میں مصروف ہے۔ اس لئے

امجد واپس آ گیا ہے۔ مُجھے سُن کر اطمینان ہوا کہ چلو اس فکر سے تو نجات ملی۔ اس کے بعد میں نے بلند آواز سے پکار کر کہا "نجمہ! زیادہ وقت مت لگانا۔ جلد واپس آ جاؤ۔"

"بہت اچھّا ابّا جی۔۔ میں آ رہی ہوں۔۔" نجمہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک مُجھے اس کی چیخ سُنائی دی۔ میں نے پلٹ کر غار کی طرف دیکھا۔ غار میں سے نجمہ کے اسی طرف بھاگنے کی آواز آ رہی تھی۔ جیک اور سوامی نے شاید کسی خطرے کی بُو سونگھ لی تھی، اس لئے وہ اپنے لمبے چاقو نکال کر تیّار ہو گئے تھے۔

نجمہ کی دوسری چیخ سُنتے ہی میں بے قابو ہو گیا اور غار کی طرف دوڑا۔ مگر اس عرصے میں نجمہ غار سے باہر نکل آئی تھی۔ اس نے کافی چوڑی چھال کو اپنے جسم کے اوپری حصّہ پر لپیٹ لیا تھا۔ لیکن یہ وقت اس کے لباس کی تعریف کرنے کا نہیں تھا۔ میں تو تب یہ سوچ کر پریشان تھا کہ آخر وہ چیخی

کیوں تھی؟ نجمہ دوڑ کر مُجھ سے لپٹ گئی اور لرزتے ہوئے کہنے لگی۔

"ابّا جی وہ۔۔۔۔وہ۔۔ کوئی عجیب چیز ہے؟"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک مُجھے یوں لگا جیسے اس حصّے میں زلزلہ آ گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبردست چنگھاڑ بھی سُنائی دی۔ ایسی خوفناک آواز تھی کہ ہم لوگ گھبرا گئے ہم نے جلدی جلدی اپنا سامان اٹھایا اور بندوقیں سنبھال لیں۔ نجمہ ابھی تک کپکپا رہی تھی۔

"نجمہ۔۔۔! کیا چیز دیکھی ہے تم نے؟" میں نے غار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے تو صرف دو بڑی بڑی آنکھیں دیکھی تھیں ابّا جی۔ پتہ نہیں وہ کس کی آنکھیں ہیں۔ جب میں بھاگنے لگی تو وہ چیز میری طرف لپکی۔ دیکھئے دیکھئے وہ آ رہی ہے۔"

نجمہ کو جلدی سے اپنے پیچھے کر کے میں نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ ایک بڑی بد ہیئت شکل اس غار میں سے نمودار ہوئی ابھی میں نے اس کا صرف سر ہی دیکھا تھا۔ جب یہ سر باہر آگیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کوئی جانور ہے۔ مگر معمولی سا جانور نہیں بلکہ کافی بڑا جانور اس کا مُونہہ کھلا ہوا تھا اور اس مُونہہ میں لمبے لمبے دانتوں کی قطار مُجھے صاف نظر آرہی تھی۔ یہ دانت نوکیلے تھے اور ان سے باہر اس کی لمبی اور دو شاخی زبان نکل رہی تھی۔ یہ جانور زیادہ پھرُتیلا نہیں تھا بلکہ زمین پر دھب دھب کر کے چل رہا تھا اور اس کی چال بھی بہت سست تھی۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے گئے۔ پچھلے غار میں اس لئے داخل نہیں ہوئے کہ وہاں خونی چمگادڑوں کے آجانے کا خوف تھا۔ اب ہمارے دائیں طرف تو گہرے نیلے پانی کی جھیل تھی۔ بائیں طرف دیوار اور سامنے کی طرف وہ غار جس میں سے وہ جانور آہستہ آہستہ ہماری طرف آرہا تھا۔

جب وہ پوری طرح غار سے باہر آگیا تو میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بو بہو گِرگٹ سے ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ گِرگٹ تقریباً ایک فٹ لمبا ہوتا ہے اور یہ کوئی ساٹھ فٹ لمبا تھا۔ اسی لحاظ سے اس کی جسامت تھی۔ اس کا پیٹ اتنا بڑا تھا کہ ہم سب آسانی سے اس میں سما سکتے تھے۔ جب وہ اپنا منہ کھولتا تھا تو نچلے جبڑے سے اُوپر کے بڑے تک اتنا فاصلہ نظر آتا تھا کہ جیک اس میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ ایسے ہی اس کی دُم تھی۔ لمبی اور نوکیلی آنکھیں سُرخ اور لمبوتری تھیں۔ کھال کا رنگ سُرخ تھا اور اس پر گول گول سی کالی چٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ایک چنگھاڑ ماری اور اپنی دو گز لمبی دو شاخی زبان بار بار باہر نکالنے لگا۔ جان نے جب یہ منظر دیکھا تو چلّا کر بولا۔

"سب لوگ غار کے اندر جانے کی کوشش کریں۔"

"مگر جان صاحب اس طرف تو چمگادڑوں کا خطرہ ہے۔" امجد نے پوچھا۔

"امجد ٹھیک کہتے ہیں جناب۔" جیک نے کہا۔ "کیوں نہ ہم اس پر گولی چلا دیں؟"

"گولی اس پر شاید ہی کارگر ہو۔۔۔" جان نے شش و پنج کے عالم میں کہا۔

ابھی میں اس بات کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اس خوفناک جانور نے اپنا مُونہہ جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھا کر ہمیں پکڑنا چاہا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے جلدی سے سب کو پیچھے دھکیل دیا اور پھر اپنی رائفل سے ایک گولی اس کے جسم پر داغ دی۔ مگر مُجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ گولی کھا کر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور اپنا ایک پیر ہمیں کُچلنے کے لئے آگے بڑھانے لگا۔ میں نے اور جان نے اس بار پھر گولیاں چلائیں مگر ایسا لگتا تھا کہ گولیاں کھا کر اسے شاید اور طیش آگیا۔ اور اس بار اس نے اپنا مُونہہ آگے بڑھایا۔ نجمہ اور اختر نے زور کی چیخیں ماریں اور شاید ڈر کر تیزی سے اس غار کی طرف بھاگے جہاں سے نکل کر وہ خوفناک جانور آیا تھا، ان

دونوں نے اپنے بچاؤ کا یہی طریقہ مناسب سمجھا ہو گا۔ مگر جیسا کہ آپ دیکھیں گے اس سے اُلجھن اور بڑھ گئی۔ وہ قد آور گرگٹ کافی ہوشیار تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی دم غار کے دہانے پر رکھ دی اور یوں اندر جانے کا راستہ بند ہو گیا۔ اب حالت یہ تھی کہ اس کا مُونہہ ہماری طرف تھا، دم غار کے دہانے پر اور درمیان میں اختر و نجمہ۔ وہ دونوں گھبرا کر دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان کی سمجھ میں کُچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں؟

گرگٹ نے بہتر یہی سمجھا کہ ہمیں چھوڑ کر اختر اور نجمہ پر حملہ کر دے۔ اس لئے وہ آہستہ آہستہ دائیں طرف مڑنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر ہم نے پھر گولیاں چلائیں مگر سب بے سود۔ نجمہ خوف کی وجہ سے چلّا رہی تھی۔ گرگٹ خوفناک آوازیں نکالتا ہوا آہستہ آہستہ اس طرف مُڑ رہا تھا۔ اس کی دم اب جھیل کے پانی میں ڈوبنے لگی تھی اور کسی بھی لمحہ وہ اب نجمہ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ نجمہ کا نام میں نے یوں لیا ہے کہ بڑی بہن ہونے کی وجہ سے

وہ اختر کے سامنے آ گئی اور چاہتی تھی کہ اُسے گرگٹ کے حملے سے محفوظ رکھے۔ بہن کی محبّت اور پیار دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے پے در پے کئی گولیاں اس گرگٹ کی سخت کھال پر چلا دیں۔ مگر اس پر اثر کُچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے مڑتے مڑتے، سوامی، جیک اور امجد نے اپنے تیز اور لمبے چاقوؤں سے اس کے جسم کو چھید کر رکھ دیا۔ خون بھی نکلا مگر وہ ذرا بھی نہ ڈگمگایا۔

اب وہ نجمہ کے بالکل سامنے تھا اور تقریباً پانچ گز دور سے اسے گھور رہا تھا۔ نجمہ کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ خوف کی وجہ سے وہ لرز رہی تھی مگر اختر کو آگے نہ آنے دیتی تھی حالانکہ بے چارہ اختر اس کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

نجمہ کو کافی دیر تک گھورنے کے بعد، گرگٹ نے اپنی زبان دو تین مرتبہ باہر نکالی اور پھر اپنے جسم کو پیروں پر تول کر اپنا خوفناک مُونہہ جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھانا چاہتا ہی تھا کہ ایک زبردست للکار کے ساتھ امجد دوڑتا ہوا

اس کے مُونہہ کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے حیرت اور خوف کے ساتھ دیکھا کہ امجد دونوں ہاتھوں سے ایک سوکھے سے درخت کا مضبوط سا تنا گھسیٹ رہا تھا۔ یہ تنا کافی بھاری تھا لیکن وہ جذبہ ہی ایسا تھا جس سے مجبور ہو کر امجد نے اتنا وزنی تنا زمین سے اکھاڑ لیا تھا اور پھر اسے گھسیٹتا ہوا نجمہ کے سامنے پہنچ گیا تھا۔۔ ہم نے اپنے چاقوؤں کے وار اور تیزی سے کرنے شروع کر دئیے۔ اپنے شکار کو سامنے کھڑا دیکھ کر گرگٹ نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا مُونہہ آگے بڑھایا مگر امجد نے جلدی سے وہ تنا اس کے آگے کر دیا۔ گرگٹ نے گھبرا کر اپنا مُونہہ پیچھے کر لیا۔ ہم لوگ چاقوؤں سے برابر اپنا کام کر رہے تھے اور جان بھی گولیاں چلا رہا تھا۔ لیکن ہم بڑی مشکل سے دوسری طرف کا حال دیکھ سکتے تھے۔ گرگٹ کا جسم ایک دیوار بن کر ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ ہم نے اس کی پرواہ نہ کی کہ نجمہ اور امجد پر کیا بیت رہی یہ، ہم تو بس چاقوؤں سے لگاتار وار پر وار کئے جا رہے تھے۔

گِرگٹ نے ایک زبردست چنگھاڑ کے ساتھ امجد پر حملہ کیا اور اس بار اس نے امجد کو درخت کے تنے سمیت اپنے مُونہہ میں اُٹھا لیا۔

نجمہ کی چیخوں سے وہ مقام گونج اٹھا۔ ہم لوگ دوڑ کر آگے بڑھے تاکہ دیکھیں کیا مُصیبت پیش آئی ہے۔۔۔ مُجھے یقین تھا کہ گرگٹ امجد کے جسم کو چبا رہا ہو گا، نجمہ شاید اسی لئے چیخ رہی ہے، مگر آگے بڑھ کر میں نے جو کچھ دیکھا وہ مُجھے حیران کر دینے کے لئے کافی تھا۔

میں نے دیکھا کہ امجد درخت کے تنے سے چمٹا ہوا ہے اور زور لگا کر وہ تنا اس نے گرگٹ کے مُونہہ میں بالکل سیدھا کھڑا کر دیا ہے تنے کی لمبائی امجد کے قد سے شاید دو فٹ زیادہ ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک محفوظ تھا۔ درخت کا تنا ایک ستون کی طرح گِرگٹ کے اوپر کے جبڑے سے نچلے جبڑے تک کھڑا ہوا تھا۔ امجد اسے اپنے ہاتھوں سے اور سیدھا کر رہا تھا۔ چونکہ اب گِرگٹ کا مُونہہ بند نہ ہو سکتا تھا اس لئے میں نے دیکھا کہ امجد بار بار

گِرگٹ کے مُونہہ کے لعاب سے پھسل جاتا تھا۔ وہ پھر بمشکل کھڑا ہوتا اور تنے کو مضبوطی سے اس کے دانتوں کے درمیان جمانے کی کوشش کرتا۔ گِرگٹ نے جب یہ دیکھا کہ اس کا مُونہہ بند نہیں ہو سکتا تو تکلیف کی وجہ سے وہ اپنے پاؤں پٹخنے لگا۔ یہ دیکھ کر نجمہ بری طرح چلّانے لگی۔

"نیچے اتر جائیے۔۔۔ نیچے کود جائیے۔"

نجمہ کا کہنا مان کر امجد نے جلدی سے نیچے چھلانگ لگا دی اور پھر اختر و نجمہ کو تقریباً گھسیٹتا ہوا ہماری طرف لے آیا۔ ہم نے گِرگٹ کو بے بس دیکھ کر اس پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اس مرتبہ ہم نے اس کے دماغ اور پیٹ کو نشانہ بنایا۔ ہم گولیاں چلاتے جاتے تھے اور سامنے والے غار کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ گولیاں کھا کر گِرگٹ اور سُست ہونے لگا۔ تکلیف کی وجہ سے وہ بِلبلا رہا تھا اور بار بار اپنی دم جھیل کے پانی پر مارتا تھا جس کے باعث جھیل کا پانی کافی اوپر تک اچھل جاتا تھا۔ غار میں آنے

کے بعد ہم نے لگاتار کئی گولیاں چلا کر گِرگٹ کو ختم کر دیا۔ اس نے اپنی دم پٹخنی بند کر دی اور اپنا سر زمین پر دے مارا۔ اس کا یہ حشر دیکھ کر ہم لوگ غار کے اندر تیزی سے بھاگنے لگے۔

بھاگتے جاتے تھے اور پیچھے مڑ کر دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں وہ خوفناک گِرگٹ ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا، مگر خُدا کا شکر تھا کہ وہ کم بخت وہیں جھیل کے کنارے پڑا اپنا سر پیٹ رہا تھا اور غار نما سُرنگ میں سے صرف اس کی آواز آ رہی تھی۔

اس سُرنگ سے نکل کر ہم جس جگہ پُہنچے وہ سب سے عجیب تھی۔ یوں سمجھیئے کہ پاتال کا ہر عجوبہ اور ہر چیز یہاں موجود تھی۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس مقام کی چھت سے جو مخروطی چٹّانیں لٹکی ہوئی تھیں وہ ایک تو بہت لمبی تھیں اور دوسرے نیچے سے سوئے کی طرح باریک۔ پوری جگہ عجیب عجیب رنگوں سے جگمگا رہی تھی۔ کہیں سُرخ رنگ تھا کہیں پیلا اور

کہیں فیروزی۔ جان نے مُجھے بعد میں بتایا کہ یہ رنگ مختلف دھاتوں کے ہیں۔ ایسی دھاتوں اور ایسے ہیروں کے جو خود بخود روشنی دیتے ہیں۔ ہال کے فرش پر نرالی قسم کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ان میں وہ خونی درخت بھی تھا جس سے ہمیں بہت پہلے واسطہ پڑ چکا تھا اس لئے ہم اس درخت سے بچ بچ کر چل رہے تھے۔ کُچھ ہی فاصلے پر ہمیں ایک چھوٹی سی آبشار نظر آئی جس کے کنارے پر مخمل جیسی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ اس گھاس پر جلدی بیٹھ گئے اور اپنی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جکاریوں والے گھنٹے کی آواز یہاں بہت تیز آ رہی تھی۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ جکاری اب ہم سے کُچھ زیادہ دور نہیں ہیں۔

سوامی نے سب سے پہلے مولی کے مزے والی اس جڑ کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ جو ہم خونی درخت والے ہال میں کھا چکے تھے۔ اس عرصے میں ہم سب آپس میں باتیں کرنے لگے۔ باتیں کرتے جاتے تھے اور

ایک دوسرے کی مرہم پٹی بھی کرتے جاتے تھے۔ کیوں کہ اب تک اس کا پورا موقع نہیں ملا تھا کہ زخموں کو دھوئیں اور ان پر دوائیں لگائیں۔ نجمہ اور اختر کے جسموں پر مرہم لگاتے ہوئے میں نے کہا۔

"افّوہ! کتنا خوفناک گِرگٹ تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی معجزہ ہی تھا کہ ہم اس کے چنگل سے بچ گئے۔"

"یقیناً ہمیں اسے معجزہ ہی سمجھنا چاہیئے۔" جان نے کہنا شروع کیا۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ کتنی مُصیبت کا وقت تھا۔ جس سُرنگ سے نکل کر ہم اس جھیل کے قریب آئے تھے اس کا سوراخ بے شک چھوٹا تھا، اور اگر ہم چاہتے تو واپس اسی سُرنگ میں گھُس کر گِرگٹ کے حملے سے بچ سکتے تھے۔ مگر ایک تو کسی کو اس کا ہوش ہی نہ تھا، دوسرے سُرنگ کے دوسری طرف خونی چمگادڑیں ہمارے انتظار میں پر پھڑپھڑا رہی تھیں۔ ایک طرف کنواں تھا تو دوسری طرف کھائی اور پھر وہ وقت تو سب سے

خطرناک تھا جب کہ گرگٹ نے سامنے والے غار کے مُونہہ پر اپنی دم رکھ دی تھی اور نجمہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن میں اس موقع پر امجد کی بہادری کی تعریف جتنی بھی کروں کم ہے۔ اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر درخت کا وہ تنا گرگٹ کے حلق میں خوب پھنسایا۔"

"یقیناً یہ کام غیر معمولی بہادری کا تھا۔" جیک نے بھی امجد کی تعریف کی۔

"بہادری کی تعریف تو اس وقت اچھّی لگتی جب کہ ہم لوگ اس کالی دُنیا میں نہ ہوتے جہاں قدم قدم پر موت اپنا بھیانک مُونہہ کھولے ہماری راہ دیکھ رہی ہے۔" امجد نے اتنا کہہ کر نجمہ کو دیکھا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ "اس میں بہادری کی کوئی بات نہیں، نہ جانے اچانک کیوں میں نے ایسا کیا تھا؟"

سوامی جڑیں لے آیا تھا۔ ہم زخم صاف کر کے ان پر پٹّیاں باندھ چکے تھے۔ اس لئے ہم تو ہم نے جڑیں کھائیں اور پھر سوچنے لگے کہ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہو؟

نہ جانے کیا سوچ کر جان نے سوبیا کا ڈبّہ نکالا۔ کُچھ دیر تک اسے آبشار کے پانی میں ڈبوئے رکھا اور پھر اس کی تھوڑی سی مقدار ٹین کے ایک چھوٹے سے ڈبّے میں نکال کر نجمہ کو دے دی۔ اور کہا۔ "لو بیٹی، احتیاطاً تم بھی تھوڑی سی سوبیا اپنے پاس رکھ لو۔ ہو سکتا ہے کہ اِس کی ضرورت پڑ جائے اور ہو سکتا ہے کہ نہ بھی پڑے۔ پھر بھی اس کا تمہارے پاس ہونا بہت ضروری ہے۔"

جان نے جب سوبیا کو ڈبیا میں اُلٹ رہا تھا تو میں نے پہلی بار اس عجیب و غریب دھات کو قریب سے دیکھا۔ وہ بالکل پارے جیسی تھی۔ پارے کا رنگ چاندی جیسا ہوتا ہے مگر سوبیا کا گہرا سُرخ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سیندور کو پارہ بنا دیا ہے۔ کتنی عجیب دھات تھی یہ۔ ہم اسے ہاتھوں میں لئے بیٹھے تھے اور ہمارا کُچھ نہ بگڑا تھا، لیکن یہی دھات اگر جکاریوں یا زوکوں کے قریب رکھ دی جاتی تو وہ پکے آم کی طرح زمین پر ٹپ ٹپ گر

پڑتے۔

نجمہ نے اِس ڈبّے کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور اداسی سے ہر ایک کی صورت دیکھنے لگی۔ خُدا کی قدرت دیکھئے کہ ہم سب کی زندگیوں کو بچانے والی ہستی اِس کالی دُنیا میں صرف نجمہ ہی تھی۔ اسی کی بدولت ہم بعد میں پیش آنے والے خطروں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسی کے پاس آفاقی ہار تھا اور اس ہار کی کرامتوں کے بارے میں آپ جانتے ہی ہیں۔ ہم مجبور تھے کہ نجمہ کے سہارے جئیں۔ ایک کمزور سی نوجوان لڑکی اب ہماری زندگیوں کی محافظ بنی ہوئی تھی۔ ہمیں ایک ہی مقام پر ٹِک کر بیٹھنا تو تھا نہیں کہ وہیں ہری گھاس پر بیٹھے رہتے۔ گھنٹے کی آواز اب اتنی تیز آنے لگی تھی کہ اُسے سُن سُن کر ہمیں اب اتنی وحشت ہونے لگی تھی کہ ہم چاہتے تھے جو کُچھ بھی ہونا ہے وہ فوراً ہو جائے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب تیزی سے ہمیں جکاریوں کی طرف چلنا چاہیئے، یہ طے کر کے ہم اٹھے اور آگے چلنے

کے لئے تیّار ہو گئے۔

جیگا نے کالی دُنیا میں آنے کے بعد جان کو یہ دھمکی دی تھی کہ اب اسے نجمہ کی حفاظت پہلے سے بھی زیادہ کرنی ہوگی۔ دیکھا جائے تو یہ دھمکی غلط نہ تھی۔ خونی درخت، خونخوار چمگادڑ اور اب اس گِرگٹ سے نمٹنے کے بعد اِس دھمکی کی اہمیّت کا احساس ہوتا تھا۔ ہم نے آگے بڑھتے وقت نجمہ اور اختر کو اپنے بیچ میں لے لیا تاکہ اگر نجمہ پر کوئی آفت آنے والی ہو تو وہ پہلے ہم پر آئے۔ راستہ پھر دشوار ہونے لگا تھا۔ پاتال کی چھت سے لٹکی ہوئی نوکیلی اور گاؤدمی چٹّانیں اب زیادہ ملنے لگی تھیں۔ کبھی راستے میں بڑی سی چٹان آجاتی تو کبھی گہرا سا گڑھا۔ ہم لوگ پھُونک پھُونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ راستہ چوں کہ خراب ہوتا جا رہا تھا اِس لئے ہم نے اب بقیہ مشعلیں بھی جلالی تھیں۔ کیونکہ ہمیں یہ معلوم ہی تھا کہ اس جگہ سے زندہ واپس جانا مُشکل ہے۔ جب ہم ہی نہ ہوں گے تو بعد میں اِن مشعلوں کو کون جلائے

گا۔

مشعلوں کی روشنی ہر طرف پھیل گئی تو میں نے دیکھا کہ قوسِ قزح کے دِل کش رنگ چاروں طرف بکھر گئے۔ یہ اتنا حسین منظر تھا کہ ایک لمحے کے لئے تو ہم اپنی اس وقت کی تکلیفیں اور مُصیبتیں بھول کر اس میں محو ہو گئے۔ آبشار کے گِرنے کا مدھم شور گھنٹے کی آواز کے ساتھ مل کر ایک عجیب سماں پیش کر رہا تھا۔ چھت سے لٹکتی ہوئی چٹّانیں یا تو سنگِ مرمر کی تھیں، یا شور کی تھیں یا پھر نمک کی۔ کیونکہ مختلف رنگ کی روشنیاں ان چٹّانوں میں سے گزر کر آرہی تھیں۔ اور یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے رنگ برنگے فانوس چھت میں لٹکا دیئے ہوں۔ یہ منظر اتنا دِل کش تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔

اُونچے اُونچے ٹیلوں اور ناہموار راستوں کو طے کرنے کے بعد ہم لوگ ایک تنگ راستے پر سے گزرنے لگے۔ یہ راستہ بھی پُل جیسا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ

تنگ ہونے کے باوجود یہ سپاٹ اور ہموار تھا ہاں البتّہ اس کے دونوں
طرف گہرے کھڈ اور کھائیاں تھیں۔

اس راستے کو طے کرنے میں ہمیں کوئی دقّت پیش نہ آئی۔ گھنٹے کی آواز
اب بہت قریب معلوم ہوتی تھی۔ اس کالی دُنیا کے اوپر جب ہم نے پہلے
پہل گھنٹے کی آواز سُنی تھی تو ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔
مگر یہاں نہ جانے کیا بات تھی کہ گھنٹے کی آواز اتنی تیز نہیں نکل رہی تھی
اور اس آواز میں اب ایک ترنّم تھا اور یہ کانوں کو بھلی لگ رہی تھی۔ ہم
اس آواز میں کھو کر آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ جب یہ راستہ ختم ہو گیا تو
ہم ایک تنگ سی گھاٹی کے قریب آ گئے۔ دو طرف دو اُونچی چٹّانیں تھیں
اور ان کے بیچ میں تقریباً دس فٹ چوڑی جگہ تھی۔ یوں سمجھئے کہ جیگا کے
علاقے میں جانے کا یہ ایک دروازہ تھا۔ اور جب ہم اس دروازے کے
قریب پُہنچے تو ہمارے دِل دھڑک رہے تھے۔ بدن پسینے میں ڈوب گئے

تھے۔ اور اندر ہی اندر کوئی ہم سے کہہ رہا تھا کہ بس اب ہماری زندگی ختم ہونے والی ہے اور یہ دروازہ دراصل موت کا دروازہ ہے۔

جیسے ہی ہماری پارٹی کے آخری آدمی نے پل کو پار کیا اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا اور وہ پل روئی کے گالوں کی طرح اُڑ گیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے گہرے کھڈوں میں جا کر گرنے لگے۔ ہمارے دِلوں میں اگر کوئی اُمّید اپنی زندگی کی باقی تھی تو وہ بھی اب ختم ہو گئی۔ پیچھے جانے کا راستہ برباد ہو چکا تھا اور اب ہمیں گھاٹی سے گزرنا ضروری تھا۔ نجمہ اور اختر کو اپنے بیچ میں لئے ہوئے ہم لوگ چوکنّے ہو کر گھاٹی سے گزرنے لگے جب یہ راستہ ختم ہو گیا تو ہمیں سامنے کا منظر دکھائی دیا۔

حیرت اور خوف کی وجہ سے گھبرا کر میں پیچھے ہٹ گیا۔ کسی انسان نے ایسا منظر شاید کبھی نہ دیکھا ہو گا، ہم سب آنکھیں پھاڑے سامنے دیکھ رہے تھے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ سامنے کیا تھا؟ بس ایک نرالی دُنیا تھی۔

سائنس کا کرشمہ تھا، اور انسان کو چونکا دینے والے آلات تھے، جہاں تک نظر کام کرتی تھی مُجھے ایک صاف اور ہموار میدان نظر آتا تھا۔ اس میدان میں جگہ جگہ عجیب سی کلیں اور مشینیں لگی ہوئی تھیں اور ان مشینوں کے پاس لاتعداد جکاری ادب کے ساتھ کسی کے حُکم کے منتظر کھڑے تھے!

یہ مشینیں ایسی عجیب و غریب تھیں کہ جان بھی انہیں حیرت سے دیکھنے لگا اور اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ یہ مشینیں کیسی ہیں؟ یہ ایک نِرالی قسم کی لمبی چوڑی لیبارٹری دِکھائی دیتی تھی۔ جو ایک بہت بڑے ہال میں بنائی گئی تھی۔ اس حال کی چھت سے ویسی ہی لمبی اور مخروطی چٹّانیں لٹکی ہوئی تھیں اور ان میں روشنی ہو رہی تھی۔

اس روشنی سے پورا ہال جگمگا رہا تھا اور دائیں طرف ایک خوب صورت اور بڑی آبشار گر رہی تھی اور اس آبشار کے پانی کے نیچے مختلف سائزوں کی چکیاں لگی ہوئی تھیں اور ان چکیوں کے چلنے سے گڑگڑاہٹ پیدا ہو رہی

تھی۔ گھنٹے کی آواز اب بھی آ رہی تھی مگر پہلے کے مقابلے میں کافی مدھم تھی۔ ہماری ہمّت نہ ہوتی تھی کہ ہم آگے بڑھیں۔ بس جیسے بے خودی کے عالم میں ہم یہ عجائبات دیکھ رہے تھے۔ سامنے لگی ہوئی مشینوں میں جو آلات لگے ہوئے تھے وہ پلاسٹک جیسے شیشے کے بنے ہوئے تھے اور کُچھ شیشے جیسی نالیوں میں سُرخ رنگ کی گاڑھی گاڑھی کوئی چیز ادھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھی۔ میرے اپنے خیال میں یہ یقیناً سوبیا دھات تھی جسے جیگا عمل کیمیائی سے گزار کر نہ جانے کس کام میں لینا چاہتا تھا؟

سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جکاری ہمیں چُپ چاپ کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے، حالانکہ یہ وہی جکاری تھے جو ہمارے خون کے پیاسے تھے اور جن کی بہت بڑی تعداد کو ہم نے سوبیا دھات کی بدولت ختم کر دیا تھا۔ جکاریوں سے کُچھ دور کے فاصلے پر زوک کھڑے ہوئے تھے اور وہ بھی ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہماری آمد نے انہیں کُچھ

زیادہ متاثر نہ کیا ہو۔ زوک اور جکاریوں نے ایک خاص قسم کا باریک
پلاسٹک جیسا لباس پہنا ہوا تھا۔ میرے خیال میں اسی لباس کی بدولت وہ
سوبیا کی زہریلی کرنوں سے محفوظ تھے۔ جب ہم نے دیکھا کہ زوکوں اور
جکاریوں سے کوئی ہم سے کُچھ نہیں کہتا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے آگے قدم
بڑھایا۔

بڑی عجیب جگہ تھی بڑے عجیب راستے تھے۔ ہم ہر چیز کو حیرت اور خوف
سے دیکھتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس مقام پر
مشینوں کا جیسے جال بِچھا ہوا تھا۔ بہت سی مشینیں تو خود بخود کام کر رہی
تھیں اور ان کے پاس کوئی جکاری یا زوک نہیں کھڑا تھا۔ اس جگہ بھی جیسے
سُرنگوں کا جال بِچھا ہوا تھا اور اِن سُرنگوں کے اندر شاید لوہے کی ایک
چھوٹی سی لائن بالکل ریل کی پٹڑی جیسی بچھی ہوئی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکا
کہ یہ پٹڑی کس مقصد کے لئے ہے؟

غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایسی پٹریاں اس جگہ ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ ایک مشین کو دیکھتے دیکھتے جیسے ہی میں نے اپنی بائیں طرف نظر ڈالی تو دہشت کی ایک لمبی چیخ میرے مُونہہ سے نکل گئی۔۔۔ اس مشین کے پاس دو آدم خور کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے ہمیں دیکھ کر اس طرح مُونہہ پھیر لیا جیسے ان کی نظروں میں ہماری کوئی اہمیّت ہی نہ ہو۔ کُچھ ہی فاصلے پر مُجھے آدم خوروں کی ایک دوسری ٹولی اور دِکھائی دی۔ یہ سب زمین کے اندر سے کوئی چیز نکال نکال کر لا رہے تھے۔

"تم کُچھ سمجھے فیروز۔۔۔" جان نے آہستہ سے کہا۔ "یہ آدم خور زمین کے سینے میں سے سوبیا نکال کر لانے پر مامور ہیں۔ سوبیا کو انسانوں کے علاوہ اور کوئی ہاتھ ہی نہیں لگا سکتا۔ اس لئے جیگا نے اِن آدم خوروں کو اس کام پر لگایا ہے کہ وہ کنویں کے اندر سے سوبیا نکال کر لائیں۔ اسے بوائلر میں ڈالیں اور پھر باقی کام مشینوں کے ذریعے ہوتا رہے۔ سوبیا جب ایک

خاص قسم کے شیشے کے مرتبان اور نلکیوں میں سے گزرے تو جکاریوں اور زوکوں کو نقصان نہ پہنچائے۔ جیگا کو بھلا آدم خوروں سے اچھّا آدمی اور کون مل سکتا تھا۔ اس نے نہ جانے کس طرح ان درندوں کو رام کر لیا ہے؟"

"لیکن جکاری ہم پر حملہ کیوں نہیں کرتے؟" امجد نے پوچھا۔

"وہ سب جیگا کے غُلام ہیں اور اس کے حُکم کے بغیر یہاں پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔"

"آپ تو یہ بات اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے آپ ہی جیگا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں جیگا کے اِن آلات اور طریقوں سے بہت مرعوب ہوا ہوں فیروز۔ میں زہرہ کے اس عظیم سائنس داں کو سلام کرتا ہوں۔۔ کاش وہ کسی

طرح ہم سے ملاقات کرے۔"

ابھی اتنی ہی باتیں ہوئی تھیں کہ اچانک ہمیں اپنے سر پر کسی کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دی۔ میں یہ سوچ کر نیچے جھُک گیا کہ کہیں یہ خونی چمگادڑیں نہ ہوں۔ مگر جیسے ہی میں نے اوپر دیکھا تو میں حیرت زدہ رہ گیا ایک لوہے کا پرندہ اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ یہ پرندہ ایک قسم کی مشین تھی اوراس کی شکل ہماری دُنیا کے کسی بھی پرندے سے نہیں ملتی تھی۔ یہ پرندہ ایک چھوٹی سی چٹّان پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی چونچ کھلی اور پھر یکایک ہمیں ایک آواز سُنائی دی۔

"کالی دُنیا میں آنے والے میرے معزّز مہمانوں کو میرا سلام پہنچے۔۔ مسٹر جان، آپ کی خواہش جلد ہی پوری ہو گی اور آپ مُجھ سے ملاقات کریں گے۔ آپ حیرت میں نہ پڑیں یہ پرندہ میری اپنی ایجاد ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی دھات کا بنا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دو لینس لگے ہوئے ہیں

جو آپ کی تصویر مُجھ تک پہنچا رہے ہیں اور اس کے گلے میں ایک اسپیکر لگا ہوا ہے جو میری آواز کے ساتھ ساتھ آپ کی آواز بھی مُجھ تک پہنچا رہا ہے۔۔۔ میں بھی آپ کی قدر کرتا ہوں مسٹر جان کہ آپ نے مُجھے اچھّے لفظوں سے یاد کیا۔ مُجھے آپ جیسے مخلص دوستوں سے ٹکّر لینا کُچھ اچھّا بھی نہیں لگتا۔ مگر کیا کروں اپنے مشن سے مجبور ہوں۔"

"تمہارا مشن کیا ہے؟" میں نے ہمّت کر کے دریافت کیا۔

"میرا مشن ہے کہ اس جزیرے کی سوبیا پر مکمل قبضہ کر لوں اور جیسا کہ مسٹر فیروز آپ دیکھ ہی رہے ہیں میں اس میں کامیاب بھی ہو گیا ہوں۔ اس کے بعد، معاف کیجئے گا کہ میں آپ کی دُنیا کو تباہ کرنا چاہتا ہوں اور یہ میں اچھّی طرح جانتا ہوں کہ کوئی مُجھے اس کام سے نہیں روک سکتا۔"

"خیر یہ تو وقت بتائے گا، جس طرح تمہیں اپنا مشن پیارا ہے اسی طرح ہمیں اپنی دُنیا پیاری ہے۔۔ ہم اپنی دنیا کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔"

میں نے بے خوفی سے کہا۔

"تمہاری ہمّت کی داد دینی پڑتی ہے۔ تم اور تمہارے ساتھی کافی بہادر ہیں جو مختلف آفتوں سے گزر کر یہاں تک پہنچ گئے۔ یہاں تک ابھی کسی انسان کا گزر نہیں ہوا تھا۔" جیگا نے ہنس کر جواب دیا۔ "مگر خیر مُجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اب تم یہ نہ بھولو کہ تم میرے قیدی ہو اور میرے حُکم کے بغیر کُچھ نہیں کر سکتے۔ میں تم لوگوں کی بہادری کو اس وقت سے جانتا ہوں جب کہ تم اپنے اسٹیمر میں بیٹھ کر اس سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ مگر یہ بہادری میری اس دُنیا میں تمہارے کام نہیں آئے گی۔"

"غرور ہمیشہ انسان کو لے ڈوبتا ہے۔" جان نے کہا۔

"لیکن میں تو انسان نہیں ہوں۔" جیگا نے جواب دیا۔

"اچھّا اتنا بتا دو کہ تمہارے کہنے کے مطابق جیگا ہم میں سے کون ہو سکتا

ہے۔" میں نے بے صبری سے کہا۔

"یہ بات ظاہر ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے دوست۔۔۔ صبر کرو صبر۔۔" جیگا نے کہا۔ "اگر میں نے بتا دیا تو تم آپس میں لڑنے لگو گے۔ جیگا کے بارے میں تمہیں معلوم ہی ہے کہ ایک وقت میں دو جگہ موجود ہو سکتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے جیگا تم میں موجود ہو اور اس کی آواز تمہیں اس پرندے کے مُونہہ سے آ رہی ہو۔ جیگا ہمیشہ سے تمہاری ہی پارٹی کا ایک ممبر رہا ہے۔ اس بات میں کسی طرح کا شُبہ نہیں ہے۔۔۔ اچھّا اب میں ایک کام آپ سے اور چاہوں گا مسٹر جان۔۔۔ میں اپنے ایک آدم خور کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں، آپ براہ کرم اپنے گلے میں لٹکا ہوا سو بیا کا ڈبّہ اور نجمہ کے گلے کا آفاقی ہار دے دیں۔ جب تک یہ دو چیزیں آپ کے پاس ہیں، مُجھے افسوس ہے کہ میری زندگی کو خطرہ ہے۔ خود کو بچانے کی خاطر مُجھے آپ سے یہ دونوں چیزیں لینی ہی ہوں گی۔"

”نہیں نہیں۔۔۔میں اپنا ہار کسی قیمت پر نہیں دوں گی۔۔۔“ نجمہ نے چلّا کر کہا۔

”دے دو نجمہ، ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، کسی نہ کسی وقت یہ تمہیں یہ ہار اتارنا تو پڑے گا ہی اس لئے بہتر ہے کہ ابھی اتار دو۔۔“ جیگا نے نرمی سے کہا۔

”نہیں تم مُجھے بہکا کر یہ ہار لینا چاہتے ہو۔ مُجھے یہ ہار پسند ہے بھلا ایک معمولی سا ہار تمہاری جان کو کس طرح ختم کر سکتا ہے۔ تم مُجھے دھوکا دے رہے ہو۔“ نجمہ نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

پرندے کے مُنہ سے جیگا کے ہنسنے کی آواز بہت دیر تک آتی رہی۔ اس کے بعد اس نے کہا۔

”تُم بہت عقلمند ہو نجمہ۔ مُجھ سے میری ہی موت کا راز دریافت کرنا چاہتی

ہو۔ مگر خیر کوئی حرج نہیں۔ میں تم سب کی بے بسی سے اچھّی طرح واقف ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ تم لوگ میرا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس لئے سنو۔۔۔ غور سے سنو۔۔ شاگو کا بھیجا ہوا آفاقی ہار درحقیقت میرے اور میری طاقتوں کے لئے موت کا پیغام ہے۔ زہرہ کی مٹّی کے جس مادے سے میرا جسم بنا ہے۔ آفاقی ہار کے دانے اُس مادے کو مٹا دینے والی مٹّی سے بنے ہیں۔ یہ دانے میری زندگی کو ایک لمحے میں ختم کر سکتے ہیں، لیکن آفاقی ہار کا کیا میں کُچھ نہیں کر سکتا؟ شاگو نے جان کو امریکا سے چلتے وقت جو سوبیا کا ڈبّہ دیا تھا وہ دراصل اِسی مقصد کے لئے ہے۔ آفاقی ہار کو اگر میرے سامنے نکال کر سوبیا میں ڈال دیا جائے تو میں اور میری تمام طاقتیں فوراً دم توڑ دیں گی۔ یہ سب نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن میری بھولی لڑکی میں یہ سب کُچھ ہونے ہی کب دوں گا۔ تم لوگوں کو اپنی حدود میں آسانی سے لے آنے کا میرا مقصد ہی یہی ہے کہ سوبیا اور آفاقی

ہار حاصل کرلوں۔۔ اس لئے اب تم خاموشی سے ہار اُتار دو۔۔۔"

"نہیں میں یہ ہار نہیں دوں گی۔" نجمہ نے چلّانا شروع کردیا۔

میں نے سامنے دیکھا تو ایک آدم خور پرندے کے پاس آکر مؤدب کھڑا ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سوبیا کا ڈبّہ اور آفاقی ہار لینے کے لئے آیا ہے، اس لئے میں نے گھبرا کر نجمہ سے کہا۔

"نجمہ بیٹی! ہمیں افسوس ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں۔ تم یہ ہار دے دو۔"

"نہیں۔۔ خبردار نجمہ ہار مت دینا۔" امجد نے چلّا کر کہا۔ "صرف اسی کے ذریعے ہم جیگا کو ختم کرسکتے ہیں۔"

"میں ہار نہیں دوں گی ابّا جی۔۔۔ میں ہار نہیں دوں گی۔" نجمہ نے ہار کو دونوں ہاتھوں سے پکڑلیا۔

کافی دیر تک یہی ہوتا رہا۔ نجمہ روتی جاتی تھی اور ہارا پنے سے علاحدہ نہ کرتی تھی۔ جان بھی ہار دے دینے کے خلاف تھا۔ سوامی اور جیک بھی یہی چاہتے تھے کہ ہار نہ دیا جائے۔ مگر میں نجمہ کی زندگی بچانے کی خاطر یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ہار دے دے۔ جیگا کی آواز بار بار دھمکی دے رہی تھی کہ ہار فوراً دے دیا جائے۔ مگر نجمہ کسی کی ایک نہ سنتی تھی۔

"بہت اچھّا میں جانتا ہوں سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا۔" جیگا نے غُصّے سے کہا۔ "میں تُم لوگوں کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں مگر تم شاید مرنے کے خواہش مند ہو۔ بہت بہتر، تمہاری یہ خواہش بھی پوری کی جائے گی۔ میں اپنے خادم آدم خور کو حُکم دیتا ہوں کہ وہ تم سے زبردستی دونوں چیزیں چھین لے۔"

"میرا ہار مت لو، ابّا جی یہ ہار مُجھے بہت پیارا ہے۔" نجمہ پھر چیخنے لگی۔

اچانک پرندے کے مُونہہ سے ایک باریک آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی

ایک نارنجی رنگ کی روشنی بھی۔ اس روشنی میں ہم سب نہا گئے۔ ہمیں یکایک یہ محسوس ہوا کہ جیسے ہمارے جسم سُن ہو کر اکڑ گئے ہیں۔ ہمارے دماغ جاگ رہے تھے مگر پورا جسم سو رہا تھا۔ ایک عجیب کیفیت تھی جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ آنکھیں سب کُچھ دیکھ رہی تھیں مگر ہاتھ بے بس تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے زمین نے ہمارے قدم پکڑ لئے ہیں اور ہاتھ بے جان ہو گئے ہیں۔ میں نے بولنا چاہا تو میری آواز بھی نہیں نکل سکی۔ پرندے کی آنکھوں سے روشنی برابر نکل رہی تھی۔ کُچھ ہی دیر بعد اس کے مُونہہ سے ایک آواز اور نکلی اور اس آواز کو سُن کر وہ لمبا تڑنگا اور خوفناک آدم خور ہماری طرف آنے لگا۔ ہم بالکل بے بس تھے اس لئے اسے اپنی طرف آتے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہے۔

آدم خور سب سے پہلے جان کے پاس آیا اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر جان کے گلے میں سے سوبیا کا ڈبّہ اُتار لیا، اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ نجمہ کی

طرف بڑھا اور اس کے گلے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ نجمہ کے چہرے پر دہشت طاری تھی مگر وہ غریب کُچھ نہ کر سکتی تھی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ آدم خور نے نجمہ کے گلے سے آفاقی ہار توڑ لیا اور پھر یہ دونوں چیزیں حاصل کرنے کے بعد واپس پرندے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ پرندے کی چونک کھلی اور پھر آواز آئی۔

"دیکھا میرے طریقے کتنے عجیب ہیں۔ تم لوگ کُچھ بھی نہ کر سکے اور دونوں چیزیں میرے پاس آئیں۔ تم سمجھتے تھے کہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ ہرگز نہیں مسٹر جان، مُجھے اپنی اس دُنیا میں تم جیسے سائنس دانوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔ مُجھے تم سے بہت کام لینے ہیں، اس لئے میں تمہیں اور تمہاری پارٹی کو زندہ رکھوں گا۔ مگر تمہاری حالت ایسی ہو جائے گی کہ تمہیں خود اپنے اوپر ہنسی آیا کرے گی۔ اس حالت میں تم اس جگہ سے کسی طرح واپس نہ جا سکو گے۔ کیونکہ ہر چیز تمہارے قد سے پچاس گنا بڑی ہو

جائے گی۔ یہاں سے نکلنے کا راستہ صرف وہی غار ہے جسے تمہارے ملازم نے تلاش کیا تھا اور جس کے ذریعے تم مُجھ تک پُہنچے ہو۔ تم سمجھتے تھے کہ وہ زلزلہ تھا جس نے تمہیں پاتال میں پہنچایا۔۔ جی نہیں وہ زلزلہ میرا بھیجا ہوا تھا۔ تاکہ تمہیں آدم خوروں کے پنجے سے چھڑایا جا سکے۔ تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہیئے۔"

جیگا کُچھ دیر تک خاموش رہا۔ اس کے بعد لوہے کے پرندے میں سے پھر آواز آئی۔

"اوہ۔۔۔ معاف کرنا، میں نے تمہیں ابھی تک مفلوج کر رکھا ہے لو میں ان شعاؤں کو بند کر دیتا ہوں۔"

فوراً ہی روشنی کی وہ لکیریں ختم ہو گئیں اور ہم سب پھر اپنی اصلی حالت پر آ گئے کُچھ دیر تک خاموشی رہی۔ اور آخر کار جیگا کی آواز پھر آئی۔

”نجمہ کو اپنے ہار کے جانے کا بہت رنج ہے۔ مگر ہم اسے اس سے بھی اچھّا ہار دے دیں گے۔“

”نہیں مُجھے اور کوئی ہار نہیں چاہیئے۔۔“ نجمہ نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”تمہاری مرضی۔۔۔“ جیگا نے آہستہ سے کہا۔ ”تم بہت ضِدّی ہو اور تمہاری یہ ضِد تمہیں کسی وقت بہت نقصان پہنچائے گی۔ اچھّا مسٹر جان اب میں چلتا ہوں، جلد ہی آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔ کُچھ ہی لمحوں میں میری خاص گاڑیاں اور خاص ملازم آپ کو لینے آئیں گے۔ براہِ کرم ان کا کہنا مانیے گا ورنہ نتیجے کے ذمّہ دار آپ خود ہوں گے۔ کیونکہ وہ ملازم گوشت پوست کے نہیں بلکہ خالص لوہے کے ہیں۔“

پرندے کی چونچ بند ہو گئی اور پھر وہ فوراً ہی اپنے لوہے کے پَر ہوا میں ہلاتا ہوا اوپر اڑنے لگا۔ اسے اڑتے دیکھ کر آدم خور بھی آفاقی ہار اور سوبیا کا ڈبّہ اپنے ساتھ لے کر کسی طرف چلا گیا اب ہم اکیلے رہ گئے جان نے فوراً

آہستہ سے کہا۔

"فیروز۔۔۔ یہ کتنی خوش قسمتی ہے کہ سوبیا کی تھوڑی سی مقدار ابھی تک نجمہ کے پاس ہے۔ نجمہ بیٹی خبردار۔۔۔ اسے کبھی اپنے جسم سے جدا نہ کرنا۔"

"آپ بے فکر رہیئے انکل، نجمہ اس کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرے گی۔"میں نے جواب دیا۔

"افسوس تو اس بات کا ہے کہ آفاقی ہار ہاتھ سے نکل گیا۔" جان نے کہنا شروع کیا۔"جیگا نے خود ہی اپنی موت کا راز ہمیں بتا دیا ہے۔ سوبیا اور آفاقی ہار اس کی موت کے لئے بہت ضروری ہے۔ مگر افسوس یہ ہار اب جا چکا ہے۔"

"آپ فکر مت کیجئے وہ ہار میں جیگا سے حاصل کرلوں گا۔"امجد نے بے خوفی

سے کہا۔

"کیا بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو امجد۔" جان نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "جیگا سے وہ ہار واپس لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔"

میں نے کُچھ کہنے کے لئے مُونہہ کھولا ہی تھا کہ اچانک ایک زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز مُجھے بائیں طرف کی سُرنگ سے آتی ہوئی سُنائی دی۔ ابھی میں یہ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ آواز کس چیز کی ہے کہ اچانک ایک نِرالی قسم کی گاڑی، ہال میں بچھی ہوئی اس لائن پر چلتی ہوئی ہمارے سامنے آ کر رُک گئی۔ یہ گاڑی ہر طرف سے بند تھی اور اس کی شکل ناریل جیسی تھی۔ اوپر دو تانبے کے تار کھڑے ہوئے تھے۔ بالکل ایسے جیسے آج کل کے ٹرانسسٹر ریڈیو میں لگے ہوتے ہیں۔ شاید یہ ایریل کا کام دیتے ہوں گے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس گاڑی میں سے ایک دروازہ آہستہ آہستہ

ایک طرف کھسکنا شروع ہوا اور پھر فوراً ہی اس میں سے دو سائے اُترے۔ پہلی نظر میں تو وہ مُجھے سائے ہی نظر آئے مگر جب میں نے غور سے دیکھا تو چونک گیا۔ وہ دراصل روبوٹ تھے۔

آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ روبوٹ لوہے کے بنے ہوئے اس بجلی سے چلنے والے آدمی کو کہتے ہیں جس کے اندر مشینیں اور کَل پرزے لگے ہوتے ہیں۔ آپ اسے ایک قسم کا فولادی آدمی سمجھ لیجئے۔ اس کی ٹانگیں ہاتھ اور جسم سب پیچوں سے کسے ہوتے ہیں۔ اس کا دماغ تو ہوتا نہیں۔ بس یہ اپنے مالک کے اشاروں پر چلتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے، کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو جکاریوں، زوکوں اور آدم خوروں سے زیادہ خوفناک چیز یہ فولاد کے آدمی یا روبوٹ تھے!

گاڑی سے اُترنے کے بعد وہ سیدھے ہماری طرف آئے، اور پھر قریب آ کر رُک گئے۔ تعداد میں وہ صرف دو تھے۔ ان کے چہروں پر میں نے عجیب

کلیں دیکھیں۔ آنکھوں کی جگہ دو بلب لگے ہوئے تھے جو جل بُجھ رہے تھے۔ ناک سِرے سے تھی ہی نہیں۔ مُونہہ کی جگہ ایک سوراخ تھا جس میں شاید لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔ کانوں کے مقام پر دو دو ایریل لگے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی اختر اور نجمہ سہم گئے ہمیں بھی اتنا خوف محسوس ہوا کہ ہم بھی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ یکایک ان میں سے ایک ہمارے سامنے ادب سے جھکا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اور اس کے اندر سے کَل پرزوں کی کھٹ پٹ سُنائی دینے لگی۔ اس کے بعد اس کے مُونہہ سے آواز نکلی۔

"اپنے آقا اور زہرہ کے عظیم مالک جیگا کی طرف سے ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ ہم سے ڈریے مت، ہم آپ کو کُچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ بس آپ صرف ہمارے ساتھ اس گاڑی میں چل کر بیٹھ جائیے۔"

"م۔۔۔ مگر تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"افسوس ہے کہ ان سوالوں کا جواب دینا، میرے بس میں نہیں۔ میں تو اپنے آقا کا غُلام ہوں، اس کا جواب وہی آپ کو دیں گے۔ آئیے دیر مت کیجئے۔ ہمیں اور بھی کام کرنے ہیں۔"

ہم نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جان کا اشارہ پا کر خاموشی سے روبوٹ کے ساتھ اس گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ بڑی اچھّی اور کھلی ہوئی گاڑی تھی اور اس میں بڑی آرام دہ کرسیاں بِچھی ہوئی تھیں۔ ہمارے بیٹھتے ہی دروازہ بند ہو گیا اور گاڑی خود بخود چلنے لگی۔ باہر کی چیز ہمیں ایک بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ گاڑی کافی دیر تک چلتی رہی اور ہم اس میں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے۔ شاید آدھ گھنٹے تک ہم اس گاڑی میں ہی بیٹھے رہے، آدھ گھنٹے کے بعد وہ خود بخود رُک گئی۔ دروازہ کھلا اور میں باہر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہ میں بمبئی کے کسی کارخانے میں آگیا ہوں۔ ہر

چیز اعلیٰ درجے کی اور نفیس تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی مُجھے عجیب و غریب مشینیں اور شفاف شیشے کے آلات نظر آتے تھے۔ روبوٹ نے ہمیں نیچے اترنے کا اشارہ کیا تو ہم سہمے سہمے سے اُترنے لگے۔ پہلے ہال کے مقابلے میں اس ہال کی چھت ایسی ہی تھی جیسی کہ کسی بڑے کارخانے کی ہوتی ہے۔ جگہ جگہ بجلی کے بلب روشن تھے اور ان میں سے دودھیا رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کارخانے کے مختلف دروازوں میں سے پندرہ بیس روبوٹ اندر داخل ہو گئے اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ہر ایک روبوٹ کوئی نہ کوئی کام کر رہا تھا۔ شیشے کے مختلف برتنوں میں ہمیں ایک دھواں سا نظر آیا۔ پتہ نہیں یہ کیا چیز تھی۔ دھوئیں کے ساتھ ہی ہلکے سُرخ رنگ کی ایک گاڑھی سی چیز بھی برتنوں میں نظر آتی تھی۔

”تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟“ میں نے روبوٹ سے سوال کیا۔

"اس سوال کا جواب دینے کی مُجھے اجازت ہے۔" روبوٹ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ عظیم جیگا کی خاص لیبارٹری ہے۔ یہاں عظیم جیگا مختلف تجربے کرتا ہے یہاں پر وہ کمزوروں کو طاقت عطا کرتا ہے اور طاقتوروں سے ان کی طاقت چھین لیتا ہے۔ یہیں پر بیٹھے بیٹھے وہ پورے نظامِ شمسی کے حالات دیکھتا رہتا ہے۔ یہیں بیٹھ کر اس نے آپ کی پارٹی کی ایک ایک حرکت کو دیکھا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔" روبوٹ ایک بڑے دروازے کے پاس جا کر رُک گیا اور پھر بولا۔

"بس۔۔۔ مُجھے اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں۔ یہاں سے آپ لوگ خود آگے جائیے۔ بائیں طرف مڑنے کے بعد آپ کو ایک دوسری لیبارٹری ملے گی، وہاں سے ماڈل نمبر آٹھ کے دو روبوٹ آپ کو عظیم جیگا تک لے جائیں گے۔۔۔"

اتنا کہہ کر وہ روبوٹ واپس چلے گئے۔

اب ہم اس دروازے کے پاس سہمے ہوئے کھڑے تھے جس کے اندر شاید ہماری موت ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ بڑی دیر تک ہم آپس میں بحث کرتے رہے کہ اندر جائیں یا نہیں۔ لیکن اندر جائے بغیر اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس لئے ہم نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم بڑھائے۔ روبوٹ نے جیسا کہا تھا وہی ہوا۔ بائیں طرف مڑنے کے بعد ہمیں ایک چھوٹی سی لیبارٹری دکھائی دی جس کے بیچ میں شیشے کا ایک بہت بڑا کیبن بنا ہوا تھا۔ کیبن کے برابر ہی کالے رنگ کے دو روبوٹ کھڑے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ادب سے جھکے اور ان میں سے ایک بولا۔

”ہم موڈل نمبر آٹھ کے روبوٹ ہیں۔۔ تشریف لائیے اور اس کمرے میں داخل ہو جائیے۔ عظیم جیگا آپ سے یہیں ملاقات کریں گے۔“

اتنا کہہ کر اس نے شیشے کے کیبن کا ایک دروازہ کھول دیا۔ دروازے کی طرف صرف اس نے اشارہ کیا تھا اور وہ اپنے آپ ہی کھل گیا۔ ایک

شش و پنج کی حالت میں ہم لوگ اس شیشے کے کیبن میں داخل ہو گئے۔ کیبن کی چھت میں ایک سوراخ تھا اور اس سوراخ میں سے ایک بہت بڑا دوربین جیسا لینس باہر نکلا ہوا تھا۔ بیچ میں عجیب قسم کی کُچھ کُرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم ان پر جا کر بیٹھ گئے۔ روبوٹ نے ہاتھ کے اشارے سے دروازہ پھر بند کر دیا اور خاموش کھڑا ہو گیا کُچھ ہی لمحے بعد کیبن کے اندر ایک آواز گونجنے لگی۔

"آداب عرض مسٹر جان اور مسٹر فیروز۔۔۔ یہ میری خاص جگہ ہے اسی جگہ میں آپ سے ملاقات کروں گا اور اسی مقام پر آپ میری صورت دیکھیں گے۔ آپ میرے مہمان ہیں اور مُجھے یہ دیکھ کر شرم محسوس ہو رہی ہے کہ آپ حضرات کے پاس اب ایک بھی ایسا فالتو کپڑا نہیں، جس سے آپ اپنا بدن ڈھک سکیں۔ آپ کی خاطر و مدارات کا انتظام میں نے پہلے ہی سے کر رکھا ہے اور بمبئی سے آپ کی ناپ کے کپڑے سلوا کر

منگوا رکھے ہیں۔ کیبن کے ایک کونے میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا کمرہ آپ دیکھ رہے ہیں، براہِ کرم اس کمرے میں باری باری جا کر لباس تبدیل کر لیجئے، ذرا جلدی کیجئے مُجھے کُچھ اور بھی کام ہیں۔"

جیگا کے اتنے کہنے پر جان نے ایک خاص نظر سے نجمہ کو دیکھا۔ نجمہ نے بے فکری کے انداز میں گردن ہلا دی۔ میں دونوں کی نظروں کا مطلب اچھّی طرح سمجھ گیا تھا۔ جان نجمہ کو ہدایت دے رہا تھا کہ سوبیا کے ڈبّے کو وہ اپنے جسم سے الگ نہ کرے اور نجمہ نے اسے اطمینان دلا دیا تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اپنی داستان کو مختصر کرتے ہوئے میں اتنا ہی کہوں گا کہ ہم لوگ لباس تبدیل کر کے پھر کیبن کے اندر آ گئے۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ لباس بہت اچھّا تھا اور ہم لوگ اب خاصے معقول انسان نظر آتے تھے۔

"بہت خوب۔۔۔ دیکھئے نا اب بھی تو آپ آدمی نظر آتے ہیں۔" جیگا کی

ہنسی کی آواز آئی۔ "اچھّا اب آپ حضرات ان کرسیوں پر بیٹھ جائیے، میں آپ کو ایک تماشہ دکھاتا ہوں۔"

ہم جیگا کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ اس لئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کرسیوں پر بیٹھتے ہی ایک مدھم سا شور ہمیں سُنائی دینے لگا۔ اور پھر یہ شور بڑھتے بڑھتے گڑگڑاہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ شیشے کے جس کیبن میں بیٹھے تھے اس کی دیواریں اچانک انگاروں کی طرح سُرخ ہو گئیں اور پھر اوپر چھت میں لگے ہوئے بہت بڑے لینس میں سے ایک سبز روشنی نکل کر ہمارے اوپر پڑنے لگی۔ اچانک میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ ایک عجیب قسم کی بے کلی اور بے چینی مُجھے محسوس ہونے لگی۔ مُجھے یوں لگا جیسے میری ہڈیاں اندر ہی اندر چیخ رہی ہیں۔ خون کی گردش تیز ہو گئی اور میری کھال جگہ جگہ سے کھنچنے لگی۔ میرے ساتھ ہی دوسروں کا بھی یہی حشر ہو رہا تھا۔ اور پھر جب میں نے ذرا غور سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو حقیقت معلوم ہوئی۔۔۔

اف میرے خُدا، یہ کیسا عذاب تھا۔ ہم لوگ سکڑ رہے تھے، ہمارے قد گھٹ رہے تھے، آہستہ آہستہ ہم زمین سے لگتے جا رہے تھے۔ خوف اور دہشت کی چیخیں ہمارے مُونہہ سے نکل رہی تھیں۔ اور ہم بالکل بے بس تھے۔۔۔!

تقریباً ایک منٹ تک سبز روشنی اس لینس میں سے نکلتی رہی اور اس کے بعد بند ہو گئی۔ ہم نے جب اپنے اوپر نظر ڈالی تو ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہمارے قد گھٹ کر صرف ڈھائی انچ رہ گئے تھے۔ بالکل ہاتھ کی بیچ کی اُنگلی کے برابر۔۔۔!

یہ وقت ایسا تھا کہ ہمارے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور ہم بُری طرح رو رہے تھے۔ شیشے کے کیبن کی ہر چیز ہمیں بہت بڑی نظر آ رہی تھی۔ جس کرسی پر ہم بیٹھے تھے وہ اب اتنی اونچی لگتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کئی ہزار فٹ اُونچے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوں۔۔ ابھی ہم اپنی حالت

کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں جیگا کی ہنسی سُنائی دی، وہ کہہ رہا تھا :

" دیکھی آپ نے میری طاقت! میں نے آپ لوگوں کو ایک حقیر کیڑے جیسا بنا دیا ہے۔ اِن بونوں سے بھی پانچ حصّے چھوٹا جو آپ کو یہاں آنے سے پہلے ملے تھے اور جِن کی چھوٹی سی دنیا میں آپ نے پورے دو دِن بسر کئے تھے۔ میں نے آپ کے قد ان ایک فٹ کے انسانوں سے بھی چھوٹے کر دیئے ہیں۔ یہ زندگی کتنی عجیب لگے گی آپ کو۔ آپ کے ساتھ ہی آپ کا سب سامان بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔ اس کرسی سے اُترنے کے لئے اب آپ کو اپنی اپنی رسّیاں نکالنی ہوں گی اور تب آپ ان سے لٹک کر نیچے اتر سکیں گے۔ اور اگر اتّفاق سے آپ نے کودنا چاہا تو پھر آپ کی ہڈّی پسلی کی خیر نہیں۔ ۔ کیوں ہے نا مزے دار بات!"

"کم بخت تُجھے شرم نہیں آتی ہم سے مذاق کرتے ہوئے، ہماری بے بسی

سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔" جان نے غُصّے سے لرزتے ہوئے کہا۔ "میں کہتا ہوں فوراً ہمیں بڑا کر دے ورنہ۔"

"ورنہ آپ کیا کریں گے؟" جیگا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔۔" جان نے کُچھ کہنا چاہا مگر پھر فوراً ہی بے بسی سے کہنے لگا۔ "میں کُچھ نہیں کر سکتا۔۔۔۔ ہاں میں کُچھ نہیں کر سکتا۔ یہ زندگی بڑی بھیانک ہے جیگا خُدا کے لئے ہمیں بڑا کر دو۔"

جیگا کے قہقہے کی آواز بڑی دیر تک اس کیبن میں گونجتی رہی۔ اس کے بعد اس نے کہا۔

"آپ کے ساتھ کافی عرصے تک رہنے کے بعد خُدا کو کُچھ کُچھ میں بھی ماننے لگا ہوں۔ اس لئے آپ کی یہ آرزو ضرور پوری ہوگی۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو پہلے آپ مُجھ سے ملاقات کیجئے۔ اچھّا یہ بتائیے کہ میں آپ کے سامنے

اپنی زہروی شکل میں آؤں یا آپ کی پارٹی کے ایک ساتھی کی شکل میں۔۔۔ آپ میری اصلی شکل تو دیکھ ہی چکے ہیں، اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں آپ کی پارٹی کے ایک ممبر کی شکل میں سامنے آؤں۔ اس طرح آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جیگا کس شکل میں آپ حضرات کے ساتھ ہے۔ بہت اچھّا ذرا انتظار کیجئے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا شیشے کا کیبن آہستہ آہستہ زمین میں دھنسنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم لفٹ میں بیٹھے ہوئے نیچے جارہے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد یہ کیبن رُک گیا اور پھر یکایک نگاہوں کو چندھیا دینے والی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے کیبن کے برابر ہی ایک دوسرا کیبن ہے اور اس کیبن میں ایک خاص میز کے آگے کوئی شخص بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا ہے۔ اس کی کمر ہماری طرف تھی اس لئے ہم اس کی شکل نہیں دیکھ سکتے تھے ہم میں سے ہر شخص ڈر رہا تھا کہ خُدا جانے وہ کم بخت

ہم میں سے کون ہو؟ جس میز کے آگے وہ بیٹھا تھا اس پر ہزاروں بٹن، کمانیاں اور ہینڈل لگے ہوئے تھے۔ اس میز کے پیچھے ہی ٹیلی ویژن کے سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ ان کی اسکرین پر پہ لے ہال کا وہ منظر نظر آ رہا تھا جہاں جکاری اور آدم خور کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ کیبن کی چھت پر کچھ رنگ برنگی روشنیاں ناچ رہی تھیں۔ کیبن کیا تھا ایک اچھّا خاصا طِلسمی عجائب گھر تھا۔

جیگا کی پشت اس وقت ہمارے سامنے تھی اور اس کے سر اور جسم سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ امجد ہے۔ امجد نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی، اس لئے وہ خوف کی وجہ سے کپکپا رہا تھا۔ ہمیں اپنی جسامت کے لحاظ سے جیگا ایک دیو نظر آتا تھا اور ہم حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ اب تھوڑی ہی دیر میں اس راز کا پردہ فاش ہونے والا تھا جس کی وجہ سے ہم لوگ بڑے پریشان تھے اور ایک دوسرے پر شک کر رہے تھے۔

جیگا نے بھی شاید ہمارے خیال کو بھانپ لیا، اس لئے بولا۔

"میں اب آپ کے سامنے آتا ہوں اور مُجھے یقین ہے کہ آپ مُجھے دیکھ کر حیرت میں پڑ جائیں گے۔"

جیگا کی آواز اب مُجھے جانی پہچانی معلوم ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ میں نے اس آواز کو پہلے کہاں سنا ہے مگر اس سے پہلے کہ میرا دماغ مُجھے صحیح بات بتاتا۔ جیگا نے اپنی گھومنے والی کرسی کو موڑنا شروع کر دیا اور پھر فوراً ہی اس کی شکل ہمارے سامنے آ گئی۔ مُجھے یوں لگا جیسے اچانک زبردست زلزلہ آ گیا ہو یا جیسے وہ شیشے کا کیبن گھومنے لگا ہو۔ میرا سر چکرانے لگا، اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ دہشت اور تعجّب کی آوازیں ہمارے مُونہہ سے ایک ساتھ نکلیں۔

"کون۔۔۔! بلونت!"

جی ہاں، میرا پرانا ساتھی اور میرا دوسرا بازو بلونت۔ ہو شخص جسے میں مرا ہوا سمجھتا تھا۔ اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا مُسکرا رہا تھا۔ وہ سو فیصدی بلونت تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میرے خطرناک سفر کے شروع میں واقعی وہ میرا ساتھی تھا اور میں اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کہ ایک ہی وقت میں وہ دو جگہ موجود ہو سکتا تھا۔ مثال آپ کے سامنے موجود ہے۔ کہاں تو اس کے ڈھانچے کا ملنا اور کہاں اس کا زندہ سلامت اس زمین دوز دنیا میں موجود ہونا۔

"جی ہاں میں بلونت ہوں۔۔۔ آپ کی پارٹی کا ایک ممبر۔" جیگا نے کہنا شروع کیا۔ "اس سے پہلے کہ آپ کے سامنے میں آپ کی پیاری دنیا کو ختم کروں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے بارے میں شروع سے لے کر آخر تک سب باتیں، مختصراً بتا دوں تاکہ آپ کے دِل میں جو سوال اُٹھ رہے ہیں، ان کے جواب آپ کو مل جائیں۔۔

سنئے۔ شاگو نے جب مُجھے زہرہ سے نکال دیا تو میں نے اس جزیرے پر قبضہ کر لیا جس کے اندر اس وقت آپ موجود ہیں۔ یہاں میں نے اپنی عقل اور سائنس کے بل بوتے پر یہ دُنیا بنائی۔ اس جزیرے سے کافی دور ایک جزیرہ اور ہے جسے میں نے اپنے طریقوں سے ملا لیا ہے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں پہلے پہل آپ کی ملاقات جکاریوں سے ہوئی تھی۔ اور جہاں جکاریوں نے جیک کو بھینٹ چڑھانا چاہا تھا اور جہاں آپ کو جان اور جیک پہلی بار گھنٹے کو بجاتے ہوئے ملے تھے۔ اس جزیرے کو اپنی خاص آبی مشینوں کے ذریعے میں نے اس کالی دُنیا سے ملا رکھا ہے۔ خیر تو مُجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ شاگو نے مسٹر جان کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے کہ وہ میرا اور میری اس کالی دُنیا کا خاتمہ کر دیں۔

خوش قسمتی سے میں فیروز صاحب کے پاس بہت پہلے ملازم تھا۔ ان کی ملازمت میں نے اس لئے کی تھی کہ مُجھے معلوم تھا کہ یہ ایک بار اس

جزیرے میں ہو آئے ہیں جہاں سوبیا بہت بڑی مقدار میں موجود تھی۔ فیروز مُجھ پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور میں ان کی لاعلمی میں بارہا سوبیا والے اس جزیرے میں آتا جاتا رہا۔ سوامی کو مُجھ پر شک تو ہو گیا تھا۔ اور وہ مُجھ سے نفرت بھی کرتا تھا مگر وہ میرا کُچھ نہ بگاڑ سکا۔

خیر تو ایک دِن میں نے مسٹر جان کا بھیجا ہوا خط راستے ہی میں اُڑا لیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ وہ فیروز صاحب سے ملنے بمبئی آ رہے ہے۔ میری خوش قسمتی سے راستے میں طوفان آیا اور جان صاحب ایسے جزیرے میں پہنچ گئے جو میرے قبضے میں تھا۔ اس عرصے میں فیروز صاحب بمبئی سے روانہ ہو چکے تھے۔ اور ان کے ساتھ نجمہ اور اختر بھی تھے۔ نجمہ کی آمد کو میں نے اچھّی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ لڑکی میرے ارادوں میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے اور جیسا آپ کو معلوم ہے اس نے رکاوٹ ڈالی۔ راستے میں میں نے اختر کو ڈرایا اور ساتھ ہی فیروز صاحب کی بیوی زرینہ کو

بھی۔ مُجھے دیکھ لینے کے بعد یہ دونوں میری مرضی کے مطابق صاف مُکر گئے کہ انھوں نے کوئی خوفناک سایہ دیکھا ہے۔ میں یہی چاہتا تھا کہ فیروز صاحب سمجھ لیں کہ خطرے کا آغاز ہو گیا ہے لہٰذا سفر ملتوی کر دیں۔

مگر فیروز دھن کے پکّے ہیں۔ انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ راستے میں جب طوفان آیا تو میں نے سوامی کو جان بوجھ کر سمندر میں دھکا دے دیا اور خود حفاظتی کشتی میں پہنچ گیا۔ مگر مُجھے کیا معلوم تھا کہ سوامی بہت سخت جان ہے اور ایک دِن وہ امجد کو ساتھ لے کر آپ سب کو بچانے کے لئے جکاریوں والے جزیرے میں آ جائے گا، جکاریوں کو میں نے اپنے کام کرانے کے لئے سیّارہ زہرہ سے بُلایا تھا اور ان کی دیکھ بھال کے زوکوں کو بھی لے آیا تھا۔

جکاری آپ کی آمد کی اِطّلاع مُجھے دے رہے تھے۔ میں آپ کے ساتھ تھا اس لئے میں نے دماغ کے ذریعے ہی جکاریوں کو حُکم دیا کہ وہ مُجھے نہ

پہچانیں۔ ایسا ہی ہوا۔ آپ مُجھے اپنا ساتھی سمجھتے رہے لیکن میں دراصل جکاریوں کا آقا تھا۔ میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ درحقیقت قدم قدم پر میری یہی خواہش رہی کہ آپ لوگوں کو ختم کر دوں مگر مُجھے اس کا موقع نہ مل سکا اور پھر آپ لوگ بھی کافی سخت جان واقع ہوئے ہیں۔ میری مرضی کے مطابق جکاریوں نے آپ کو پکڑ لیا اور پھر جیک کی بھینٹ دینے لگے میں آپ لوگوں سے چھٹکارا پانے ہی والا تھا کہ اچانک سوامی سوبیا لے کر آ گیا۔ مُجھے اس کا گمان بھی نہ تھا کہ سوبیا اس طرح جکاریوں کو ختم کر دے گی۔ اپنی شکست قبول کر کے میں آپ کے ساتھ ہی بھاگا۔ دانستہ میں ذرا پیچھے رہ گیا اور اتنی دیر میں مَیں نے جکاریوں کو ہدایتیں دیں، بعد میں آپ سے آ کر مل گیا۔ شکر ہے کہ اس وقت بھی آپ کو شُبہ نہیں ہوا۔ گو مسٹر جان نے میرے پیچھے رہ جانے کا بہت بُرا منایا۔

پھر کشتی میں آپ کو شاگو کا پیغام اور آفاقی ہار ملا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ

آفاقی ہار میری موت کا پیامبر ہے اس لئے میں جان بوجھ کر پانی میں کود پڑا اور آپ کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں آفاقی ہار کے ساتھ کسی صورت سے بھی نہیں رہ سکتا تھا اس لئے میں نے روپوش ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ ایک مچھلی کی شکل میں آنے کے بعد میں نے آپ سے آفاقی ہار چھیننے کی بہتیری کوششیں کی مگر میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آفاقی ہار کی موجودگی سے میرا جسمانی نظام درہم برہم ہو رہا تھا میں زیادہ دیر تک مچھلی نہیں بنا رہ سکتا تھا اس لئے جیسے ہی آپ نے آفاقی ہار کشتی میں پھینکا میں وہاں سے غائب ہو گیا۔ آپ لوگ سمجھے کہ میں ڈوب گیا ہوں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے آپ کی کشتی کے نصف فرلانگ دائرے کا پانی برف بنا دیا اور پھر اپنے تخیّل کی مدد سے برف کو ایک دیو کے قالب میں ڈھال دیا۔ یہ دیکھ کر مُجھے بڑی خُوشی تھی کہ آفاقی ہار نجمہ کے گلے میں نہیں بلکہ اختر کے گلے میں ہے۔ اختر کے گلے میں ہونے سے اس کا زیادہ اثر مُجھ

پر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے میرا تخیّلی دیو آپ سب کو پریشان کرنے لگا۔ اس نے آپ کو اپنے برف کے پیٹ میں قید کر لیا۔ مگر چوں کہ میری قسمت خراب تھی اس لئے میں یہاں بھی مات کھا گیا۔ ہار اختر کے گلے میں سے نکل کر نجمہ کے گلے میں جا پڑا اور پھر فتح آپ لوگوں ہی کی ہوئی۔ میرا تخیّلی دیو ختم ہو گیا اور آپ بڑی مشکل اور پریشانیوں کے بعد اس جزیرے میں آ گئے۔

یہاں بھی میں نے اپنے تخیّل کا سہارا لے کر ایک انسانی ڈھانچے کے ساتھ اپنی کُچھ نشانیاں رکھ دیں تاکہ آپ سمجھ لیں کہ وہ ڈھانچہ میرا ہے اور ہوا بھی یہی۔ آپ نے میرے مرنے کا بہت افسوس کیا اور پھر آپ آدم خوروں کے چنگل میں پھنس گئے۔ ان آدم خوروں کو میں نے ابھی تک اپنے قبضے میں نہیں کیا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر انہیں باہر چھوڑ رکھا ہے۔ ان میں سے کُچھ کو میں نے اپنے کام کاج کے لئے اپنی لیبارٹری

میں رکھا ہوا ہے۔

خیر میں چاہتا تھا کہ آدم خور آپ کو ختم کر دیں۔ مگر یہاں بھی سوامی آپ کے کام آیا۔ اس کم بخت نے میرا سب کام چوپٹ کر دیا اور آپ کو کالی دُنیا کا راستہ بتا دیا۔ میں اچھّی طرح جانتا تھا کہ آپ مُجھ تک پہنچنے کے لئے ہزاروں مُصیبتوں سے گزریں گے اور ہوا بھی یہی، مگر آپ حضرات کی بہادری نے مُجھے پھر زِک پہنچائی۔ میں آپ کی قدر کرتا ہوں۔ آپ کی بہادری نے میرا دِل جیت لیا ہے۔ مُجھے یقین تھا کہ آپ لوگ راستے ہی میں ختم ہو جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے مُجھے مجبوراً آپ کو اپنے خاص علاقے میں لے کر آنا پڑا۔ اور اب جو کُچھ بھی آپ کے ساتھ پیش آ رہا ہے، وہ آپ اچھّی طرح جانتے ہیں۔ شیشے کے جس خاص کیبن میں اس وقت میں بیٹھا ہوا آپ سے باتیں کر رہا ہوں وہ دراصل ایک فورس شیلڈ ہے۔ آفاقی ہار اور سوبیا اگر آپ کے پاس ہوتے، تب بھی میرا کُچھ نہیں

بگاڑ سکتے تھے۔ یہ فورس شیلڈ ان کی زہریلی کرنوں کو مُجھ تک نہیں پہنچنے دیتی۔ میرے خاص روبوٹ ہی اس کیبن کو توڑ سکتے ہیں۔ ان کا جسم جس دھات سے بنا ہے وہ دھات اس فورس شیلڈ میں سے آسانی سے گزر سکتی ہے۔ میرا مشن اب ایک حد تک پورا ہو چکا ہے۔ بس کل تک کا وقت میرے پاس اور ہے۔ کل میں اپنے اسی بوتھ میں بیٹھ کر یہ دو بٹن دباؤں گا اور آپ کی دُنیا چشمِ زدن میں روئی کے گالوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑنے لگے گی۔ کیوں، کیسی مزے دار بات ہے؟"

جیگا اتنا کہہ کر پھر ہنسنے لگا۔ اس کی کم ظرفی اور چالاکیوں پر مُجھے طیش تو بہت آ رہا تھا مگر میں بے بس تھا۔ اس لئے خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ امجد جیک اور سوامی نفرت بھری نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ خوب دِل کھول کر ہنس لینے کے بعد جیگا نے پھر کہا۔

"نجمہ اور اختر کے دِل میں اپنی ماں کو دیکھنے کی بڑی خواہش ہو گی کیوں نجمہ

اپنی ممی کو دیکھوگی؟"

"ہاں ہاں۔۔۔ کیوں نہیں، کہاں ہیں وہ؟" نجمہ نے بے قراری سے کہا۔

"وہ اپنے گھر میں ہی ہیں، مگر میرا ٹیلی ویژن سیٹ تمہیں وہاں کا منظر دکھائے گا۔ لو غور سے اس سیٹ کو دیکھو۔۔۔ تم بھی کیا یاد کروگی کہ کسی با اخلاق انسان سے واسطہ پڑا تھا۔"

اختر اور نجمہ بے چینی سے سیٹ کو دیکھنے لگے۔ میرا دِل بھی بلیوں اُچھل رہا تھا اور میں بھی بے قراری سے سیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیگا نے کوئی بٹن دبایا اور پھر سیٹ کے اسکرین پر آڑی ترچھی لکیریں ناچنے لگیں۔ کُچھ ہی دیر بعد مُجھے اپنے کمرے میں زرینہ بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ اپنے بچّوں کے فراق میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ بار بار وہ رومال سے آنسو پونچھتی تھی اور پھر رونے لگتی تھی۔

"امّی۔۔۔ امّی۔۔۔ تم کہاں ہو پیاری امّی۔۔۔" امجد اور نجمہ بُری طرح چیخنے اور رونے لگے۔

"بلونت۔۔۔ بلونت اسے بند کر دو۔" میرا گلا بھی اچانک بھر آیا۔ "خُدا کے لئے اسے بند کر دو۔ ہم سے اتنا بڑا انتقام نہ لو، کم از کم اتنا ہی خیال کر لو کہ تم نے میرا نمک کھایا ہے۔"

"خوب خوب۔۔۔" جیگا ہنسا۔ "آپ نے بڑی اچھّی بات کہی ہے، واقعی مُجھے آپ کا خیال کرنا چاہئے۔ یہ لیجئے میں اسے بند کر دیتا ہوں لیکن آپ پر یہ مُصیبت آپ کے دوست شاگو کی وجہ سے آئی ہے، نہ آپ شاگو کی مدد کرتے نہ آپ کا یہ حشر ہوتا۔"

"ایک احسان ہم پر اور کر دو۔۔۔" میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بڑا کر دو۔۔۔ اس ڈھائی انچ کے قد سے ہمیں بڑی وحشت ہو رہی ہے۔"

"ضرور ہو رہی ہو گی۔" جیگا نے کہا۔ "میں آپ کو ضرور بڑا کر دوں گا مگر ایک شرط ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ کے اس کمرے میں آپ ہی کی دُنیا کا ایک ننھّا سا جانور چھوڑ دوں، اور آپ کی پارٹی کے دو آدمی یعنی جیک اور سوامی اُس سے لڑیں۔ لڑنے کے لئے میں ان دونوں کو ایک ایک انچ لمبی دو تلواریں بھی دوں گا۔ کہئے منظور ہے؟"

"مگر وہ جانور کون سا ہے؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"بہت ہی حقیر اور ننھّا سا جانور ہے۔ آپ کی دُنیا کے بچّے اُس کی دُم پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ کر مار دیتے ہیں۔ یعنی ایک ننھّا سا چوہا۔ کہئے کتنا مزے دار کھیل رہے گا یہ۔"

ظالم کتنی خوبی کے ساتھ ہم سے کھیل رہا تھا، اپنے اس وقت کے قد میں چوہے سے مُقابلہ کرنا ہمارے لئے بہت مُشکل تھا۔ یہ مُقابلہ ایسا ہی ہوتا جیسے کسی انسان کو شیر سے لڑنے کے لئے کہا جائے۔ جیگا ہماری بے

بسی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ اور ہم اس کو کُچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ شاید اس نے سب پروگرام پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا۔ اس لئے اس نے کہا :

"سوامی اور جیک سُنو۔۔۔ تم دونوں اپنی رسّیاں نکال کر کرسی کے کسی بھی ڈنڈے سے باندھ دو اور پھر اس رسّی سے لٹک کر فرش تک پہنچو۔ اس کے بعد سامنے رکھی ہوئی میز کی سب سے چھوٹی دراز میں سے دو تلواریں نکالو۔ دونوں ایک ایک تلوار لے لو اور چوہے کے آنے کا انتظار کرو۔"

جیگا کا حُکم نہ ماننا دراصل اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ اس لئے جیک اور سوامی نے ایسا ہی کیا۔ ایک عام سائز کی کرسی سے رسّی کے سہارے وہ یوں اُتر رہے تھے جیسے کسی پہاڑ سے اُتر رہے ہوں۔ کرسی سے لے کر فرش تک کا فاصلہ اگر اپنے حساب سے ناپا جائے تو صرف چوبیس انچ تھا۔ مگر اپنی اس وقت کی جسامت کے اعتبار سے یہ فاصلہ تقریباً ساٹھ فٹ تھا۔ اسے یوں سمجھے جیسے ساٹھ فٹ اونچی کسی چٹّان سے چھ فٹ لمبے

قد کا کوئی انسان رسّی کے ذریعے نیچے اُتر رہا ہو۔ جیک اور سوامی باری باری اسی طرح فرش پر اُتر آئے اور پھر انہوں نے میز کی دراز سے ایک ایک انچ لمبی دو تلواریں بھی نکال لیں۔ جیگا نے یہ دیکھ کر کہا۔

"بہت اچھے، تم تیّار ہو گئے۔۔ خوب! اچھّا اب اس میدان میں چوہا آتا ہے۔ تم نے اگر چوہے کو مار لیا تو تمہارے قد بڑے ہو جائیں گے ورنہ مُجھے افسوس ہے کہ تمہارے بقیہ ساتھی ہمیشہ اسی قد کے رہیں گے، اچھّا ہوشیار!"

شیشے کے اس کیبن میں فرش کے پاس ہی ایک طرف سے چھوٹا سا کواڑ کھٹاک کی آواز کے ساتھ کھُل گیا اور پھر ہمیں اس میں سے ایک موٹا تازہ چوہا اندر داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ جیک اور سوامی کو دیکھتے ہی وہ ان پر اس طرح جھپٹا جس طرح بلی چوہے پر لپکتی ہے۔

آپ حضرات جو میری اس داستان کو پڑھ رہے ہیں، ذرا تصوّر کریں کہ وہ

وقت کیسا ہو گا؟ ہمارے قد ڈھائی انچ کے تھے اور چوہا ہمیں اپنے سے تین گنا بڑا نظر آتا تھا۔ ہماری بے بسی کی یہ انتہا تھی اور ہماری اس بے بسی کو جیگا اپنے کیبن میں سے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی خونخوار دیو ہم سے کھیل رہا ہو۔

اچانک جیک اور سوامی کے چیخنے کی آوازیں آئیں اور میں نے جلدی سے نیچے دیکھا۔ چوہا ان دونوں پر بار بار حملہ کر رہا تھا اور وہ پینترے بدل بدل کر اس کے حملے کو ناکام بنا رہے تھے۔ کبھی کبھار دونوں میں سے کوئی اپنی تلوار کی نوک چوہے کے جسم میں بھونک دیتا اور چوہا غضب ناک ہو کر اس پر ایک زوردار حملہ کرتا۔ جیگا اپنے کیبن میں بیٹھا ہوا تالیاں بجا رہا تھا اور بار بار چوہے کو شاباشی دیتا جاتا تھا۔ چوہے کے پنجوں سے جیک اور سوامی کافی زخمی ہو چکے تھے۔ اور چوہا بھی تلواروں کے گھاؤ کھا کھا کر کافی اَدھ مرا ہو گیا تھا۔

چوہے نے ایک بار سوامی پر ایسا حملہ کیا کہ سوامی زمین پر ِگر پڑا۔ یہ دیکھ کر جیک نے جلدی سے آگے بڑھ کر چوہے کے جسم پر تلوار سے ایک وار کیا۔ چوہا بلبلا گیا اور اس نے سوامی کو چھوڑ کر جیک پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ جیک اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکا اور چوہے نے اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ جیک کی چیخیں سُن کر سوامی جلدی سے اٹھا اور اس نے لپک کر اپنی تلوار چوہے کے پیٹ میں داخل کر دی۔ اس نے جلدی جلدی تلوار چوہے کے مختلف حصّوں پر مارنی شروع کر دی۔ پھر ایک وار تو اتنا کاری پڑا کہ چوہا تڑپ کر جیک سے الگ ہو گیا اور زمین پر ِگر کر بُری طرح تڑپنے لگا۔ اس کے خُون سے آس پاس کا فرش لال ہو گیا۔

اِدھر سوامی نے دوڑ کر جیک کو اٹھایا۔ چوہے نے اس کا بازو کافی زخمی کر دیا تھا۔ اور کمزوری کی وجہ سے وہ اب نِڈھال ہو رہا تھا۔ یکایک چوہے نے تین چار جھٹکے لئے اور پھر وہ مر گیا۔ یہ دیکھ کر جیگا نے اپنے کیبن میں سے

تالیاں بجائیں اور کہا۔

"بھئی واہ۔۔۔ بہادر ہوں تو ایسے۔۔۔ کمال کر دیا، کس ہمّت اور شجاعت کے ساتھ چوہے کو ختم کیا ہے۔ مُجھے افسوس ہے کہ تم دونوں زخمی ہو گئے ہو۔ مگر تمہارے یہ زخم ایک سیکنڈ میں بھر جائیں گے بے فکر رہو میں اپنا وعدہ نہیں بھولا ہوں۔ وعدے کے مطابق میں ابھی آپ سب کو بڑا کر دیتا ہوں۔"

اچانک ویسا ہی مدھم سا شور ہمیں پھر سُنائی دیا۔ شیشے کے کیبن کی دیواریں سُرخ ہو گئیں۔ اور اوپر چھت میں لگے ہوئے لینس میں سے سبز روشنی نکل کر ہمارے اوپر پڑنے لگی۔ میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا، پہلے کی طرح رگیں کھنچنے اور ہڈّیاں چٹخنے لگیں۔ خون کی گردش تیز ہو گئی اور کھال کھنچنے لگی۔ اور پھر مُجھے یہ دیکھ کر بے حد خُوشی ہوئی کہ ہمارے جسم آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔ کُچھ ہی دیر بعد ہم پہلے جیسے ہی ہو گئے۔ سوامی اور جیک بھی

اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ مُجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجّب ہوا کہ ان کے زخم بالکل غائب ہو گئے تھے اور کپڑوں پر خون کا ایک دھبّہ بھی نہ تھا۔ شاید یہ سب اس سبز روشنی کا کرشمہ تھا، جیگا اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا:

"میرا شکرادا کیجئے کہ آپ پھر اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔ اب آپ حضرات اسی جگہ آرام کیجئے۔ شیشے کے کیبن کا دروازہ آپ کے لئے کھول دیا جاتا ہے۔ آپ کو اجازت ہے کہ آپ یہاں جس جگہ بھی چاہیں گھوم پھر سکتے ہیں۔ اتنی گزارش ہے کہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں اور نہ کسی سے کُچھ پوچھیں۔ یہاں کے عجائبات، مشینیں اور دوسری چیزیں دیکھئے اور میری تعریف کیجئے۔ یہ اجازت آپ کو اس لئے ملی ہے کہ کل اسی وقت میرا مشن پورا ہو جائے گا اور میں اسی کمرے میں بیٹھ کر آپ کی نظروں کے سامنے آپ کی دُنیا کو ختم کر دوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خوفناک منظر

دیکھنے سے پہلے آپ میری عظمت اور بڑائی کو جان لیں اور میری عزّت کریں۔۔۔ بس اب میں چلتا ہوں۔"

جیگا کے جانے کے بعد ہم لوگ سوچنے لگے کہ اب کیا کریں؟ اپنی جانوں کی تو ہمیں پروانہ تھی مگر اپنی حسین اور پیاری دُنیا کا خیال تھا۔ یہ دنیا کل روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں بکھر جانے والی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اپنی دُنیا کو کس طرح بچائیں۔ کون سا وہ کام کریں جو جیگا کے اس خوفناک ارادے کو پورا نہ ہونے دے؟ سمجھ میں کُچھ نہ آیا اس لئے یہ طے پایا کہ اتنے عرصے میں جیگا کی اجازت کا فائدہ ہی اٹھایا جائے اور کیبن سے باہر نکل کر جیگا کی لیبارٹری دیکھی جائیں کیونکہ اس کیبن میں بیٹھے بیٹھے تو ہم اب اُکتا چکے تھے۔

چوہا ہمارے سامنے اب مرا ہوا پڑا تھا۔ چوں کہ ہم بڑے ہو چکے تھے، اس لئے ہمیں وہ ایک معمولی چوہا ہی نظر آتا تھا، نجمہ نے اس کی دم پکڑ کر کیبن

کے دروازے سے باہر پھینک دیا اور پھر ہم سب پروگرام کے مطابق دروازے سے نکل کر باہر لیبارٹری میں آ گئے۔ دیکھنا تو ہمیں کیا تھا۔ جو کُچھ دیکھنا تھا وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ مقصد تو صرف گھومنا تھا۔ عجائبات کا ظاہر ہے کہ وہاں کُچھ شمار نہ تھا۔ ہر سمت مشینیں ہی مشینیں نظر آتی تھیں۔

اس ہال کی دیواروں میں کُچھ جگہیں ایسی تھیں جن میں سے دودھیا رنگ کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ راستے میں ہمیں جگہ جگہ کئی روبوٹ ملے مگر انہوں نے ہمیں کُچھ نہ کہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پہلے ہی سے ان کو ہدایتیں مل چکی ہیں کہ ہمیں کُچھ نہ کہیں۔ نجمہ اور اختر سب سے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب بھی کوئی روبوٹ سامنے سے چلتا ہوا آتا وہ دونوں اسے حیرت سے دیکھنے لگتے۔ اس ہال میں ہر طرف سُرنگوں کے دروازے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کہ تمام سُرنگیں اسی ہال میں آخر ختم ہوتی ہیں۔ ہال میں جو مشینیں

تھیں وہ اپنے آپ ہی چل رہی تھیں۔ خُدا جانے یہ مشینیں کیا چیز بنا رہی تھیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ مشینیں سوبیا کو صاف کر کے کوئی عرق یا تیل جیسی چیز بنا رہی تھیں۔

ہال کا چکر لگا کر جیسے ہی میں پلٹ کر واپس آنے لگا تو یہ دیکھ کر مُجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نجمہ اور اختر ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ میں نے جلدی جلدی ہر سُرنگ کے دہانے پر دوڑ کر انہیں دیکھا مگر وہ دونوں کہیں نظر نہ آئے۔ ان کے اچانک اس طرح غائب ہو جانے سے سب بڑے پریشان ہوئے۔ ہر شخص باری باری مختلف سُرنگوں میں کافی دور تک انہیں ڈھونڈ آیا مگر خُدا جانے انہیں زمین کھا گئی یا آسمان!

میرا دِل گھبرانے لگا۔ دِل میں بُرے بُرے خیال آنے لگے کہ کہیں ان کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا۔ بڑی دیر تک ہم ہال میں چاروں طرف انہیں ڈھونڈتے رہے مگر وہ ہوتے تو ملتے۔ مجبور ہو کر میں واپس

اپنے اسی قید خانے میں آگیا۔ خیال یہ تھا کہ شاید وہ دونوں وہیں نہ پہنچ گئے ہوں۔ مگر شیشے کے کیبن میں ہر طرف دیکھ لینے کے باوجود بھی ان کا کوئی نام و نشان نہ ملا۔ اس خطرناک جگہ پر اختر اور نجمہ کی گُمشدگی سے میں اتنا دُکھی ہوا کہ میرے آنسو بہنے لگے۔ میں ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا اور جان مُجھے تسلّی دینے لگا۔ بہت دیر تک یہی ہوتا رہا۔ باری باری ہر ایک مُجھے تسلّی دے رہا تھا مگر میرا دِل کسی صورت سے نہ مانتا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ جیگا نے جان بوجھ کر میرے بچّوں کو مُجھ سے علیحدہ کر دیا ہے۔

اندازاً آدھے گھنٹے کے بعد نجمہ اور اختر کیبن کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ میں دیوانوں کی طرح ان کی طرف بڑھا اور انہیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ امجد کا اترا ہوا چہرہ بھی نجمہ کو دیکھتے ہی بشاش ہو گیا۔ میں نے ان دونوں سے جب یہ پوچھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے تھے تو اختر نے مُجھے جواب دیا کہ وہ ایک سُرنگ میں داخل ہونے کے بعد راستہ بھُول گئے

تھے اور کافی دیر تک پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ بڑی مُشکل کے بعد ایک روبوٹ سے انہوں نے راستہ پوچھا اور تب وہ یہاں واپس آئے ہیں۔ بچّوں کو صحیح سلامت پا کر میں کافی خوش ہو گیا۔ مگر میں یہ جانتا تھا کہ میری یہ خُوشی عارضی ہے کیونکہ کل شام کو ہماری دُنیا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ جب ہماری دنیا ہی نہ ہو گی تو پھر بھلا ہم کہاں ہوں گے!

شیشے کے اس قید خانے میں ایک طرف بجلی سے چلنے والی گھڑی بھی لگی ہوئی تھی۔ جس میں اس وقت سات بج رہے تھے۔ ہماری آنکھیں چونکہ بوجھل بوجھل سی تھیں اس لئے ہم نے اندازہ لگا لیا کہ یہ دراصل نیند کا خُمار ہے، اور گھڑی شام کے سات بجا رہی ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیبن میں کس طرح سویا جائے کہ اچانک مُجھے ایک روبوٹ اپنے اس قید خانے کے باہر کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں کے بلب جل اور بُجھ

رہے تھے فوراً ہی مُجھے کیبن کے اندر سے اس کی آواز آتی ہوئی سُنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"براہ کرم دیوار میں لگے ہوئے سات سُرخ رنگ کے بٹن دبا ئیے۔ آپ کے لئے بستروں کا انتظام ہو جائے گا۔"

روبوٹ کے اتنا کہتے ہی میں نے جلدی سے بٹن دبا دئیے۔ گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور پھر زمین میں سے سات نرم نرم گدّوں والے بِستر نمودار ہونے لگے اور پھر میرے دیکھتے دیکھتے سات عمدہ قسم کی مسہریاں فرش کے اوپر نظر آنے لگیں۔ ہم لوگ جلدی سے ان پر جا کر لیٹ گئے اور تب روبوٹ واپس چلا گیا۔

جیگا نے بے شک ہمارا دُشمن تھا مگر ہم سے جس طرح وہ پیش آ رہا تھا اور جیسا برتاؤ وہ ہم سے کر رہا تھا وہ درحقیقت اس کے عمدہ اخلاق کی دلیل تھی۔ بعض دفعہ تو ہمیں شُبہ ہونے لگتا تھا کہ ایسا اچھّا آدمی بھلا کس طرح

ہمارا دُشمن ہو سکتا ہے!

میرا ذہن بستر پر لیٹتے ہی بمبئی شہر کے اوپر پرواز کرنے لگا۔ مُجھے زرینہ بُری طرح یاد آنے لگی۔ سوچ رہا تھا کہ اب اسے زندگی میں دیکھوں گا بھی یا نہیں؟ اپنے بچّوں کی جدائی میں وہ کتنی پریشان ہوگی۔ ایسی باتیں سوچتے سوچتے میرا دِل بھر آیا اور پھر نہ جانے کب میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ دیوار کی گھڑی چھ بجا رہی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ صُبح ہو چکی ہے۔ میں نے کروٹ بدل کر بقیہ ساتھیوں کو بھی اٹھانا چاہا، مگر یہ دیکھ کر مُجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نجمہ اور اختر اپنے بستروں پر موجود نہیں ہیں۔ میں گھبرا کر جان سے پوچھنے ہی والا تھا کہ اچانک سامنے والے کیبن میں مُجھے جیگا داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ وہ اس وقت بہت خوش نظر آتا تھا۔ مُجھے بستر پر بیٹھے دیکھ کر کہنے لگا۔

"کہیے فیروز صاحب، بہت دیر تک سوئے۔"

"ہاں تھکن کی وجہ سے ہم لوگ پورے گیارہ گھنٹے تک سوتے رہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ غَلط سمجھ رہے ہیں جناب۔ گیارہ گھنٹے نہیں بتیس گھنٹے کہئے۔ آپ کل شام کو سوئے تھے اور آج شام کو اٹھ رہے ہیں۔ آپ لوگ تو واقعی گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔" اتنا کہہ کر وہ بُری طرح ہنسا اور کہنے لگا۔ "چلیئے اچھّا ہوا۔ آپ اب تازہ دم ہو کر میرا مشن پورا ہوتا ہوا دیکھیں گے مُجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی دُنیا کو ختم کر رہا ہوں۔ مگر یہ جو کُچھ میں کر رہا ہوں شاگو کو نیچا دکھانے کے لئے کر رہا ہوں۔ وہ آپ کی دُنیا کو بچانا چاہتا ہے لیکن ضد میں آ کر میں اب اسے ختم کر دوں گا۔"

جیگا سے یہ سن کر ہم لوگ تیئس گھنٹے تک سوتے رہے، مُجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے نجمہ اور اختر کے بارے میں پوچھنے کے لئے مُونہہ کھولا ہی تھا کہ جیگا نے پھر کہا۔

"اِسی ٹیلی ویژن سیٹ پر آپ کو اپنی دنیا کے پر خچے اُڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ باری باری آپ دُنیا کے ہر بڑے ملک کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔ اور آخر میں جب یہ جزیرہ جس میں اس وقت آپ اور ہم موجود ہیں خلا میں پہنچ جائے گا، تب آپ اپنی دنیا کی گولائی کو دیکھیں گے۔ آپ کے سائنس داں تو اِسی حسرت میں رہے کہ کسی صورت سے چاند یا مِرّیخ پر پہنچ کر یہ دیکھیں کہ وہاں سے دُنیا کیسی نظر آتی ہے! لیکن آج میں حقیقتاً یہ چیز آپ کو اس سیٹ پر دکھا دوں گا۔ آپ اپنی دنیا کو آسمان میں ٹنگا ہوا دیکھیں گے۔ ہلکے سبز رنگ کا گولا بٹن دباتے ہی آپ کو اس طرح پھٹتا ہوا نظر آئے گا جس طرح ربڑ کا غبارہ پھٹتا ہے۔ بس ابھی چند منٹ کے اندر اندر یہ دِل چسپ تماشا آپ کو دِکھائی دے گا۔ مگر ہاں یہ بتائیے کہ آپ کے دونوں بچّے کہاں ہیں۔ وہ مُجھے نظر نہیں آتے۔۔۔؟"

نہ جانے کیا بات تھی یا شاید قدرت ہی مُجھ سے یہ الفاظ کہلوا رہی تھی۔ میں

نے جلدی سے جھوٹ بولا۔

"وہ دونوں اسی خیال میں ہیں کہ صُبح ہوئی ہے۔ شاید اندر ہال میں کوئی غسل خانہ تلاش کرنے گئے ہیں۔"

"چلیئے کوئی بات نہیں، میرے روبوٹ انہیں وہ جگہ دکھا دیں گے۔ میں کُچھ دیر تک انتظار کرلیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر جیگا تو مشینوں اور آلات کو چیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اِدھر ہماری حالت تھی کہ دِل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ دُنیا کو ختم ہونے سے ہم اب کسی طرح نہیں روک سکتے تھے۔ جیگا کے بارے میں ہمیں علم تھا کہ وہ ضدّی ہے جو اس کے دِل میں ہے وہ اسے پورا کیئے بغیر ہر گز نہ رہے گا۔ ہمیں بیٹھے بیٹھے شاید آدھ گھنٹہ گُزر گیا مگر نجمہ اور اختر واپس نہیں آئے۔ اب تو مُجھے بھی فکر ہونے لگی۔ بار بار یہ وہم مُجھے پریشان کرنے لگا کہ شاید نجمہ اور اختر کو اغوا کیا گیا ہے اور اس اغوا میں یقیناً جیگا کا ہاتھ ہے۔ خوف

اور دہشت کی وجہ سے میرا حلق سُوکھ گیا۔ جان، امجد، جیک اور سوامی بھی گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ جیگا بھی اب شاید نجمہ اور اختر کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اس لئے اس نے کہا۔

"آخر وہ دونوں کہاں گئے۔ ایسا تو نہیں کہ وہ سیر کرتے کرتے آگے تک چلے گئے ہوں۔"

"میں کُچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں خود بھی پریشان ہوں۔"

"خیر کوئی مضائقہ نہیں۔" جیگا نے ایک خاص کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شاید وہ بھاگنے کی کوشش کررہے ہیں، چلیئے، انہیں ایسا کرنے دیجئے اور اب ٹیلی ویژن کے پردے کی طرف دیکھئے۔ آپ کی دنیا چشم زدن میں تباہ ہونے والی ہے۔۔۔ خوب غور سے دیکھئے۔"

ہم لوگ نجمہ اور اختر کو تو بھول گئے اور خوفزدہ نگاہوں سے سامنے دیکھنے

لگے۔ ٹیلی ویژن اسکرین پر بمبئی کا ساحل نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد مختلف عمارتیں نظر آنے لگیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جیگا کی کمر کے پیچھے لگی ہوئی کُچھ مشینوں میں آڑی ترچھی روشنیاں ناچنے لگیں۔ شیشے کی نلکیوں میں سو بیا دوڑنے لگی۔ ڈائلوں کی سوئیاں تھرتھرانے لگیں۔ اور ایک عجیب قسم کا شور کمرے میں بُلند ہونے لگا جیگا کے منحوس چہرے پر اس وقت ایک بھیانک تبسّم نظر آتا تھا۔

"دیکھ لیجئے۔۔ میرا ہاتھ جس لیور پر رکھا ہوا ہے اسے دباتے ہی آپ کو ٹیلی ویژن سیٹ پر پٹاخے چھوٹتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جب ملک ختم ہونے لگیں گے تو میں اس جزیرے سمیت خلا میں پہنچ جاؤں گا اور تب آپ اپنی دنیا کو پہلی مرتبہ کئی لاکھ میل کی بلندی سے پھٹتے اور ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھیں گے۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ خُدا کے لئے ایسا مت کرو۔" جان نے چلا کر کہا۔

"کروڑوں لوگ بے موت مارے جائیں گے۔"

"مجھے لوگوں کی کیا پروا۔۔۔۔۔ میں انسان تو ہوں نہیں جو کسی پر رحم کروں۔" جیگا نے سفّاکی سے جواب دیا۔

"بلونت! مان جاؤ۔۔۔ ایسا مت کرو، آخر تمھیں اس سے کیا فائدہ پُہنچے گا؟" میں نے گڑگڑا کر کہا۔

"کیا یہ فائدہ کم ہے کہ میں اس جزیرے کا مالک بن جاؤں گا جہاں سوبیا کا خزانہ ہے۔ دُنیا میں رہ کر تو شاید آپ لوگ مُجھے مارنے کی سوچتے لیکن جب میں اس جزیرے ہی کو خلا میں لے جاؤں گا تو کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔" وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔

"مجھے میرے ارادے سے کوئی نہیں روک سکتا۔۔۔ بس اب میں اپنا کام کرتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر جیگا نے ایک بٹن دبایا اور گڑگڑاہٹ کا شور یکایک بڑھ گیا۔ اس وقت جیگا عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو، وہ لگاتار ہنس رہا تھا۔ ہمیں ایک دو مرتبہ گھور کر دیکھ لیتا اور پھر ہنسنے لگتا۔ اچانک ہنستے ہنستے وہ چُپ ہو گیا اور بائیں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خُون اُترا ہوا تھا۔ ہم نے بھی جب اس طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو روبوٹ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جیگا کے کیبن کی طرف آ رہے ہیں۔

"کیا بات ہے۔۔ موڈل نمبر آٹھ کے روبوٹس۔ میری اجازت کے بغیر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

روبوٹس نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ آگے بڑھتے گئے۔ جیگا نے جلدی سے ایک مائیکرو فون اٹھایا اور کُچھ بٹن دبا کر بولا۔

"کیا چاہتے ہو۔۔ جاؤ واپس جاؤ۔۔ میں حُکم دیتا ہوں واپس جاؤ۔"

روبوٹس اب بھی آگے بڑھ رہے تھے اور اب وہ فورس شیلڈ کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"تم روبوٹس نہیں ہو۔۔ تم نمبر آٹھ کے روبوٹس نہیں ہو۔" جیگا نے گھبرا کر کہا۔ "وہیں رُک جاؤ، ورنہ میں تمہارا کنٹرول ختم کر دوں گا۔ تمہارے اندر کی مشینری اور پرزے توڑ دوں گا۔ میں کہتا ہوں رُک جاؤ، آخر تمہیں اس نافرمانی کی جرأت کیسے ہوئی؟"

روبوٹس نے جیگا کی دھمکی کی ذرّہ بھی پرواہ نہ کی اور وہ اب فورس شیلڈ میں داخل ہونے لگے۔ پہلی مرتبہ مُجھے اس حقیقت کا پتہ لگا کہ فورس شیلڈ دراصل دھوئیں کی ایک چادر ہے مگر دُور سے شیشہ نظر آتی ہے۔ روبوٹس جب فورس شیلڈ کے اندر داخل ہو گئے تو جیگا گھبرا کر اپنی کرسی سے اُٹھ گیا اور بجلی سے چلنے والی کُچھ مشینوں کے سوئچ اوپر نیچے کرنے لگا۔ شاید وہ روبوٹس کا کنٹرول بند کرنا چاہتا تھا۔

"یہ سب احتیاط بے کار ہے جناب۔ اب آپ ہمارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

اس آواز کو سُنتے ہی میں اچانک اُچھل پڑا۔ یہ اختر کی آواز تھی۔ اتنا کہتے ہی اختر نے داہنی طرف لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور پھر اس کے لوہے کا لباس اوپر سے نیچے تک اس طرح کھُل گیا۔ جیسے صندُوق کا ڈھکنا کھُل جاتا ہے۔ اختر نے اس کے بعد نجمہ کو بھی ایسا ہی کرنے کے لئے کہا اور نجمہ نے بھی اپنے لوہے کا لباس اسی طرح اُتار دیا جیسے کہ اختر نے اُتارا تھا۔ ان دونوں کو جیگا کے کمرے میں نہتا کھڑے دیکھ کر میرا دِل لرزنے لگا۔ خُدا جانے جیگا اِن کا کیا حشر کرے؟ اس نے اچانک ایک مشین کی طرف بڑھنا چاہا۔ مگر اختر نے جلدی سے اپنی جیب کے اندر سے ایک نرالی قسم کا ریوالور نکال کر اُس کا رُخ جیگا کی طرف کر دیا اور کہنے لگا۔

"نہیں جناب یہ نہیں ہوگا۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ آپ خطرے کا الارم بجا کر اپنے جکاریوں، زوکوں اور آدم خوروں کو بُلانا چاہتے ہیں مگر سیّارہ زہرہ

کے اس عجیب و غریب ریوالور کی قاتل شعاعیں آپ کو ایسا نہ کرنے دیں گی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ شعاعیں آپ کو مفلوج کر دیں گی اور آپ اپنی جگہ سے ذرا سی بھی جُنبش نہ کر سکیں گے۔ اس لئے میری گزارش ہے کہ آپ براہِ کرم خاموش کھڑے رہیے۔"

"شاباش! اختر شاباش۔۔۔ تُم نے کمال کر دیا۔" میں اپنے کیبن میں سے چیخا۔

"ابّا جی آپ بالکل نہ گھبرائے۔۔۔ جیگا صاحب سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ میں اور نجمہ آپا اب سے بہت پہلے کر چُکے تھے۔"

اختر نے میری طرف دیکھے بغیر کہا، کیوں کہ اس کی نظریں جیگا پر لگی ہوئی تھیں۔

"ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ آپ لوگ جلد سے جلد اس

اس کیبن سے باہر آجائیے۔"

اختر تھا تو آخر لڑکا ہی اور مُجھے اس پر زیادہ اعتبار بھی نہ تھا۔ مُجھے خطرہ تھا کہ کہیں اس کی سوچی ہوئی تجویز غلط ثابت نہ ہو جائے اور جیگا کہیں اُس پر غالب نہ آجائے۔ اختر اور نجمہ کو ایسے وقت ہماری ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس لئے ہم لوگ جلدی سے کیبن کے باہر آکر کھڑے ہو گئے۔ اختر نے صرف ایک نظر ہماری طرف دیکھا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جیگا نے بھاگنا چاہا مگر اپنے اس اِرادے میں اسے ناکامی ہوئی کیوں کہ اختر نے اُسے دیکھ لیا اور چلّا کر کہا۔

"خبردار۔۔۔ آپ بھاگنے کی کوشش نہ کریں ورنہ انجام اچھّا نہ ہو گا۔"
جیگا بھاگتے بھاگتے ایک دم رُک گیا۔ اور پھر پریشان ہو کر کہنے لگا۔

"مم۔۔۔۔۔م۔۔۔ میں بھاگ نہیں رہا۔ لیکن مُجھے تم اتنا اور بتا دو کہ تمہارے پاس روبوٹ کا یہ لباس کہاں سے آیا؟"

"یہ کہانی آپ کو میں ضرور سناؤں گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کی طاقت اب ختم ہونے والی ہے۔ آخری وقت میں یہ کہانی سُننا آپ کے لئے بہت فائدے مند ہوگا۔ نجمہ آپا۔ ۔ تم بھی اپنا ایسا ہی ریوالور نکال کر اپنے پرانے چچا بلونت پر تان لو۔ کیوں کہ یہ ضرورت سے زیادہ چالاک واقع ہوئے ہیں۔"

نجمہ نے جب اس کا کہنا مان کر ایسا ہی کیا تو اختر مُجھ سے کہنے لگا۔

"ابّا جی آپ لوگ ہمارے قریب آ جائیے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم سے کوئی چُوک ہو جائے اس لئے آپ ہماری مدد کے لئے قریب ہی کھڑے رہئے، مگر بلونت چچا سے ہم دونوں ہی اکیلے نمٹ لیں گے۔ کیونکہ صرف ہم دونوں ہی یہ کام کرسکتے ہیں۔ آپ کو ابھی معلوم ہوجائے گا کہ یہ دعویٰ کس حد تک سچّا ہے۔ بے فکر رہئے، بلونت چچا ہمارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

یہ سُنتے ہی ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ زیادہ کُچھ بولنے کا کیونکہ موقع نہیں

تھا اس لئے ہم نے اختر کی بات مان لی اور اس سے چند قدم پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اختر کو اب اطمینان ہو گیا اور اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"سنئے میرے پیارے بلونت چچا۔۔!

میں آپ کو اب ایک دِلچسپ کہانی سُنا رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب ہم آپ کی حدود میں آئے تو آپ نے اپنی موت کا راز خود ہی ہمیں بتا دیا۔ میں نے یہ بات اپنے ذہن میں جما لی اور پھر نجمہ آپا سے اِس سِلسلے میں بہت دیر تک مشورہ کرتا رہا۔ کل شام کو ہم دونوں جان بُوجھ کر آپ کی سُرنگوں میں کھو گئے تھے۔ اور وہاں ہم نے ایک سُرنگ کے اندر موڈل نمبر آٹھ کے دو روبوٹس کو دیکھا۔ اُن کی پشت ہماری طرف تھی، وہ دونوں بجلی کی کُچھ مشینوں کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں میں سے دو تار نکل کر دیوار میں لگے ہوئے بجلی کے ایک بورڈ میں جا رہے تھے۔ ان تاروں کے آخر میں دو پلگ لگے ہوئے تھے۔ اور یہ پلگ بجلی

کے بورڈ کے دو الگ الگ سوکٹس میں پیوست تھے۔ میں سمجھ گیا کہ روبوٹس اپنے جسم میں لگی ہوئی بیٹری کو چارج کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے جہازوں میں کئی بار ڈائنمو کے ذریعے اسی طرح بیٹریوں کو چارج کیا جاتا تھا۔ ہم دونوں نے چُپکے سے آگے بڑھ کر پلگ کے نیچے والے سوئچ بند کر دیے اور روبوٹس کے سروں پر جلنے والی روشنیاں یکایک بُجھ گئیں اور ان کے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ نیچے گر گئے۔ ہم سمجھ گئے کہ روبوٹس کی بیٹریاں ختم ہو چکی ہیں۔ اگر انہیں چارج نہ ہونے دیا جائے تو روبوٹس بارہ گھنٹے میں بالکل ختم ہو جائیں گے۔"

یہ سُنتے ہی اچانک بلونت نے اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہیئے مگر اختر نے بھانپ لیا اور بولا:

"میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ ہلنے کی ذرا بھی کوشش نہ کریں ورنہ نتیجہ کے ذمّہ دار آپ خود ہوں گے۔ میں ایک دلچسپ کہانی سُنا رہا ہوں اور

آپ بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔۔؟

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم نے احتیاطاً سوئچ بورڈ میں سے پلگ بھی نکال دیے اور پھر فوراً ہی یہاں واپس آ گئے۔ شام کے پانچ بجے ہم دونوں خاموشی سے اُٹھے اور پھر اُس سُرنگ میں پہنچ گئے جہاں روبوٹ اب خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے بڑی مُشکل سے اور محنت کے بعد اُن کے جسم کو کھولا۔ اندر گراریاں اور بجلی کا سامان بھرا ہوا تھا۔ وہ سامان اور کَل پرزے نکال کر ہم نے ایک طرف پھینک دیے۔ اُن کے ریوالور اپنے قبضے میں کئے اور خود روبوٹس کے جسموں میں داخل ہو کر اِس جگہ آ گئے۔ چلنے میں ہمیں تکلیف اور دقّت تو بے شک ہوئی مگر کیا کرتے؟ مجبوری تھی! آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روبوٹس کا یہ خاص دھات کا بنا ہوا لباس بہت ضروری تھا۔ کیونکہ صرف یہی دھات آپ کی فورس شیلڈ میں سے گُزر سکتی ہے۔ ہمارے سامنے کئی مرتبہ ایسے روبوٹ اِس

فورس شیلڈ میں سے گُزرے ہیں۔۔۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

جیگا نے تو خیر کُچھ جواب نہ دیا مگر میں یہ باتیں سُن کر اچنبھے میں رہ گیا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ اختر اتنا عقل مند بھی ہو سکتا ہے۔ میں دِل ہی دِل میں اس کی سلامتی کی دُعائیں مانگ رہا تھا۔ جیگا کا چہرہ اس وقت بالکل زرد تھا اور وہ بڑی بے چینی کے عالم میں کبھی اختر کو کبھی نجمہ کو اور کبھی اپنی عجیب و غریب مشینوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے بر عکس اختر جیگا کو بُری طرح گھور رہا تھا۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے نجمہ سے کہا۔

"نجمہ آپا۔۔ اب تم اپنا وہ ڈبّہ نکال لو۔۔۔"

"کیسا ڈبّہ۔۔۔؟" جیگا نے گھبرا کر پوچھا۔

"سوبیا کا ڈبّہ۔۔ گھبرائیے مت، تھوڑی سی سوبیا ہم نے اپنے اس

ضروری کام کے لئے پہلے سے بچا کر رکھ لی تھی۔ آپ کو تو سوبیا کا صرف آدھا حصّہ دیا گیا تھا۔"

جیگا نے یہ سن کر ایک زبردست قہقہہ لگایا اور پھر بولا:

"لیکن سوبیا کی زہریلی کرنیں مُجھ پر تو اثر نہیں کر سکتیں۔"

"کیوں نہیں کر سکتیں؟" اختر نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جب آفاقی ہار اس میں ڈالا جائے گا تو کیا تب بھی اثر نہ کریں گی؟"

"کیا کہتے ہو۔۔۔ احمق لڑکے کیا تُو نے آفاقی ہار بھی چُرا لیا؟" جیگا نے اس طرح کہا جیسے اسے اس کی موت نظر آ گئی ہو۔

"چرایا نہیں بلکہ وہ پہلے ہی سے میرے پاس محفوظ ہے۔"

میں یہ سُن کر اچانک چونک گیا اور اپنے ساتھیوں کو اس طرح حیرت سے دیکھنے لگا گویا اختر کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی ہو۔

اختر نے اپنا ریوالور والا ہاتھ ذرا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اِس کی بھی ایک کہانی ہے، میرے پیارے چچا۔ سُنئے اور سُن کر اپنے بھتیجے کی عقل مندی پر عش عش کیجئے۔۔ میں جانتا تھا کہ اپنی کالی دُنیا میں آنے کے بعد آپ ہم سے آفاقی ہار اور سوبیا ضرور حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ سوبیا تو خیر پاپا نے نجمہ آپا کو پہلے ہی سے دے دی تھی اور نجمہ آپا نے اسے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا۔ مگر اس کام سے بہت پہلے گِرگٹ والے غار میں سے ہم دونوں نے آفاقی ہار جیسے کُچھ دانے تلاش کیئے تھے۔ ابّا جی نے مُجھ سے پوچھا بھی تھا مگر میں نے انہیں گول مول جواب دے دیا تھا۔ میں دراصل سب کو لاعلم رکھنا چاہتا تھا اور میں نے یہی کیا۔ ان دانوں کو ایک دھاگے میں پرو کر میں نے ایک نقلی آفاقی ہار بنا لیا اور پھر یہی ہار نجمہ آپا کے گلے میں ڈال دیا۔ اصلی آفاقی ہار میں نے اپنے پاس رہنے دیا۔ ہار جب تک میرے پاس رہا، بے اثر رہا۔ اسی

لئے آپ کو اور آپ کے جکاریوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ہار میرے پاس ہے۔ آپ چوں کہ اس ہار سے ڈرتے تھے اس لئے آپ نے خود اسے دیکھنے کی خواہش بھی نہیں کی اور اس طرح آپ نے نقلی ہار حاصل کر لیا۔"

"شاباش اختر شاباش۔۔ میں تم پر جتنا فخر کروں کم ہے۔" میں خُوشی سے بے قابو ہو کر چیخ اُٹھا۔

"تم نے یہ بات بہت بُری کی۔ لاؤ وہ ہار مُجھے دے دو۔۔۔ شاباش جلدی دے دو۔" جیگا نے گھبرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کی پیشانی پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"خبردار بلونت چچا۔۔ وہیں کھڑے رہو۔۔" اختر نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ ہار تمہیں دینے کے بجائے میں نجمہ آپا کو کیوں نہ دے دوں جن کے پاس پہنچتے ہی یہ اپنا اثر دکھائے!"

"نہیں نہیں۔۔۔ ایسا مت کرنا اختر۔۔۔ میں برباد ہو جاؤں گا۔۔۔ مُجھ پر رحم کرو اختر۔۔۔" جیگا خوف کے مارے لرزنے لگا۔

"جب تم کسی پر رحم کرنا نہیں جانتے تو ہم تم پر کیوں رحم کریں؟" اختر نے بے رحمی سے کہا۔

"بابا۔۔۔ جلدی کرو۔۔ اس کم بخت پر رحم کرنا بے وقوفی ہے۔" سوامی نے بے چینی سے کہا۔

اختر نے بلونت کو مُسکرا کر دیکھا اور پھر اپنی جیب میں سے آفاقی ہار نکال لیا ہار کو دیکھتے ہی جیگا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ نجمہ سوبیا کا ڈبّہ ہاتھ میں لئے ہوئے کھڑی تھی۔ اختر نے اب یہ ہار نجمہ کو دے دیا۔ ہار کا نجمہ کے ہاتھ میں جانا تھا کہ اچانک جیگا اِس طرح کپکپانے لگا جیسے اُس پر مِرگی کا دورہ پڑا ہو، یوں لگا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ انسان کی مرتے وقت جو کیفیّت ہوتی ہے، ہو بہو وہی حالت اس کی ہونے لگی۔ نجمہ ہار ہاتھ میں لئے اسے دیکھ

رہی تھی کہ میں نے چلّا کر کہا۔

"نجمہ ہار سوبیا میں ڈال دو۔۔۔ سوچ کیا رہی ہو؟"

اتنا سنتے ہی جیگا نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس طرح اٹھایا جیسے نجمہ کو منع کر رہا ہو۔ اس کے جسم سے پسینہ بہنے لگا۔ رنگ اچانک سبز ہونے لگا۔ قد گھٹنے لگا اور صورت خوفناک ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی اصلی شکل میں واپس آ رہا تھا۔ نجمہ نے میری آواز سُن کر ہار سوبیا میں ڈال دیا اور پھر یکایک ہم نے عجیب دِل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ جیگا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کا جسم پگھل رہا تھا اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا اور پھر کُچھ ہی دیر بعد اس کا جسم اس طرح پھٹ گیا جیسے کوئی بم پھٹتا ہے۔

ایک زبردست آواز ہوئی۔ مُجھے یوں لگا جیسے کہ زمین ہل رہی ہو۔ میں نے بس اتنا دیکھا کہ اختر کوئی چیز اٹھا کر جیگا کی خاص مشینوں پر مار رہا ہے۔ جیسے ہی مشینیں ٹوٹیں وہ فورس شیلڈ بھی ختم ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ہم سب اس کی

مدد کو پہنچ گئے۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اختر کو سینے سے لگا لیا اور نجمہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مگر یہ وقت محبّت جتانے کا نہیں تھا۔ جس جگہ ہم موجود تھے وہاں اب دھواں ہی دھواں بھر گیا تھا اور زمین اس طرح ہل رہی تھی جیسے کہ ابھی پلٹ جائے گی۔ ہمیں دور اور قریب سے بار بار دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دھواں اس قدر تھا کہ ہمیں کُچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بڑی مُشکل کے بعد جیگا کی کرسی کے پیچھے ایک دروازہ نظر آیا۔ ہم لوگ دوڑ کر اس میں داخل ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا زینہ نظر آیا جو شاید اوپر جا رہا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے ہم اس زینے پر چڑھنے لگے۔ زینہ اتنا اونچا تھا کہ اس کی سیڑھیاں ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ میں کُچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کتنی سیڑھیاں چڑھتے تھے کیوں کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا، اوپر سے راکھ اور چٹانیں نیچے گرنے لگیں۔ ہر طرف خاک ہی خاک اڑنے لگی اور پھر اس خاک کے اندر سے ایک بہت ہی تیز روشنی مُجھے دکھائی دی۔

شاید یہ سورج کی روشنی تھی۔ میں ابھی آنکھیں پھاڑ کر اس روشنی کو پہچاننے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا اور پھر مُجھے ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا؟

جب میری بے ہوشی دور ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک جزیرے کے اوپر پڑا ہوا ہوں۔ میرے پاس میرے ساتھی بھی ہیں۔ قریب ہی ایک ایسا گڑھا تھا جسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس جگہ کوئی بم پڑا ہے۔ اس گڑھے میں جھانکنے کے بعد میں حیران رہ گیا کیونکہ یہ گڑھا نہیں بلکہ ایک گہرا غار تھا جس میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں غار کے پتھرّ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے تھے۔ پہلے تو میری سمجھ میں کُچھ نہیں آیا کہ یہ غار کس قسم کا ہے۔

مگر آہستہ آہستہ جب میرا دماغ کام کرنے لگا تو مُجھے پچھلی تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ جیگا کے خاص کیبن سے یہ زینہ درحقیقت پاتال سے اوپر زمین کی سطح تک جاتا تھا۔ ہم جب اس زینے پر

چڑھ رہے تھے تو جیگا کی کالی دُنیا ایک دھماکے کے ساتھ ختم ہو گئی اور ہم لوگ بڑی مُشکل کے بعد اوپر تک پُہنچے مگر پھر راستے ہی میں سیڑھیوں پر گر گئے۔ لیکن اس وقت تو ہم سب جزیرے کے اوپر تھے۔ پھر بھلا کون ہمیں زمین سے اٹھا کر یہاں تک لایا؟

میرے باقی ساتھیوں کو آہستہ آہستہ ہوش آ رہا تھا۔ جان نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور شاید اس کی سمجھ میں بھی یہ معاملہ نہ آیا۔ جہاں ہم لوگ پڑے ہوئے تھے وہ جگہ سمندر سے بہت قریب تھی۔ ساحل پر لا تعداد درخت اُگے ہوئے تھے اس لئے سمندر صاف نظر نہ آتا تھا۔ ابھی میں جان سے اپنی موجودہ حالت کے بارے میں پوچھ گچھ کر ہی رہا تھا کہ اچانک دو لمبے اور کالے ستون چلتے ہوئے ہم سے کُچھ فاصلے پر آ کر رُک گئے۔ ان ستونوں کو دیکھتے ہی جان چلّا اٹھا۔

"شاگو۔۔۔!"

"جی ہاں میں شاگو ہوں۔۔۔" ان لمبے ستونوں سے آواز آئی۔ "آداب عرض ہے مسٹر جان۔"

میں نے جلدی سے گھبرا کر اوپر دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں شاگو کے چہرے کو اچھّی طرح دیکھنے کے لئے مُجھے تقریباً لیٹنا پڑا۔ امجد سوامی جیک اور بچّے بھی اب ہوش میں آ چکے تھے اور سہمی ہوئی نظروں سے شاگو کو دیکھ رہے تھے۔ جب انہوں نے جان کی زبانی اس کا نام سُنا تو ان کی گھبراہٹ دور ہوئی اور وہ حیرت سے شاگو کو دیکھنے لگے۔

"آداب عرض۔۔۔" جان نے چلّا کر جواب دیا۔ "مگر مُجھے آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔"

"ہونی بھی چاہیئے۔" شاگو نے مُسکرا کر کہا۔ "میں تو دراصل آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے اور آپ کی پارٹی کے ممبروں نے سیّارہ زہرہ اور اُس کے

باسیوں کی جومدد کی ہے، میں اس کے لئے بہت ممنون ہوں، آپ لوگوں کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ خاص کر آپ کے بچّوں کے ہم بہت احسان مند ہیں کہ اتنی سی عمر میں انہوں نے بہت تکلیفیں اُٹھائیں اور بڑی ہمّت و بہادری کا ثبوت دیا۔ میرے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں جو انہیں تحفے کے طور پر دوں۔ مگر مُجھے یقین ہے کہ دور خلا کے رہنے والے ایک شخص کی یہ تعریف انہیں پسند آئے گی اور وہ اسے قبول کریں گے۔"

اختر اور نجمہ کے چہرے پھُول کی طرح کھِل گئے۔ وہ کُچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ شاگو نے پھر کہا۔

"سیّارہ زہرہ کی حکومت آپ کی شکر گزار ہے، مسٹر جان کہ اُسے آپ نے ایک بہت بڑے دُشمن سے نجات دِلائی۔ اِس کے ساتھ ہی ہماری حکومت کی خواہش ہے کہ کبھی آپ حضرات ہمارے سیّارے میں آ کر

ہمارے مہمان بنیں۔"

"ضرور ضرور۔۔۔" جان نے مسرّت سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔
"میں شکریے کے ساتھ یہ دعوت قبول کرتا ہوں۔"

"عنایت۔۔۔ نوازش۔" شاگو نے کہا۔ "ہماری دُنیا یہاں سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور ہے۔ آپ جب بھی خواہش کریں گے ہمارے خاص راکٹوں میں آپ وہاں آ سکتے ہیں۔ آپ کو وہاں لے جانے کا انتظام ہمارے ذمّہ ہوگا۔"

"ہم ضرور آئیں گے، ہمیں وہاں آکر مسرّت ہوگی۔" جان نے چلّا کر کہا۔

"شکریہ۔۔۔ آپ کی مہربانیاں تو اِن کا صلہ یہ ہے کہ آپ سب کے گھروں کو سونے اور ہیرے جواہرات سے بھر دیا گیا ہے۔ دُنیا کی کوئی ایسی نعمت اور دولت نہیں چھوڑی گئی جس کی خواہش ہر انسان کے دِل

میں ہوتی ہے۔ جب آپ وہاں پہنچیں گے تو اِس دولت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ جب تک آپ کی یہ دُنیا قائم ہے یہ دولت آپ کے کام آتی رہے گی۔ اس کے علاوہ مسٹر فیروز اور ان کے بچّوں کو ایک خاص انعام میں اور دینا چاہتا ہوں۔ یہ اُن کی اس بہادری کے صلے میں ہے جو انہوں نے جیگا کے خاص کمرے میں دکھائی تھی۔ وہ انعام یہ ہے کہ ایک خاص اسٹیمر اس وقت اُس جزیرے کے پاس ہی لنگرانداز ہو رہا ہے اور اس اسٹیمر میں فیروز صاحب کی بیگم زرینہ، ان کا اور اپنے بچّوں کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہیں۔"

"سچ۔۔۔ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" میں نے خُوشی سے پاگل ہوتے ہوئے کہا۔

"امّی۔۔۔ یعنی ہماری پیاری امّی کیا یہاں موجود ہیں؟" اختر اور نجمہ خُوشی سے دیوانے ہو گئے اور پھر اُٹھ کر سمندر کو دیکھنے لگے۔

"یوں نہیں، میرے ہاتھ پر تشریف لے آئیے۔" شاگو نے یہ کہہ کر اپنا لمبا چوڑا میدان جیسا ہاتھ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم تینوں جلدی سے اس ہاتھ پر چڑھ گئے۔ شاگو نے اپنا ہاتھ اوپر کیا اور تب ہم نے تقریباً دو سو فٹ کی بُلندی سے دیکھا کہ واقعی میرا ایک خاص اسٹیمر سمندر کے اندر لنگر انداز ہے۔

"بس بس۔۔۔ براہِ کرم ہمیں نیچے اُتار دیجئے، ہم اپنی امّی کے پاس جانا چاہتے ہیں۔" اختر نے چلّا کر کہا۔

اور اس کے بعد جو کُچھ ہو وہ اتنا ہے کہ شاگو تو جزیرے کے اندر چلا گیا جہاں شاید اس کا راکٹ کھڑا تھا، کُچھ ہی دیر بعد ہم نے اس راکٹ کو آسمان کی طرف تیزی سے اُڑتے ہوئے دیکھا۔ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر ہم لوگ بھاگتے ہوئے ساحل پر پہنچے۔ میرے ملّاح کشتیاں لئے ہوئے کھڑے تھے۔ انہوں نے مُجھے دیکھتے ہی سلام کیا اور خُوشی کی وجہ سے ان کے

آنسو بہنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ ان کشتیوں میں بیٹھ کر اسٹیمر میں آ گئے۔۔ دیکھئے آگے کے حالات لکھتے ہوئے میرے قلم میں خُوشی کی وجہ سے پھر لرزا پیدا ہوگیا ہے۔۔۔ میاں بیوی اور ماں بچّوں کا یہ ملاپ دیکھنے سے تعلّق رکھتا تھا۔ سب کے آنسو بہہ رہے تھے اور سب بار بار ایک دوسرے کے گلے لگ رہے تھے۔ اس ملاپ کو دیکھ کر اسٹیمر میں جتنے بھی لوگ تھے وہ بھی زاروقطار رو رہے تھے۔

اسٹیمر کے چلنے کے بعد زرینہ نے مُجھے بتایا کہ ایک دِن اسے ایک خط ملا۔ جس میں ایک تحریر کے ساتھ ہی ایک نقشہ بھی تھا۔ کسی نامعلوم شخص نے اس خط میں لکھا تھا کہ اگر زرینہ اپنے بچّوں سے ملنا چاہے تو وہ اپنے خاص اسٹیمر میں بیٹھ کر نقشے کے مطابق فلاں جزیرے میں فلاں تاریخ تک پہنچ جائے اور سمندر ہی میں انتظار کرے۔ اس کے بچّے اسے مل جائیں گے۔ لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا اور اپنے اسٹیمر میں بیٹھ کر اس جزیرے کے

پاس آ گئیں۔ جب میں نے زرینہ کو یہ بتایا کہ ہم لوگوں کو یہ نئی زندگی صرف نجمہ اور اختر کی وجہ سے ملی ہے تو وہ خُوشی سے جھوم اٹھی اور دونوں بچّوں کو اس نے گلے سے لگا لیا۔

جب ہمارا اسٹیمر بمبئی کے ساحل سے لگا تو مُجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ساحل پر میلہ لگا ہوا ہے۔ میرے دوست، ملازم، اخبار والے اور حکومت کے بڑے بڑے افسر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ امجد کے والد کو چوں کہ میں اسٹیمر ہی میں سے وائرلیس کے ذریعے اِطّلاع دے چکا تھا اس لئے وہ بھی وہاں آ گئے تھے۔ ہمارے ساحل پر اُترتے ہی بینڈ بجنے لگے۔ فوٹوگرافر تصویریں اُتارنے لگے اور اخباری نمائندے اختر اور نجمہ سے مختلف باتیں پوچھنے لگے۔ امجد کے والد اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی میں بے حد پریشان تھے۔ امجد کو دیکھتے ہی انھوں نے دوڑ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے۔ جب ان کا دِل ہلکا ہوا وہ ہم

سے سفر کی مختصر کہانی سُنتے رہے۔ یہ کہانی جب اخباری نمائندوں نے لکھنی شروع کی تو میں نے انہیں منع کر دیا کیونکہ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ کہانی میں نے اپنے سفر نامے کی صورت میں لکھ دی ہے۔ اگر یہ پہلے ہی سے کہیں چھپ جاتی تو پھر اس سفر نامہ کو پڑھنے میں کیا لطف آتا!

کافی دیر بعد جب امجد ہم سے جُدا ہونے لگا تو بڑا افسردہ تھا، اور بار بار نجمہ کو اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نجمہ بھی کنکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے دِل میں خُوشی کے لڈّو پھوٹنے لگے، میں نے زرینہ کے کان میں آہستہ آہستہ اس سے کُچھ مشورہ کیا اور پھر امجد کے والد سے کہا۔

"آپ کے صاحبزادے نے ہمارا بڑا ساتھ دیا ہے اور بڑی مدد کی ہے۔ ہم ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولیں گے۔"

"یہ آپ کی عنایت ہے جو ایسا سوچتے ہیں۔" امجد کے والد نے جواب دیا۔ "بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آپ اس کی مدد نہ کرتے تو شاید میں پھر کبھی

اس کی صورت نہ دیکھ سکتا تھا۔"

"یہ تو مُجھے آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"ارے ہاں مُجھے یاد آیا، امجد نے اپنی ایک امانت ابھی تک مُجھ سے وصول نہیں کی۔"

"امانت۔۔۔ کون سی امانت؟" امجد نے حیرت سے کہا۔

"تم بھول گئے۔۔۔ تم نے ایک ہیرے کی حفاظت کی تھی۔ ہر وقت اس کا خیال رکھا تھا۔ اور وہ ہیرا میرے پاس تمہاری امانت کے طور پر ابھی تک محفوظ ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ کون سا ہیرا؟"

"یہ رہا وہ ہیرا۔۔۔" میں نے نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو امجد اس قیمتی ہیرے کو میری طرف سے قبول کرو۔۔۔ مُجھے یقین

ہے کہ اس ہیرے کو پا کر تمہیں خُوشی حاصل ہوگی۔“

اب کیا یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ نجمہ تو شرما کر زرینہ کے پیچھے چھُپ گئی اور امجد خُوشی سے بے قابو ہو کر دوڑ کر مجُھ سے لپٹ گیا۔